اردو فکشن کی تنقید: ابتدا تا حال

مقالہ برائے پوسٹ ڈاکٹورل ریسرچ

فیکلٹی آف ہیومینٹیز (اردو)

۲۰۲۳

پیشکش

ڈاکٹر مسرت جہاں

پوسٹ ڈاکٹورل ریسرچ فیلو

نگراں

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی

شعبۂ اردو، پٹنہ

شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

اردو فکشن کی تنقید: ابتدا تا حال

مقالہ برائے پوسٹ ڈاکٹورل ریسرچ

فیکلٹی آف ہیومنیٹیز (اردو)

۲۰۲۴

نگراں

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی

ایسوسی ایٹ پروفیسر

پیشکش

ڈاکٹر مسرت جہاں

پوسٹ ڈاکٹورل ریسرچ فیلو

شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

DEPARTMENT OF URDU
Patna University, Patna-800005
E-mail:
hodurd@patnauniversity.ac.in

Estd. 1936

شعبۂ اردو
پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۵

Mob: +91-9431808564 / +91-72093

Ref No. ....

Dated. ....

TO WHOM IT MAY CONCERN

*This to certify that Dr. Musarrat Jahan, Post Doctoral Fellow, University Grants commission, New Delhi, Vide letter no. F.15-1/2014-15/PDFWM-2014-15-GE-BIH-26660(SA-II), has submitted her thesis entitled **"Urdu Fiction ki Tanqeed-Ibtada Ta Hal'** in the subject of Urdu in faculty of Humanities. The thesis is based on the synopsis approved by University Grants commission, New Delhi.*

Deo 14/7 03/03/2024

Dr. Suraj Deo Singh
Head
Department of Urdu
Patna University, Patna

Dr. Shahab Zafar Azmi
Associate Professor
Department of Urdu
Patna University, Patna-800005
Editor: URDU JOURNAL , Patna

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی
ایسوسی ایٹ پروفیسر
پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۵
مدیر: اردو جرنل، پٹنہ

Mob: 8863968168 / 9431152912
E-mail: drshahabzafar.azmi@gmail.com

Ref No. ....

Dated. ....

CERTIFICATE

*This to certify that Dr. Musarrat Jahan, Post Doctoral Fellow, University Grants commission, New Delhi, Vide letter no. F.15-1/2014-15/PDFWM-2014-15-GE-BIH-26660(SA-II).Department of Urdu, Patna University has worked satisfactory for requisite number of term under my supervision and the thesis entitled **"Urdu Fiction ki Tanqeed-Ibtada Ta Hal'** embodies his own work.*

Shahab Zafar Azmi
02/03/2024

Dr. Shahab Zafar Azmi
Supervisor
(Associate Professor)
Department of Urdu
Patna University, Patna

اردو فکشن کی تنقید:

ابتدا تا حال

ترتیب

تمہید:	03
باب اول: اردو فکشن کی تنقید: عمومی جائزہ	09
باب دوم: اردو ناول کی تنقید: ابتدا تا حال	33
باب سوم: اردو افسانے کی تنقید: ابتدا تا حال	67
باب چہارم: داستان، ڈرامے اور تمثیل کی تنقید: ایک اجمالی جائزہ	96
(الف) داستان کی تنقید	97
(ب) ڈرامے کی تنقید	116
(ج) تمثیل کی تنقید	126
باب پنجم: اردو فکشن کے چند اہم ناقدین کا خصوصی مطالعہ	146
باب ششم: حاصل مطالعہ	263
کتابیات	281

تمہید

فکشن کی افہام و تفہیم میں تنقید کا منصب کیا ہے؟ کتابوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو فکشن پر جس قرینے کی تنقید کی ضرورت ہے وہ کمیاب ہے۔ فکشن کی فنی عملیات پر مباحث لگ بھگ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس جانب توجہ دیے بغیر فکشن کی تفہیم ممکن ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ البتہ اس بات کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ فکشن کی تنقید پر ادھر دو تین دہائیوں سے کافی کچھ لکھا جا رہا ہے۔ کئی قابل ذکر کتابیں اور مقالات شائع ہوکر منظر عام پر آئے لیکن ان میں بھی فکشن کی فنی عملیات نایاب ہیں۔

فکشن کی تنقید کا مطالعہ کرتے ہوئے تشنگی کا اِحساس ہوتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر فکشن کے موضوعات کی سطح پر یا زمانی اعتبار سے فہرست سازی کر لینے اور کتابوں کے محتویات کو مفصل زیر بحث لے آنے کو ہی فکشن کی تنقید سمجھ لیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کسی زمانے کے مجموعی تخلیقی مزاج کی یہ تنقیدی تشکیل فکشن کی افہام و تفہیم میں رہنما ثابت نہیں ہوسکتی۔ کیوں کہ سیاسی، سماجی اور معاشرتی موضوعات و رجحانات پر لکھنے والے تو بہت ہیں لیکن فکشن کی تنقید کے عملی نمونے بہت کم لوگوں نے پیش کیے ہیں۔ خصوصاً ڈراموں اور تمثیل کے حوالے سے تو یہ میدان بالکل خالی نظر آتا ہے۔

اس سلسلے میں گنتی کی کتابیں اور مقالات بھی موجود ہیں تو ان میں بھی صرف نظری مباحث ہیں۔ ایسے میں المیہ یہ رہا کہ فکشن پاروں کی تعین قدر کا مسئلہ الجھتا گیا۔ اسے کسی ناقد نے اہم نہیں سمجھا۔ اگر کچھ لکھا بھی تو ان میں فن پارے کو کلی طور پر دیکھا گیا اور ان کی تفہیم کی صورتیں پیش کرنے کی بجائے ان کے تجزیے کو ترجیح دی گئی۔ یہی سبب ہے کہ اس عرصے میں فن پارے کی اہمیت بہ طور تخلیق ایک عمومی متن سے زیادہ نہیں رہی۔ تنقید کیا ہے؟ تنقید و تخلیق کا رشتہ کیا ہے؟ نقاد کے فرائض یا منصب کیا ہیں؟ ان امور سے غفلت برتی جانے لگی۔ نقاد فن پاروں کا مطالعہ

کر کے تخلیقی ادب کی ماہیت معلوم کرنے کی حتی المقدور کوشش کرتا ہے۔نقاد کا فریضہ منصبی یہ ہے کہ وہ یہ معلوم کرے کہ ادب کیا چیز ہے؟ یہ زبان کی دوسری صورتوں اور اظہار و بیان کی دیگر قسموں سے جداگانہ ہے۔صرف استقرائی طریقہ کار اختیار کر کے فن پاروں میں پائی جانے والی مشترک خصوصیات کا بیان ہی کفایت نہیں کرتا۔

ایک بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ تنقید کا مقصد صرف دوسروں کی تخلیقات کا محاکمہ کرنا ہی نہیں ہے بلکہ تخلیقی ادب کے اصول وقواعد کی دریافت بھی ہے۔تنقید نگار فن کو سنوارتا اور فنکار کی رہنمائی اور اصلاح کا فریضہ انجام دیتا ہے۔نقاد اپنے تجربات سے فن کار میں تخلیق کا بہتر اور ستھرا شعور اور فن سے دلچسپی رکھنے والوں کو متاثر کر کے ان میں صحیح مذاق پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔اس لیے تنقید کا مقصد ہمیشہ مثبت اور تعمیری ہونا چاہیے۔اسے مصنف کی تضحیک نہیں کرنی چاہیے اور نہ ہی اس کی تصنیف کی ناقدری۔ بلکہ اسے تخلیق کے معائب و محاسن کی نشان دہی کرنا چاہیے اور جذبات سے بالاتر ہو کر بے لاگ تجزیے کے بعد کسی فن پارے پر اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہیے تاکہ رائے متوازن، معیاری اور صحت مند ہو۔

فکشن کی تنقید میں اسلوب کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔جس طرح فکشن پڑھنے کا طبعی میلان نہ رکھنے والا فکشن سے نہ حظ اٹھا سکتا ہے اور نہ اس پر اس کی ترسیل ممکن ہے، بالکل اسی طرح، کسی فکشن نگار کا اسلوب سمجھے بغیر اس کے فکشن پر تنقید بھی ممکن نہیں ہے۔ ہر فکشن نگار اپنے تخلیقی عمل میں اسلوب اپنی زندگی سے اخذ کرتا ہے۔ یہ اسلوب ہی ہے جو تخلیق میں ایسی لہریں رکھ دیتا ہے جو قاری کے دل کی دھڑکنوں کو قابو میں کر لیتی ہیں۔اس لیے فکشن کی تنقید کرنے والوں کو ان تکنیکی وسیلوں کو بھی آنکنا ہوگا جو ایک فکشن نگار کہیں تو تمثیل کی صورت متن میں مرتب کرتا ہے اور کہیں ماجرائی قرینے سے، کہیں وہ شعور کی رو کی تکنیک استعمال کرتا ہے اور کہیں مونتاژ بناتا چلا جاتا ہے۔ بہرصورت اس کا منصبی فریضہ ہے کہ مذکورہ بالا باتوں کو زیرِ نظر رکھتے ہوئے تنقید کے فرائض انجام دے۔تاکہ اس کی تنقید کسی بھی فکشن پارے کی افہام وتفہیم کی راہ میں ممد ومعاون ثابت ہو۔راقمہ کا یہ مقالہ بھی اسی سلسلے کی ایک ادنیٰ کوشش ہے جسے میں نے تمہید اور کتابیات کے علاوہ چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔

مقالے کے اجمالی جائزے سے قبل چند اہم باتوں کی تفصیل ضروری ہے۔اکثر موقعوں پر مجھے افسانوی ادب کی تنقید پر کچھ لکھنے پڑھنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو کتابوں کی کمی اور اس سلسلے میں گفتگو کی تشنگی کا احساس ستاتا

رہا۔کئی مرتبہ اپنے اساتذہ اور دوست احباب کے درمیان گفت وشنید میں اس سلسلے میں بحث ہوئی۔اسی اثنا میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی جانب سے ۱۵۔۲۰۱۴ کا پوسٹ ڈاکٹورل فیلوشپ کا اشتہار آیا۔ یہ میرے لیے سنہرا موقع تھا۔استادمحترم ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی (ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو، پٹنہ یونیورسٹی) سے مشورہ کرنے کے بعد پی ڈی ایف کے لیےاس موضوع کومنتخب کیا۔اس کے لیے یو جی سی فیلوشپ بھی تفویض کرتی ہے۔اس سے قبل وہ اپنے اصول وضوابط کا اہتمام کرتے ہوئے Interface میٹنگ بلانے کے بعد فیلوشپ کے لیے نام تجویز کرتی ہے۔خداوند عالم کا احسان ہے کہ اس پروجیکٹ کے لیے میرا انتخاب ہوا۔

مقالے کا پہلا باب 'اردو فکشن کی تنقید: عمومی جائزہ' ہے۔اس میں راقمہ نے لفظ فکشن کی وضاحت کے ساتھ اردو فکشن کی تنقید کا ایک عمومی جائزہ پیش کیا ہے۔اس سلسلے میں اردو کے معتبر ناقدین کے اقوال سے استفادہ کے ساتھ ان سے استناد بھی کیا گیا ہے اوراس کے دائرہ کار کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔اس باب میں اردو میں فکشن کے عہد بہ عہد ارتقا پر بھی ایک اجمالی نظر ڈالی گئی ہے۔اردو فکشن کی تنقید کے عمومی جائزہ کے ضمن میں سترہویں صدی عیسوی سے بیسویں صدی تک اردو میں فکشن کی تنقید کی اجمالی تاریخ پیش کی گئی ہے۔

دوسرا باب 'اردو ناول کی تنقید: ابتدا تا حال' ہے۔ اس باب میں اردو ناول کی تنقید پر گفتگو کی گئی ہے۔اس ضمن میں ناول کی تنقید کے اولین نقوش سے لے کر دور حاضر تک کے اہم ناقدین کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔نیز ان کے طریقہ کار نیز ان کی نظری اور عملی تنقید کے نمونوں کو پیش کیا گیا ہے۔ساتھ ہی ان کی تنقیدی کاوشوں کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے اوران کی قدر و قیمت کے تعین کی کوشش کی گئی ہے۔اس سلسلے میں ان تحریروں کو بھی شامل کیا گیا ہے جن میں ناول کی تنقید کے اولین نقوش نظر آتے ہیں جیسے بعض کتابوں کے دیباچے، تقاریظ اور تبصرے وغیرہ۔

تیسرا باب 'اردو افسانے کی تنقید: ابتدا تا حال' کے نام سے موسوم ہے۔اس باب میں اردو افسانوں کی تنقید کے مسائل ومباحث پیش کیے گئے ہیں۔افسانے کی تنقید کا سلسلہ ابتدائی دور کے افسانوں کے حوالے سے لکھی گئی بعض تاثراتی تحریروں سے ہوتا ہے۔اس باب میں افسانے کی تنقید کے نقطۂ آغاز سے لے کر اب تک کی اہم تنقیدی تحریروں کوموضوع بحث بنایا گیا ہے۔جن ناقدین نے افسانے کی تنقید پر کتابیں، مضامین اور مقالات قلم

بند کیے ہیں، ان کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان کی مجموعی قدر و قیمت کا تعین کیا گیا ہے۔

مقالے کے چوتھے باب کا عنوان ’داستان، ڈرامے اور تمثیل کی تنقید: ایک اجمالی جائزہ‘ ہے۔ اس باب کو تین ذیلی عنوانات (الف) داستان کی تنقید، (ب) ڈرامے کی تنقید اور (ج) تمثیل کی تنقید میں تقسیم کیا گیا ہے۔ داستان کی تنقید کے تحت داستان کی تنقید کے ابتدائی نقوش سے لے کر بیسویں صدی عیسوی تک کی اہم تنقیدی تحریروں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں ڈرامے کی تنقید اور ناقدین کے تعلق سے اہم اور کارآمد باتیں پیش کی گئی ہیں۔ اسی طرح تیسرے حصے میں تمثیل کے ناقدین کی تنقیدی کاوشوں کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے۔

مقالے کا پانچواں باب ’اردو فکشن کے چند اہم ناقدین کا خصوصی مطالعہ‘ کے نام سے معنون ہے۔ اس باب میں اردو فکشن کے اہم ناقدین کی حیات اور علمی خدمات کے ساتھ ان کی گراں قدر تنقیدی کاوشات کا بالاستیعاب مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں بعض جگہوں پر ان کے افکار و نظریات سے اختلاف بھی کیا گیا ہے۔ لیکن جہاں کہیں اختلاف کیا گیا ہے وہاں بات میں وزن پیدا کرنے کی غرض سے دلیلیں بھی پیش کی گئی ہیں۔ اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ناقدین کے ناموں کی ترتیب ان کی تاریخ پیدائش کے اعتبار سے دی گئی ہے۔ اس التزام کے پس پشت ایک خاص مقصد ہے کہ اس زمانے اور عہد کا محاسبہ اور محاکمہ ان کی تنقیدی آرا سے کیا جا سکے۔

چھٹا باب ’حاصل مطالعہ‘ ہے۔ اس میں اپنے تحقیقی مقالے کے تمام ابواب کا جائزہ لیتے ہوئے پورے مقالے کا نچوڑ چند صفحات میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور مستقبل میں فکشن کی تنقید میں نئے امکانات پر بھی بحث کی گئی ہے۔ اسی طرح ’کتابیات‘ کے ضمن میں ان کتب و رسائل کی فہرست شامل کی گئی ہے جن سے مقالے کی تیاری میں مدد لی گئی ہے۔

رب کریم کا بے پایاں کرم و احسان ہے کہ میرا مقالہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس سلسلے میں بڑی ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے متعلقین و منسلکین کا شکریہ ادا نہ کروں۔ اپنے شریک حیات جناب محمد علی صاحب کے لیے شکریہ کا لفظ ادا کر کے میں ان کے احساں سے بری نہیں ہو سکتی۔ میں خود کو اس معاملے میں خوش نصیب سمجھتی ہوں کہ مجھے سمجھدار، معاون اور مددگار شوہر ملے جنھوں نے حصول تعلیم کے لیے مجھے گھریلو جھمیلوں سے حتیٰ المقدور بے نیاز رکھا۔ زندگی کے سرد و گرم میں اگر شریک سفر ہم مزاج نہ ہو تو زندگی بہت ساری الجھنوں اور پریشانیوں کی نذر ہو

جاتی ہے۔ان کے حوصلہ افزا کلمات مثبت سوچ اور نیک مشوروں نے مجھے اپنے مقصد کی راہ پر گامزن رکھا۔اسی طرح اپنے بچوں مشرف اقبال، محسنہ اقبال، معاذ اقبال اور مستبشرہ اقبال کا ذکر نہ کروں تو ان کی حق تلفی ہوگی۔ کیوں کہ اپنے تحقیقی کام کے دوران میں نے بار ہا ان کی طرف سے غفلت برتی اور وہ وقت جن پر صرف ان کا حق تھا میں نے تحقیقی کام کی نذر کیا۔

والدین کی دعائیں رائگاں نہیں جاتیں۔ مجھے اس موقع پر اپنے والد مرحوم محمد عین الحق بہت یاد آرہے ہیں۔ ان کی یاد سے دل غمگین اور آنکھیں اشکبار ہیں۔اگر وہ باحیات ہوتے تو کتنا خوش ہوتے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔والدہ محترمہ نورانساء کی شفقت اور محبت نے چراغ راہ کا کام کیا۔اللہ ان کی عمر دراز کرے۔اس اثنا میں اپنی خوش دامن (نسبتی ماں) محترمہ زاہدہ خاتون کا ذکر نہ کروں تو میرے حد ادب کے خلاف ہوگا۔اکثر موقعوں پر میں نے اپنی الجھنوں اور پریشانیوں کو ان سے شیئر کیا اور تجربے اور مشاہدے حاصل کیے، ساتھ ہی انھوں نے اپنے پوتے پوتیوں کی دل لگی و دل ربائی میں پیش پیش رہ کر مجھے ذہنی تناؤ سے دور رکھا۔لہذا میرے دل میں ان کے لیے خاص جگہ ہے۔

میں صمیم قلب سے شکر گزار ہوں اپنے نگراں کار محترم ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کا جن کی نگرانی اور رہنمائی میں نہ صرف یہ کہ میرا مقالہ پایۂ تکمیل کو پہنچا بلکہ انھوں نے راقمہ کو تحقیق کے رموز وآداب بھی بتائے اور ہر مشکل وقت میں میرا ساتھ دیا۔صدر شعبہ اردو جناب ڈاکٹر سورج دیو سنگھ کا میرے دل میں خاص احترام ہے کہ میری اس کارفرمائی سے وہ نہ صرف خوش ہیں بلکہ ہر گام پر ان کی پیش قدمی میرے لیے باعث فخر ہے۔شعبہ کے اساتذۂ کرام پروفیسر اعجاز علی ارشد، پروفیسر اسرائیل رضا، پروفیسر جاوید حیات جیسی عبقری شخصیتوں کی ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود میری ہمت افزائی کی اور وقتاً فوقتاً مفید مشوروں سے نوازتے رہے۔ان کے علاوہ ان معزز شخصیات کی بھی ممنون ہوں جو اب اس دنیا میں نہیں رہے۔مرحومہ (پروفیسر) اعجاز بانو اور ان کے شوہر مرحوم محمد جمال دونوں شخصیات میرے امروز وفردا کے متعلق پوچھتے اور رہنمائی کرتے رہے۔اللہ تعالیٰ ان کو جوار رحمت میں جگہ عنایت فرمائے۔

دوست واحباب زندگی کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔اچھے دوست کا ملنا عطیۂ خداوندی ہے، میں خوش نصیب ہوں کہ قدرت نے میرے ساتھ اس سلسلے میں بڑی فیاضی کی ہے۔اس سلسلے میں فیضان حیدر معروفی، محمد منہاج

الدین، محمد اسلم، نعمت شمع، افشاں بانو وغیرہ کی شکرگزار ہوں جنھوں نے وقتاً فوقتاً مجھے مفید مشوروں سے نوازا۔ ان کے علاوہ ان تمام احباب کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتی ہوں جنھوں نے دامے، درمے، قدمے، سخنے کسی بھی طرح میری مدد کی ہے۔

اس تحقیقی مقالہ کی تیاری کے سلسلے میں مواد کی فراہمی کے لیے جن کتب خانوں سے استفادہ کیا ان میں خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، گورنمنٹ اردو لائبریری پٹنہ، شعبہ اردو کی لائبریری، پٹنہ یونیورسٹی کا مرکزی کتب خانہ، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ریختہ کی آن لائن لائبریری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان تمام لائبریریوں کے ذمہ داران وملازمین بھی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے خلوص کے ساتھ کتاب کی دستیابی میں پیش قدمی کی۔

آخر میں یہ اعتراف بھی ضروری ہے کہ میرا یہ تحقیقی مقالہ اس موضوع پر حرف آخر نہیں ہے بلکہ مجھ سے پیشتر کئی لوگوں نے اس موضوع پر جزوی تحقیقی مقالے لکھے ہیں اور آئندہ بھی اس موضوع پر تحقیق کے دروازے کھلے ہیں۔ میں نے اپنی علمی بساط بھر کام کیا ہے اور حتی المقدور موضوع کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ تحقیقی مقالے میں خامیوں کا راہ پا جانا بعید نہیں ہے۔ اس لیے یقیناً میرا مقالہ بھی غلطیوں سے مبرا نہیں ہوگا۔ میں ادب کی ایک ادنیٰ طالبہ ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت مجھے علم کی مزید روشنی بخشے۔

مسرت جہاں

پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

باب اول

اردو فکشن کی تنقید: عمومی جائزہ

اردو ادب کی کائنات میں ادب کی دو واضح شکلیں صنف شاعری اور صنف نثر وقوع پذیر ہیں۔ صنف شاعری میں جذبات وخیالات کی ہم آہنگی اور تخیل کی پرواز ہوتی ہے اور نثری صنف میں مختلف موضوعات کا مبہم خیال آرائی اور تک بندیوں کے برعکس واضح طور پر بیانیہ پیرائے میں اظہار ہوتا ہے۔ نثری صنف مواد، ہیئت اور اسلوب کی نوعیت سے افسانوی اور غیر افسانوی ادب جیسے دوحصوں میں بانٹے جاسکتے ہیں۔ افسانوی ادب میں ادب کی مختلف صنفیں حکایات، روایات، قصے، کہانیاں، داستان، ناول اور افسانہ کے علاوہ تمثیل اور ڈرامہ کو بھی شمار کیا جاتا ہے۔ متذکرہ سبھی صنفوں کے لئے منجملہ لفظ 'فکشن' کا استعمال ہوتا ہے۔

'فکشن' انگریزی کا ایک بہت ہی معروف ومقبول لفظ ہے۔ جسے اردو ادب میں افسانوی ادب کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ 'فکشن' کے لفظی معنی جھوٹ کے ہیں۔ وہ قصہ یا کہانی جس کی بنیاد سچ پر نہ ہو اسے فکشن کہتے ہیں۔ لفظ فکشن انگریزی سے ماخوذ ہے۔ اس میں وہ سارے واقعے بیان ہوتے ہیں جو اگر چہ حقیقی زندگی سے تعلق نہیں رکھتے تاہم ان میں حقیقت کی ترجمانی ہوتی ہے۔ داستان، ناول، افسانہ مختصر افسانہ، ڈرامہ اور تمثیل میں قصہ قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے، جن میں انسانی زندگی کے اردگرد پیش آنے والے وہ سارے واقعات آتے ہیں جن میں کچھ نہ کچھ انسانی دلچسپی اور اس کے تجسس کا عنصر پایا جاتا ہے۔ فکشن کا لفظ اردو ادب میں اس قدر عام ہو چکا ہے کہ ہم افسانوی ادب سے تعلق رکھنے والی تمام صنفوں کو فکشن کے دائرے میں لے لیتے ہیں۔

فکشن کے اندر انسانی تخیل کا دخل بہت زیادہ ہے دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فکشن ایک طرح سے نثر میں شاعری ہے، لیکن یہاں مصنف اپنے تخیل کی مدد سے انسانوں کا مشاہدہ کرتا ہے اور تخیل ہی کی مدد سے ان کے پیچھے درپیش آنے والے حالات کا بیان کرتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ فکشن تہذیب کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ بقول آل احمد سرور: ''کسی ملک کے رہنے والوں کے تخیل کی پرواز کا اندازہ وہاں کے شعری کلام سے ہوتا ہے، مگر وہاں کی سماجی تہذیب اس کے افسانوں، ناولوں یا داستانوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔''

فکشن کا ادب سے بہت پرانا رشتہ ہے۔ اتنا پرانا جتنا کہ خود انسان۔ قدیم زمانے میں لوگوں کے پاس

وقت کی کمی نہیں تھی ،تب کی کھائی کو بھرنے کے لئے لوگ سچی جھوٹی کہانیوں کو گڑھ لیا کرتے تھے اور لوگوں کے درمیان اپنی بات بیان کرتے تھے۔ان باتوں کو لوگ دلچسپی کے ساتھ سنا کرتے تھے۔ یہ کام ان کی زندگی کا اہم حصہ ہوتا تھا۔یوں قصے کہانیاں ترقی کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے آج کی موجودہ صورت میں موجود ہیں۔

فکشن کے دائرے میں آنے والی سبھی صنفوں جیسے داستان، ناول، افسانہ،مختصر افسانہ،تمثیل اور ڈرامہ وغیرہ میں کہانی موجود ہوتی ہیں،کہانی انسان کی جبلی ضرورتوں میں سے ہے۔ پیدائش کے ساتھ کہانی کے تانے بانے بنے جانے لگتے ہیں۔اس کی زندگی میں پیش آنے والے شکست وریخت اور متصادم قوتوں کا بیان ہوتا ہے۔ کہانی انسان کے احساس برتری کی تسکین کا ذریعہ ہے۔ یہ حقائق کی دنیا سے دور تخیل،تصور اور رومان کے ایک جہان تازہ کی تصویر ہے۔کہانی کا یہی تصور ہماری داستانوں کا بنیادی تصور ہے۔گویا قصے کہانیاں تہذیبی قدروں کے ساتھ پھلتے اور پھولتے ہیں۔ان کا ارتقا بھی تہذیب انسانی کے زیر اثر ہوتا ہے۔

ترقی پذیر اور تہذیب یافتہ ممالک میں قدیم قصوں کی روایت ملتی ہے، جہاں سے علم وحکمت کے چشمے نکلتے ہیں۔اس ضمن میں یونان کی مثال سامنے ہے۔ وہ صرف شاعری اور موسیقی کی دیویوں کے ہی پجاری نہ تھے بلکہ قصہ گو بھی تھے۔ان کے حکماء کا خیال ہے کہ یونان میں قصہ گوئی شاعری اور موسیقی سے بھی قدیم تر ہے۔ ہندوستان میں مہابھارت کا دور ایلیڈ سے تقریباً پانچ سو سال پہلے کا عہد ہے۔ ویدک عہد اس سے بھی قدیم ہے۔ رامائن وید اور مہابھارت سب کی تعمیر وتشکیل میں مناجاتوں، گیتوں اور جادوٹونے کے اشلوکوں سے ہوئی ہے۔اسی طرح جاتک کا زمانہ بھی پانچ سو صدی قبل مسیح کا ہے۔ایسپ کی کہانیاں پانچویں صدی قبل مسیح میں ہی وجود میں آچکی تھیں اور مشہور ومقبول تھیں۔ جاتک اور ایسپ کی کہانیوں کو کلیلہ ودمنہ، بیتال پچیسی ،طوطا کہانی اور الف لیلیٰ میں بھی شامل کرلیا گیا ہے۔بعض محققین کا خیال ہے کہ پنچ تنتر کلیلہ ودمنہ کی اصل ہے۔ فارسی زبان میں 'انوار سہیلی' بھی پنچ تنتر کا ہی ترجمہ ہے۔ پنچ تنتر کا ترجمہ دنیا کی ہر زبان میں ہو چکا ہے اور افسانوی ادب پر اس کا اثر بھی دیرپا رہا ہے۔

انہیں شاہراہوں سے گزرتے ہوئے اردو ادب میں بھی قصہ گوئی کی شروعات ہوئی۔ اردو زبان کا قدیم سرمایہ دوسری زبانوں کے ترجمے پر مشتمل ہے۔اس شعبے میں سب سے زیادہ فعال اور متحرک رول فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) کا ہے۔انگریزوں نے اپنے مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ء میں قائم کیا۔ کالج

میں ہندوستانی زبانوں کا ایک شعبہ بھی قائم ہوا جس میں ہندوستان کی مختلف زبانوں کی ترقی کے لیے اہم اقدامات کیے گئے۔ اردو قواعد اور لغت سازی کا کام بھی بڑے پیمانے پر ہونے لگا۔ شعبے میں انگریزی ملازمین کو اردو سکھانے کی غرض سے درس و تدریس کا باضابطہ نظم تھا اور ان لوگوں کے پڑھنے کے لئے مقتدر ماہرین کے ذریعہ مختلف زبانوں مثلاً عربی، فارسی، سنسکرت اور ترکی وغیرہ کی داستانوں کا اردو ترجمے کرایے گئے۔ اس طرح اردو کے ادبی سرمائے میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔

انیسویں صدی کی ابتدا میں ہی فورٹ ولیم کالج جیسے ادارے کا قیام عمل آیا اور ہندوستانی زبان کی تعلیم و تفہیم کی خاطر داستانوں کے اردو تراجم کرائے گئے جن سے لاشعوری طور پر اردو نثر کا فائدہ ہوا۔ اردو نثر جو عربی اور فارسی کے زیر اثر گھٹ گھٹ کر سانس لے رہی تھی اسے آزاد فضا میں پروان چڑھنے کا موقع فراہم ہوا۔ اس دور کی داستانوں میں باغ و بہار (میر امن) آرائش محفل اور طوطا کہانی (حیدر بخش حیدری) داستان امیر حمزہ (خلیل علی خاں اشک) نثر بے نظیر (بہادر علی حسینی) بیتال پچیسی (مظہر علی ولا اور للولال جی) سنگھاسن بتیسی (کاظم علی جوان اور للولال کوی) زیادہ مقبول و معروف ہیں۔ یہ سبھی داستانیں ۱۸۰۱ء سے ۱۸۰۴ء کے درمیان لکھی گئیں۔ فورٹ ولیم کالج کے بعد بھی ۱۹ویں صدی کے اواخر تک داستانین تصنیف کی جاتی رہیں ان میں محمد بخش مہجور کی نورتن (۱۸۱۴ء) سرور کی فسانۂ عجائب، نیم چند کھتری کی گل صنوبر (۱۸۳۷ء) الف لیلہ (۱۹۴۲ء) بوستان خیال، طلسم ہوش ربا، سخن دہلوی کی سروش سخن (۱۸۶۰ء) جعفر علی شیون کی طلسم حیرت (۱۸۷۲ء) اور الف لیلہ وغیرہ زیادہ مشہور ہوئیں۔ ان مشہور و معروف داستانوں کے علاوہ سینکڑوں داستانیں لکھی گئیں جن میں سے بہت ساری چھپی ہیں اور کچھ آج بھی غیر مطبوعہ ہیں۔

اردو زبان و ادب کے ابتدا اور ارتقا میں سب سے اولین نام ملا وجہی کا ہے جس نے اردو کی اولین داستان کی ''سب رس'' (۱۶۳۵) کے نام سے لکھی۔ ''سب رس'' کی وجہ سے صرف ملا وجہی نہیں بلکہ پورے دکنی ادبا اور شعرا کا نام احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ''سب رس'' ایک تمثیلی قصہ ہے۔ اس میں حسن و عشق کی کشمکش اور عشق و دل کے معرکے کو قصے کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ ''سب رس'' کا دیباچہ خود ملا وجہی نے لکھا ہے۔ ملا وجہی نے قصہ کے فن یا کردار نگاری پر کوئی تنقید نہیں کی ہے۔ قصہ میں زبان کی سلاست اور فصاحت کے تعلق سے تذکرہ

ملتا ہے جو قابل توجہ ہے۔ ملا وجہی نے اپنی تحریر میں لکھا ہے:

''جیتے چوساراں، جیتے فہم داراں، جیتے گن کاراں ہوئے سن آج لگن کوئی اس جہان میں، ہندوستان میں ہندی زبان سوں، اس لطافت اس چھنداں سوں نظم ہور نثر ملا کر گلا کر یوں سئیں بولیاں۔''(۱)

''سب رس'' کے بعد تقریباً ڈیڑھ صدی تک اردو کی نثری تصانیف کا ذکر نہیں ملتا۔ ۱۷۷۵ء میں عطا حسین خاں تحسین نے فارسی قصہ ''چہار درویش'' کا اردو ترجمہ ''نوطرزِ مرصع'' کے نام سے کیا۔ ''نوطرز مرصع'' میں بھی مصنف نے داستان کے زبان و بیان اس کی فصاحت و بلاغت پر زورِ قلم صرف کیا ہے۔ عطا حسین خاں تحسین کی دلی خواہش تھی کہ بادشاہ سراج الدولہ کی خدمت میں اپنی کتاب ''نوطرزِ مرصع'' بادشاہ کے مزاج کے مطابق اس کے شان و شکوہ، اس کی دلیری اور بہادری کے اوصاف کا بیان فارسی آمیز مرصع و مسجع زبان میں کیا ہے۔ چونکہ اس دور میں فارسی کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل تھا۔ اس لیے بادشاہوں اور اشرافیہ طبقے کی زبان فارسی تھی۔ فارسی کو لوگ پسند کرتے تھے۔ داستان کے نام و نمود اور اپنی علمی استبداد کے مظاہرہ کے لئے اس نے ''نوطرز مرصع'' جیسی تصنیف لکھی مگر افسوس کہ کتاب کی تیاری سے پہلے سراج الدولہ کی موت واقع ہوگئی اور اپنے طرز کی یہ نادر کتاب بادشاہ کے دربار میں پیش ہونے سے محروم رہ گئی اور داد و تحسین حاصل نہ کرسکی۔ داستان ''عجائب القصص'' ۹۳-۱۷۹۲ء میں بادشاہ شاہ عالم ثانی کے ہاتھوں لکھی گئی۔ شاہ عالم ثانی نے اپنی کتاب میں پہلی بار اس بات کا اظہار کیا ہے کہ قصہ سننے والے کو فرحت اور مسرت ملے۔ یعنی وہ قصہ کو تفریح اور دلچسپی کی چیز سمجھتے۔ کتاب کے دیباچے میں بھی اس تعلق سے لکھتا ہے:

''مصنف اس حکایت رنگین اور مؤلف اس افسانہ شیریں کا ...... قصہ زبان ہندی میں یہ عبارت نثر کہئے اور کوئی لفظ اس میں غیر مانوس اور خلاف روزمرہ اور بے محاورہ نہ ہو اور عام فہم اور خاص پسند ہوئے کہ جس کے استماع سے فرحت تازہ اور مسرت بہ اندازہ مستمع کو حاصل ہو اور آدابِ سلطنت اور طریق عرض و معروض دریافت ہوں۔''(۲)

قصہ کی تفریح اور دلچسپی کے علاوہ ''آداب سلطنت'' کا ذکر ہوا ہے، جو اس کہانی کا اہم پہلو ہے۔ دراصل مصنف نے ''آداب سلطنت'' کے بارے میں اہم امور ''پنچ تنتر'' سے حاصل کیے ہیں۔ کیونکہ ''پنچ تنتر'' کی مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس میں حکومت چلانے کے طریقہ کار اور معاملات کی تفہیم کے ساتھ ساتھ کسی اہم مسئلہ پر کسی حاکم یا بادشاہ کو کس طرح اپنی دانش و بینش سے کام لینا چاہئے۔ ان تمام امور پر قصہ کے پیرائے میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس لحاظ سے شاہ عالم ثانی نے قصہ میں سماجی پہلو پر زور دیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگ قصہ پڑھ کر ''طریق عرض و معروض'' دریافت کر سکیں اور اس بات کا بھی تذکرہ ہے کہ اپنی بات یا اپنا مدعا کس خوبصورتی سے بیان کیا جائے کہ حاجت اور ضرورت پوری کی جائے۔

سترہویں صدی (۱۷۰۰-۱۶۰۱ء) سے اٹھارہویں صدی (۱۸۰۰-۱۷۰۱ء) تک کی مدت میں ملا وجہی کی ''سب رس''، عطا حسین خاں تحسین کی ''نوطرز مرصع'' شاہ عالم ثانی کی ''عجائب القصص''، ''قصہ مہرافروز و دلبر''، ''نوآئین ہندی'' اور ''رستم علی کا قصہ و احوال روہیلہ'' وغیرہ جیسی نثری تصانیف ملتی ہیں۔ مذکورہ بالا تصانیف کے دیباچوں میں چند تنقیدی اشارے ملتے ہیں چونکہ یہ عہد اردو نثر کی ابتدا اور ارتقا کا عہد تھا اس لیے اہل قلم کا سارا زور زبان پر ہوتا تھا۔ اردو نثر اپنے ابتدائی مراحل سے گزر رہی تھی اور کم کم لکھی جا رہی تھی۔ ایسے میں فکشن اور اس کی تنقید یا کسی تنقیدی اشارے کا ملنا یا لکھا جانا مشکل تھا، لیکن یہی ابتدائی کوششیں ۱۹ویں صدی کی نثری ادب کے لیے راہیں ہموار کیں۔

۱۹ویں صدی کے آغاز میں ہی فورٹ ولیم کالج قائم ہو گیا تھا یہ دور اردو نثر کی ترقی کے لئے اہم تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس عہد میں عموماً داستان تصنیف کی گئی تھی۔ اس عہد کے چند داستانوں میں ''فکشن کے تنقیدی عناصر'' کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خلیل علی خاں اشک کی داستان، امیر حمزہ کی تمہید میں خود اشک نے لکھا ہے:

> ''بنیاد اس قصہ دلچسپ کی سلطنت محمود بادشاہ کے وقت سے ہے۔ اس زمانے میں جہاں تک راویان شیریں کلام تھے انہوں نے آپس میں مل کر......امیر حمزہ کے قصہ کی چودہ جلدیں تصنیف کی تھیں...... بموجب خواہش مسٹر گل

کرسٹ......واسطے نوآموزان بزبان ہندی کے اس قصہ کو زبان میں اردوئے

معلیٰ کی لکھا تھا کہ صاحبان مبتدیان کے پڑھنے کو آسان ہوئے۔''(۳)

اسی کا ایک لکھنوی نسخہ بھی ہے جو بعض باتوں میں اشکؔ والے نسخے سے مختلف ہے۔اس کے آخر میں یہ عبارت درج ہے:

''اگر نظر غور سے دیکھا جائے تو افکار اور پریشانی مٹانے کا کوئی طریقہ ملاحظہ

تاریخ و معائنہ قصص سے بہتر پیدا نہیں حالت رنج و غم میں کوئی مونس اور رفیق

ایسا نہیں......اس کے مولف نے عجب سحر کاری فرمائے ہے۔''(۴)

اوپر کی عبارتوں سے واضح ہوتا ہے کہ داستان امیر حمزہ، سلطان محمود بادشاہ کے وقت کی کہانی ہے جو اس زمانے کے لوگوں کے درمیان بے حد مقبول تھا۔اس کی مقبولیت کی وجہ سے گل کرسٹ نے اسے آسان اور عام فہم زبان میں منتقل کرنے کا حکم دیا اور دوسری عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ قصہ گو یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ دل بہلانے اور تفریح کے لئے قصہ گوئی یا تاریخ کے مطالعہ سے بہتر اور کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہوسکتا۔یعنی اب قصے کو تاریخ کے برابر سمجھا جارہا ہے جس طرح تاریخ میں حقائق اور واقعات کا بیان ہوتا ہے اسی طرح قصہ میں بھی ہوتا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کی سب سے مشہور داستان ''باغ و بہار'' ہے۔یہ ۱۸۰۲ء میں مکمل ہوئی۔سلیم اختر نے باغ و بہار کے اس دیباچے کو اپنی مرتب کردہ کتاب میں شامل کیا ہے۔اس میں لکھا ہے:

''جان گل کرسٹ صاحب نے فرمایا کہ اس قصے کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں جو

اردو کے لوگ ہندو، مسلمان، عورت، مرد، لڑکے بالے، خاص و عام آپس میں

بولتے جاتے ہیں، ترجمہ کرو، موافق حضور کے۔ میں نے بھی اس محاورے

سے لکھنا شروع کیا ہے، جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔''(۵)

اس عبارت میں فکشن یا داستان کے سلسلے میں اہم تنقیدی اشارہ ملتا ہے۔میر امن کے اظہار بیان سے واضح ہے کہ وہ قصہ کی تعمیر میں مکالمہ نگاری سے کام لینا چاہتے ہیں اور Dialogue کے ذریعہ ڈرامائیت، لحاظ مراتب کے ساتھ ساتھ بول چال کی زبان میں قصہ کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ مکالمہ کی یہ کیفیت

پوری کتاب میں نظر آتی ہے اور اسی مکالمہ سے میر امن نے قصہ میں ڈرامائیت پیدا کی ہے۔ لحاظ مراتب کا اندازہ بھی بول چال کی زبان کے ذریعے ہو جاتا ہے۔ باغ و بہار اپنی مقبولیت کے باعث بار بار چھپتی رہی۔ تقریباً ہر اہم نقاد نے اسے اپنے طور پر مرتب کیا ہے اور مقدمہ بھی لکھا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے معتبر نقاد پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی نے ''باغ بہار'' ترتیب دیا ہے اس کے مقدمہ میں وہ لکھتے ہیں:

> ''وہ محض سادہ نگار نہ تھے۔ ایک کامیاب داستان گو اور صاحب طرز ادیب بھی تھے۔ روانی، دلکشی، روزمرہ اور محاورے کا حسن، بول چال کی زبان، جزئیات نگاری، لفظوں کا برمحل، خوبصورت اور معنی خیز استعمال اور حسب ضرورت ہندی الفاظ سے استفادہ ان کے طرز نگارش کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان کے یہاں سادگی بھی ہے اور پرکاری بھی۔ انہوں نے بول چال کی زبان کو ادب کی زبان سے بنا دیا ہے اور یہی ان کا کمالِ فن ہے۔''(۶)

رجب علی بیگ سرور نے ۱۸۲۴ء میں داستان باغ و بہار کے جواب میں ''فسانۂ عجائب'' لکھی۔ ''فسانۂ عجائب'' میں لکھنوی تہذیب وتمدن کی عکاسی ہے۔ جب کہ باغ و بہار دہلوی تہذیب کی آئینہ دار ہے۔ اس طرح ایک چشمک کے طور پر رجب علی بیگ سرور نے کتاب کی ابتدا میں باغ و بہار کے اسلوب اور زبان پر فقرے چست کیے ہیں:

> ''دلی کے روڑے ہیں محاورے کے ہاتھ منھ توڑے ہیں۔''(۷)

اس طرح ایک طرفہ ہی سہی تقابلی تنقید کا رجحان آیا۔ اس کے بعد ۱۸۵۴ء میں سرور دلی آئے تھے اور ان کی ملاقات مرزا غالبؔ سے ہوئی تھی۔ مرزا غالبؔ ایک عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ذوق سلیم بھی رکھتے تھے۔ وہ اپنی روزمرہ کی گفتگو میں بھی ایسی گفتگو کرتے جس میں تنقید کے اولین نقوش تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ مرزا غالب کے تنقیدی شعور کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ ان کی گفتگو سنیے:

> ''سرور : مرزا صاحب! اردو زبان کس کتاب کی عمدہ زبان ہے؟
>
> غالب : چار درویش کی

سرور : اور فسانۂ عجائب کیسی ہے؟

غالب : اجی لاحول ولاقوۃ! اس میں لطف زبان کہاں؟''(۸)

غالبؔ نے یہاں ''لطف زبان'' کہہ کر ''باغ و بہار'' کی سب سے بڑی خوبی کی طرف اشارہ کردیا ہے۔ فکشن کی تنقید میں یہ محض اشارہ نہیں ہے بلکہ ''تقابلی تنقید'' کا رجحان سامنے آیا۔ اس عہد میں تنقید کا یہی رجحان ملتا ہے۔ کہیں ایک جملہ اور کہیں آدھ جملہ۔ اسی طرح بتدریج فکشن کی تنقید میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس لحاظ سے ''طبقات الشعرائے ہند'' اہم تذکرہ ہے اس میں بعض نثر نگاروں کے احوال بھی لکھے گئے ہیں اور کہیں کہیں ان کی نثری کاوش پر ہلکا اشارہ بھی شامل ہے۔ جسے ایف۔فلن اور مولوی کریم الدین نے مشترکہ طور پر مرتب کیا ہے۔

''باغ و بہار''، ''رانی کیتکی کی کہانی'' ایک ہی زمانے کی دو کہانیاں ہیں۔ ان دونوں کی مقبولیت اپنی جگہ مسلم ہے، مگر جو مقبولیت باغ و بہار کو اس کی سادہ نگارش کی وجہ سے حاصل ہوئی وہ رانی کیتکی کے قصے میں نہ آسکی۔ اس کے ذریعے اردو نثر کو ایک معیاری اسلوب ملا۔ بقول فرمان فتح پوری:

''ایسا اسلوب جس کے نقوش و آثار غالبؔ و سرسید سے لے کر حالی و مولوی عبدالحق تک صاف نظر آتے ہیں۔''(۹)

''رانی کیتکی کی کہانی'' اکہرے پلاٹ کی مختصر داستان ہے۔ داستان اور جدید افسانے کی درمیانی کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔ انشاء اللہ خاں نے التزام کیا ہے کہ عربی اور فارسی کا کوئی لفظ درمیان تحریر نہ آنے پائے۔ اس کے باوجود زبان صاف ستھری اور رواں ہے۔ مافوق الفطری عناصر کا میلان کم سے کم ہے۔ کہانی کی اندرونی فضا عام داستانوں کے برعکس تخیل و تصور سے پرے ہے زمین پر ہی سارے معاملات پیش آتے ہیں۔ اس کے چند جملے ملاحظہ فرمائیے:

''ایک رات رانی کیتکی نے اپنی ماں رانی کام لتا کو بھلاوے میں ڈال کے یہ پوچھا۔ گروجی گسائیں مہندر گرو نے جو بھبھوت میرے باپ کو دیا تھا۔ وہ کہاں رکھا ہوا ہے اور اوس سے کیا ہوتا ہے۔ اوس کی ماں نے کہا میں تیرے واری! تو کیوں پوچھتی ہے؟ رانی کیتکی کہنے لگی۔ آنکھ مچولی کھیلنے کے لئے

چاہتی ہوں جب اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلوں اور چور بنوں، تو کوئی مجکو
پکڑ نہ سکے۔رانی کام لتا نے کہا: وہ کھیلنے کے لئے نہیں ہے۔ایسے لٹکے کسی
برے دن کے سنبھال کو ڈال رکھتے ہیں کیا جانے، کوئی گھڑی کیسی ہے، کیسی
نہیں۔' رانی کیتکی اپنی ماں کی اس بات سے اپنا منھ تھتھا کے روٹھ گئی اور دن بھر
کھانا نہ کھایا۔''(۱۰)

فسانۂ عجائب کی داستان بظاہر طبع زاد نظر آتی ہے، حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔سرور نے مختلف قصوں کی مدد سے اس کا پلاٹ مرتب کیا ہے۔اسی لیے پلاٹ حد درجہ پیچیدہ ہوگیا ہے اور داستانوی عناصر اس میں تقریباً گم ہوگئے ہیں۔دوسری بات جو غور طلب ہے وہ یہ کہ فسانۂ عجائب کی انشا پردازی ایک پر تکلف و پرشکوہ اسلوب نثر کی بنیاد ڈالتی ہے۔لکھنوی تمدن کی عکاسی اور باغ و بہار کا جواب ہونے کی حیثیت سے بھی فسانۂ عجائب کی اہمیت ہمیشہ تسلیم کی جائے گی۔جب کبھی میر امن کا ذکر آئے گا رجب علی بیگ سرور خود بخود ذہن میں ابھر آئیں گے۔

''داستان امیر حمزہ'' اردو کی سب سے اہم اور طویل داستان ہے۔بشمول ''طلسم ہوشربا'' چھیالیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ہر جلد میں بڑے سائز کے ایک ہزار صفحات ہیں۔''بوستانِ خیال'' کا بھی کم وبیش وہی حال ہے۔نو جلدوں پر مشتمل اس کتاب کی اہمیت اس لیے بڑھ جاتی ہے کہ اس کے دیباچہ میں خواجہ امان نے داستان کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔انہوں نے داستان کی ایک اہم خصوصیت یہ بتائی ہے کہ اس میں تاریخ گزشتہ کا لطف آئے اور اصل ونقل میں کوئی فرق نہ ہو۔یہ رائے بہت حد تک موزوں ہے، لیکن خود 'بوستان خیال' اس معیار پر پوری نہیں اترتی۔اس کا پلاٹ بہت پیچیدہ اور بیان بے حد گنجلک ہے۔آج ان داستانوں سے ہماری بے توجہی ہے اور دلچسپی باقی نہیں ہے۔اس کی سب سے بڑی وجہ بھاری بھرکم اور ضخیم داستانِ حیات ہے، لیکن ان کی ادبی و تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

اردو فکشن کی تنقید کے سلسلے میں مغربی دانشور گارساں دتاسی کے خطبے اہم ہیں جو مشرقی ادب وتہذیب اور زبان کے ارتقاء پر لکچر کی صورت میں موجود ہیں۔اس کا تفصیلی جائزہ دوسرے باب میں لیا جائے گا۔

داستان ''مہر وماہ''، ''طوطا کہانی''، ''باغ و بہار''، ''پدماوتی''، ''پریم ساگر''، ''گل بکاولی''، ''ہیر رانجھا''،

''گل وصنوبر''، ''نوطرز مرصع''، ''بیتال پچیسی''، ''سنگاسن بتیسی''اور''فسانۂ عجائب'' جیسی ہندوستانی کہانیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے زبان، اسلوب اور واقعہ نگاری وغیرہ پر ہلکے تنقیدی اشارے ملتے ہیں جسے ہماری تنقیدی نگارشات میں اہم مقام حاصل ہے۔

ادب وتنقید میں کبھی کبھی معاصرین کی چشمک یا ادبی تنازعے بھی تنقیدی خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنتے ہیں۔ مثلاً سروشِ سخن (۱۸۶۰ء) جو دراصل فسانۂ عجائب کے جواب میں لکھی گئی۔ اس کے دیباچہ میں سروش نے سرؔور کی زبان پر اعتراض کیا ہے۔ چونکہ فسانۂ عجائب میں سرور نے میر امن کی باغ و بہار کے حوالے سے ان کی زبان پر کڑی نکتہ چینی کی تھی۔ اس کے نتیجے میں انہیں (سرور کو) دلی والوں نے اپنا نشانہ بنایا اور حد تو یہ کہ فسانۂ عجائب کا جواب تقریباً چھتیس سال بعد سروش سخن کے دیباچے میں دیا گیا۔ اس ادبی تنازعے سے اردو فکشن کی تنقید کا بھلا ہوتا گیا اور آہستہ آہستہ تنقیدی شعور میں پختگی آتی گئی۔

''خط تقدیر'' کی پہلی اشاعت ۱۸۶۲ء میں ہوئی۔ اردو تنقید نگاروں کے نزدیک اس کے ناول یا داستان ہونے پر شک وشبہات کیے جاتے رہے ہیں اسی سبب نقادوں کے درمیان اس پر تفصیلی گفتگو نہ کرتے ہوئے موضوع بحث بنی رہی۔ اس کے دیباچے کے تعلق سے عرض ہے کہ مولوی کریم الدین نے قصہ نگاروں سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت اہم ہیں اور ان میں فکشن تنقید کے بنیادی عناصر تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ اس کے چند اہم نکتوں پر غور کرنے کی ضرورت ہے:

(۱) قصہ ایسے پیرائے میں ہو جس کا اثر طبع انسان پر ہو۔

(۲) جو شخص پڑھے یا سنے اسے اپنے حسب حال معلوم ہو۔

(۳) زبان آسان ہو۔

(۴) ایشیائی قصوں کی پرانی روش اور طور چھوڑ کر نئے طریقے سے کہانی لکھنا۔ وغیرہ

مولوی کریم کی یہ تحریر اردو افسانوی ادب کی تنقید میں بڑی بنیادی بحث اٹھاتی ہے۔ یہاں قصہ کے پیرائے پر بھی گفتگو ہے کہ اسے اس کا انداز ہونا چاہئے کہ انسانی فطرت اس سے متاثر ہو۔ مولوی کریم الدین کے خیالات اس زمانے کے دوسرے ادبی اور سماجی کارگزاروں غالبؔ، سرسید احمد خاں، الطاف حسین حالی، محمد حسین

آزاد، شبلی نعمانی اور ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ کے خیالات سے قدرِ مشترک ہیں۔ مرزا غالبؔ نے 'بوستانِ خیال' کے ایک نسخے پر تقریظ لکھی تھی۔ اس میں غالبؔ نے اپنے طور پر فن داستان گوئی کی مختصر تعریف کی ہے۔ ۱۸۶۱ء کی یہ تحریر ملاحظہ فرمایئے:

''موعظت و پند نہیں، ترہات ندیمانہ ہے۔ سیر و اخبار نہیں جھوٹا افسانہ ہے۔
داستان طرازی من جملہ فنونِ سخن ہے۔ سچ یہ ہے کہ دل بہلانے کے لئے
اچھا فن ہے۔'' (۱۱)

غالبؔ کے یہ خیالات داستان طرازی کی حد تک تو صحیح ہو سکتے ہیں، مگر قصہ گوئی کی حیثیت سے اہمیت کے حامل نہیں ہیں۔ کیونکہ جب ان سے قبل کے ادیبوں نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ قصہ تاریخ سے دلچسپ ہو، ہر انسان کے حسب حال ہو تو پھر غالبؔ کا اسے صرف ''دل بہلانے کے لئے اچھا فن'' کہنا زیادہ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ایسی صورت میں خصوصاً جب کہ خود بوستانِ خیال کا مترجم ہی اس کے لیے اصول وضوابط مقرر کر رہا ہے اور اسے دل بہلانے کی چیز نہیں سمجھ رہا ہے۔ ان باتوں سے قطع نظر فکشن کی ارتقائی صورت کے پیش نظر ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ فکشن کی تنقید ابتدا سے غالب تک آتے آتے زبان اور اسلوب کے چٹخارے سے آگے بڑھ کر قصہ میں کردار، تواریخ سے اس کی مماثلت اور مشابہت، ماحول اور معاشرت کی پیش کش کے ساتھ دلچسپی تک آ گئی۔

یہی وہ زمانہ ہے جب غالب کے ساتھ سرسید احمد خاں، الطاف حسین حالیؔ، محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی اور نذیر احمد وغیرہ ۱۸۵۷ء کے سیاسی، سماجی بحران کے بعد ٹھوس، زمینی اور سچی حقیقتوں کو جن کا براہ راست زندگی سے تعلق ہے، ادب میں پیش کرنے کی ضرورت کو محسوس کرنے لگے تھے۔ سماج کے بدلے ہوئے رخ نے حالات میں تبدیلی پیدا کی۔ مختلف تعلیمی سرگرمیوں، مدرسوں اور کالجوں کے قیام سے پڑھنے والوں کی تعداد کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ اصلاح معاشرہ کا جذبہ پڑھے لکھے لوگوں میں عام ہو گیا تھا۔ تعلیم کے فروغ اور اصلاح کے لیے ہی نذیر احمد نے اردو میں ناول نگاری شروع کی۔ بلکہ حالی، شرر اور رسوا تک ہر ایک کی ناول نگاری اس جدید ذہنیت کا ثبوت پیش کرتی ہے۔ جس نے ناول کو اظہار خیال کے لیے سب سے اچھا آلہ بنایا۔ اسی عہد میں نذیر احمد کے ہاتھوں اردو میں ناول نگاری کا وجود عمل میں آیا اور پہلی بار نذیر احمد نے اردو قصہ کو طوطا مینا کی گفتگو، طلسماتی دنیا کے تحیر خیز

واقعات اور مافوق الفطرت عناصر سے پاک کیا۔ اپنے زمانے کے مزاج اور ماحول کے تقاضے کے پیش نظر ایسی کہانیاں لکھیں جن میں ہمارے درمیان کے انسان، ہماری اپنی دنیا کے کردار، روزمرہ کے مسائل سے دوچار نظر آتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی کہانیوں میں پندوموعظت کا زور ملتا ہے، لیکن یہ اس عہد کے حسب حال ہے۔ ان کا پہلا ناول ''مرأۃ العروس'' ہے جو ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا۔ حالانکہ اس کے دیباچہ میں قصہ کے فن کے اوپر کوئی گفتگو نہیں ملتی لیکن قصہ لکھنے کی ضرورت اور اس کی نوعیت پر اظہار خیال ضرور ملتا ہے۔ ان کے دیباچوں میں واقعہ نگاری کے عناصر پر زور دیا گیا ہے۔ نذیر احمد نے لکھا ہے:

> ''تب مجھ کو ایسی کتاب کی ضرورت محسوس ہوئی جو اخلاق و نصائح سے بھری ہوئی ہو اور ان معاملات میں جو عورتوں کی زندگی میں پیش آتے ہیں اور عورتیں اپنے توہمات اور جہالت اور کجروی کی وجہ سے ہمیشہ مبتلائے رنج و مصیبت رہا کرتی ہیں جو ان کے خیالات کی اصلاح اور ان کے عادات کی تہذیب کرے اور ایسے دلچسپ پیرائے میں ہو جس سے ان کا دل نہ اکتائے، طبیعت نہ گھبرائے۔'' (۱۲)

یہاں قصہ میں اصلاح کے ساتھ ''دل نہ اکتائے'' اور ''طبیعت نہ گھبرائے'' کی خاطر اس کا ''دلچسپ پیرایۂ'' میں بیان کرنے پر زور دینا قصہ کی مبادیات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ مراۃ العروس پر ایم کیپسن ڈائرکٹر آف پبلک کنسٹرکشن، ممالک شمال و مغرب کی تقریظ بھی شامل ہے جس میں درج ذیل باتیں شامل ہیں:

> ''یہ کتاب نہایت دلچسپ اور اس ملک کے لوگوں کے مناسب حال ہے اب تک اس قسم کی کتاب کوئی نہیں ہوئی اور عبارت اور طرز بیان کی نظر سے زبان اردو کا ایک بہت اچھا نمونہ ہے۔ کتاب مذکورہ اس باب میں مرزا نوشہ دہلوی متخلص بہ غالب کے حال کے چھپے ہوئے رقعات کے برابر ہے اور فی الوقت الف لیلہ اور بدرالدین خان دہلوی کی بوستان خیال اردو کے ہم پلہ ہیں۔'' (۱۳)

اس عبارت میں فکشن کی تنقید ایک نئی منزل کی طرف داخل ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اب قصہ کا موازنہ تاریخ کے بجائے ''خطوط'' سے کیا جارہا ہے۔ کسی قصہ کو خطوط کے برابر قرار دینا کوئی معمولی بات نہیں۔ ''خطوط'' انسان کی نجی زندگی کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ خصوصاً یہاں غالب کے خطوط کی بات کی گئی ہے، جن کی ایک اہمیت تو نثر کے باعث ہے، دوسرے اس میں زمانے کے سرد و گرم یعنی عصری حسیت کی آنچ ہے، تیسرے سماجی زندگی کی وہ تصویر ہے جس میں غالب سانس لے رہے تھے۔ اگر صاحب رائے ایم کیپسن ''خطوط غالب'' کو کسی قصہ کے مقابل تصور کرتا ہے تو یہ ایک اہم نکتہ ہے اور خطوط میں قصہ گوئی کی اساسی خصوصیت کی تلاش ایک گہری تنقیدی بصیرت کا ثبوت دیتا ہے۔

نذیر احمد کا کمال فن ہے کہ انہوں نے جن کرداروں کو اس کہانی میں پیش کیا ہے، وہ اپنے اعمال، اطوار اور مکالموں کے ذریعے ایسے نظر آتے ہیں کہ گویا ان کی نقل ہو رہی ہے اور جس ماحول کو انہوں نے پیش کیا ہے۔ وہ ان کے عہد کے حالات سے مطابقت رکھتا ہے اور کم وبیش یہی وصف اچھے خطوط کا بھی ہوتا ہے جیسا کہ غالب کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے۔ اسی بنا پر ایم کیپسن نے ''مرأۃ العروس'' کا موازنہ غالب کے رقعات سے کیا ہے کہ ''مرأۃ العروس'' غالب کے چھپے ہوئے رقعات کے برابر ہے۔ اس کے علاوہ اس نے قصہ کے پلاٹ، کردار اور مکالمہ نگاری پر بھی تنقیدی گفتگو کی ہے۔ اس کی زبان اور اسلوب کی بھی بات ہے۔ اس لحاظ سے اردو فکشن کی تنقید آہستہ آہستہ بالغ ہوتی نظر آتی ہے۔

تاریخی اعتبار سے اب شاد عظیم آبادی کی ''صورت الخیال (موسوم بہ ولایتی کی آپ بیتی)'' کا وہ دیباچہ سامنے آتا ہے، جس میں مصنف قصہ نگاری میں نئی روش کی تلاش کرتا ہے کہ:

> ''اس نئی طرز کی داستان میں نہ کسی طلسم کے باندھنے اور توڑنے کا حال ہے، نہ جنوں اور دیو پری کا ڈھکوسلہ ہے۔ نہ کسی ایسے انوکھے ملک اور انوکھی خلقت کا بیان کہ اس کا پتہ نہ زمین میں ملے نہ آسمان پر حتی الوسع اس خیالی قصہ میں فطرتی حالات پر بہت کچھ توجہ کی گئی ہے۔ اپنی ہی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد اور اپنے ہی دل کی گڑھت ہے۔'' (۱۴)

یہ خیالات ۱۸۷۶ء کے ہیں جس میں قصہ کا مقصد اصلاح معاشرہ بتایا گیا ہے اور اس سے قدیم قصوں پر تنقید اور نئی کہانی کی تلاش کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی ناول کے بارے میں پرنسپل مدرسہ عالیہ نے اپنے تاثرات ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن بنگال کو بتاریخ ۲۱ فروری ۱۸۸۱ء ان الفاظ میں لکھے تھے:

''مجھے اس بات کے کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ جس قدر ناولیں ہندوستانی زبان میں پڑھی ہیں۔ ان میں یہ ناول سب سے بہتر ہے۔ ہر شخص جس کا بیان اس قصے میں یکے بعد دیگرے ہے۔ یعنی آقا بی بی، نوکر، انگریز یا ہم گویا زندہ ہے۔ اپنی خاص وضع کی ہندوستانی زبان میں باتیں کرتا ہے۔ ہماری رائے میں یہ ناول مراۃ العروس اور بنات النعش سے باعتبار ادب وانشاء کے کہیں بڑھی ہوئی ہے۔'' (۱۵)

یہاں کردار نگاری کا ذکر ہے اور نذیر احمد کے ناولوں سے تقابلی مطالعہ بھی۔ یہ ناول تبصرہ نگار کے نزدیک ادب وانشا کے لحاظ سے مراۃ العروس اور بنات النعش سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔

رتن ناتھ سرشار بھی اردو فکشن کا ایک اہم نام ہے۔ ان کی کئی تصانیف ہیں۔ ان تصانیف کے سلسلے میں انہوں نے جو گفتگو کی ہے ان میں تنقیدی نقوش ملتے ہیں۔ ''جامِ سرشار'' پہلی بار ''فسانۂ جدید'' کے نام سے اودھ اخبار میں بالاقساط شائع ہوا تھا۔ ۱۸۸۷ء میں اردو کے نول کشور پریس نے پنڈت سادھو پرشاد (ڈپٹی کلکٹر واکسٹرا اسٹنٹ ممالک مغربی وشمالی اودھ) سے، جو اپنے زمانے کے نمایاں اہل علم تھے، اس ناول کو مرتب کروایا اور اس ناول پر انہوں نے ایک تقریظ بھی لکھی جس میں جامِ سرشار کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے انہوں نے اس کے کئی کرداروں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ناول میں کرداروں کے استعمال کی طرف نقادانِ فن نگاہ رکھنے لگے تھے۔

رتن ناتھ سرشار جنہیں تاریخی ناول کے موجد ہونے کا شرف حاصل ہے اور ''دلگداز'' کے مدیر بھی تھے۔ رسالہ دلگداز میں ناول کا سلسلہ پیش کرتے تھے اور گاہے گاہے اپنے ناولوں کے جواز میں تبصرہ یا مختصر مضمون بھی شائع کرتے تھے۔ ان میں بھی تنقید کی چند روشنی ملتی ہے۔ ایک اور مضمون دلگداز جنوری ۱۸۸۹ء میں ''ہمارا جدید

ناول‘‘ کے نام سے چھپا تھا۔اس میں جن باتوں کا ذکر ملتا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) مسلمانوں کے اوصاف اور کمال کو اگر ناول میں لکھیں تو ہمارے ناولوں کا شمار دنیا کے کل مصنفوں کے ناولوں سے بڑھ جائے۔

(۲) ان کے نزدیک ناول میں اپنی قوم کے گزشتہ حالات اور اگلی نیک نامیوں کو ظاہر کر کے آج کل کے بجھے ہوئے دلوں میں ایک تازہ جوش پیدا کیا جا سکتا ہے۔

یعنی ناول کا موضوع ان کے نزدیک نہایت محدود ہو جاتا ہے۔ یہ بہار کی پہلی خاتون ناول نویس رشیدۃ النساء کی فکر کا نتیجہ ہے۔ وہ ناول ’’اصلاح النساء‘‘ کے دیباچے میں لکھتی ہیں:

> ’’ہم کو بھی خیال ہوا کہ ایک کتاب ایسی لکھیں، جس میں ان رسموں کا بیان ہو، جن کے باعث سے صدہا گھر تباہ ہوگئے اور جو باعث فضول خرچ اور فساد کے ہیں، مگر مجھے خیال بھی ہوا کہ ان باتوں کو نصیحت کے طور پر لکھنا میری حیثیت پر زیبا نہیں ہے، بلکہ ان کو قصہ کے پیرایہ میں لکھنا ہر طرح سے مناسب ہوگا۔ یہ سوچ کر میں نے انہی رسموں اور جھگڑوں کو جو روزانہ ہر شریف خاندان میں ہوتے ہیں، فرضی نام رکھ کر لکھنا شروع کیا۔‘‘(۱۶)

یہاں قصہ کے فن پر کوئی گفتگو تو نہیں ملتی، لیکن نصیحت بھری باتوں کو ’قصہ کے پیرائے میں لکھنے‘ کی کوشش میں ہی مصنفہ کے تنقیدی شعور کا پتہ ملتا ہے۔

اب نذیر احمد شرر، سرشار کے بعد مرزا محمد ہادی رسوا کی تحریریں سامنے آتی ہیں۔’’افشائے راز‘‘ (۱۸۹۶ء)ان کا پہلا مکمل ناول ہے۔اس ناول میں رسوا نے ناول کے فن اور اس کے اجزائے ترکیبی کی طرف توجہ نہ دی، مگر اردو انشاء پردازی کی ترویج واشاعت کا ذکر ہے اور اپنے نظریہ فن کی وضاحت کی ہے۔اس سلسلے میں ان کا نظریہ ادب برائے زندگی (مولوی کریم الدین کے بعد) بھی واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔رسوا نے لکھا ہے:

> ’’اگرچہ اس ناول میں اعلیٰ درجہ سے لے کر ادنیٰ درجے تک کے اردو بولنے والوں کے مکالموں کی نقل کی گئی ہے، لیکن ہم نے حتی الوسع اردو زبان کی

سلاست کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور ایسی لفظیں ٹھونس کر نہیں بھریں جن کی ضرورت نہ تھی اور اگر کہیں ایسا کیا بھی گیا ہے تو اس سے جو مقصود ہے ناظرین اس کو سمجھ جائیں گے۔ ہم نے اپنی طرف سے اردو زبان کے محاوروں کے حرف میں بھی کفایت اور احتیاط سے کام لیا ہے، کیونکہ یہ ناول ہے......فکر کے سوا انسان کے دماغ میں ایک اور قوت بھی ہے جس کو خیال کہتے ہیں۔ یہ ایسی سیربیں ہے جس طرف ایک ادنیٰ توجہ کرنے سے آئندہ اور گزشتہ حالات کے ہو بہو نقشے آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ ناول ایک ایسی عمدہ چیز ہے جس کے ذریعے ہم وہی نقشے دوسروں کو دکھا سکتے ہیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ مفید اور دلچسپ انسان کے حالات ہیں۔ نہ صرف ظاہری حالات بلکہ باطنی اور بعد از نظر کیفیتیں اسی کے ذریعے سے دکھائی جا سکتی ہیں۔'' (۱۷)

اس طویل اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا نے نذیر، شرر اور سرشار کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ کیا ہے اور ان کے کامیاب تجربے بھی ان کی نظر میں ہیں۔ رسوا نے پہلی بار فن کے تقاضوں کو محسوس کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ فطرت انسان کے مطالعہ و مشاہدہ کے بغیر ناول کا تصور ہی ممکن نہیں۔ وہ ناول کا قصہ، ماحول اور اس کے کردار اپنے ہی آس پاس کے ماحول سے تلاش کرنے پر زور دیتے ہیں۔ وہ سماجی تصویر کشی کو بھی ناول کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ انہیں فن اس قدر عزیز ہے کہ ان کا ناول بجائے عوام الناس کے اہل فن میں قدر کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔

مذکورہ اقتباس کی سب سے بڑی خوبی اور نئی بات جو اس سے پہلے کسی نے نہیں کہی ہے۔ نہ دتا سی نے اپنے خطبات میں کہی ہے اور نہ کریم الدین کے نظریات میں ہے۔ یعنی کرداروں کی ظاہری ہی نہیں باطنی کیفیت کی بھی تصویر کشی۔ یہیں سے گویا نفسیات اردو ناول کی تنقید میں داخل ہوئی۔ ''امراؤ جان ادا'' میں اس کا عملی ثبوت ملتا ہے۔

نذیر احمد نے اردو ناول کی بنیاد ڈالی اور اسے زندگی کے حقائق سے وابستہ کیا۔ سرشار نے بتایا کہ یہ زندگی

کا آئینہ ہے۔ جس میں اس کی تمام وسعتیں اور رعنائیاں منعکس ہیں۔ اس زندگی میں ایسے کرداروں کی آب وتاب ہے جو دل نشیں، انوکھے اور قابل فراموش ہیں۔ شرر نے اس حقیقت کا انکشاف کیا کہ ناول میں قصہ گوئی کے کچھ حدود ہیں۔ واقعات کو لڑی میں پرونے کے کچھ اصول اور کچھ سلیقے ہیں، جن کے بغیر کسی قصے کو ناول نہیں کہا جا سکتا۔ رسوانے ان تینوں کی فنی روایات کا احترام کیا اور اردو میں پہلی بار ایک مکمل معیاری ناول ''امراؤ جان ادا'' کی صورت میں پیش کیا، جس میں وہ خوبیاں موجود تھیں جو ان سے قبل نذیر احمد، شرر اور سرشار کے ناولوں میں ملتی ہیں۔

۱۹ویں صدی کے اختتام تک اردو میں فکشن کی تنقید میں اضافہ اس کے مائل بہ ارتقاء ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس تعلق سے ہم سجاد حیدر یلدرم کا مضمون ''ناول نویسی'' بہت اہم ہے۔ جس میں ناول کی مقبولیت کے اسباب، اردو ناول کا تجزیہ، ناولوں کی فنی خصوصیات، ناولوں کے موضوعات وغیرہ پر تفصیلی گفتگو ہے اور مضمون نگار نے جگہ جگہ پر انگریزی (مضمون) ادب کے حوالے سے اپنی بات واضح انداز میں کہنے کی کوشش کی ہے۔ ان بیش قیمت خیالات کا اظہار سید سجاد حیدر یلدرم نے کیا اور یہ مضمون ''معارف'' اعظم گڑھ، کے شمارہ اکتوبر ۱۸۹۸ء میں شائع ہوا ہے۔ اس سے قبل پوری صدی میں اس نوعیت کا کوئی مضمون نہیں ملتا ہے۔ ذیل میں مضمون کے چند ٹکڑے پیش کیے جاتے ہیں تا کہ مضمون کی افادیت کا اندازہ ہو سکے:

> ''کسی کتاب کو پڑھنا شروع کرتے ہیں تو اکثر کی غرض یہ ہوتی ہے کہ انہیں لطف حاصل ہو۔ ایسے نفوش قدسیہ شاید لاکھ میں چار بھی نہیں ہوتے جو علم کو محض علم کے لئے حاصل کرتے ہوں اور جو ایسے ہیں وہ بھی خوشی کے بندے ہیں اور چونکہ علوم میں لطف حاصل کرنے کے لئے محنت سے لطف اٹھانا چاہتے ہیں، قصوں کی طرف جھک پڑتے ہیں۔'' (۱۸)

یہاں قصہ کو لطف وانبساط حاصل کرنے کا ذریعہ بتایا گیا ہے اور یہ بھی کہ اس کا استعمال اچھا ہو۔ یعنی ناول یا قصہ چونکہ سماج اور اس کے افراد پر اثر کرتا ہے اس لئے اخلاقی باتوں سے قصہ کو خالی نہیں ہونا چاہئے۔ اس سلسلے سے وہ سر والٹر اسکاٹ اور ڈکنس کے ناولوں کا حوالہ دیتے ہیں کہ ان کے ناولوں نے ''ملک کی پبلک پر بہت کچھ اثر ڈالا ہے۔''(۱۹)

’’ناول نویسی‘‘ جیسے طویل مضمون میں یلدرم نے ۱۹ ویں صدی تک کے ناولوں پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے ناول کی حقیقت پسندی اور داستان کی طلسماتی دنیا پر تبصرہ کیا ہے۔ ساتھ ہی قصہ کے مختلف معیار اور اقسام کی وضاحت بھی کی ہے۔ یہ ساری باتیں اپنی جگہ پر ٹھیک ہیں، مگر ان کی وضاحت انیسویں صدی کے آخری زمانہ تک کے ناول کے پیش نظر ہے۔ حالات بدل رہے تھے۔ اس حالات میں لکھے گئے ناول کی تعریف کے ساتھ اس کے اقسام میں بھی تبدیلی اور اضافہ ہوا ہے۔ یہ بڑی بات ہے کہ اس عہد میں جب کہ فکشن کی تنقید تو کیا خود اردو تنقید کے بال و پر بھی نہ آئے تھے۔ سجاد حیدر نے ناول نویسی کے بارے میں سوچا اور اس کی خامیوں کو سامنے رکھا، لیکن ان کے خیالات سے کلی طور پر اتفاق ممکن نہیں ہے۔ مثلاً ناول کی تقسیم بندی میں انہوں نے ان ناولوں کو اعلیٰ درجہ میں رکھا ہے جس میں مصنف انسانی فطرت پر ایک فلسفیانہ نگاہ ڈالتا ہے۔ یہاں اور بھی تقسیم بتائی گئی ہے، لیکن عشقیہ ناول کا کہیں ذکر تک نہیں ہے، لیکن جب ہم سجاد حیدر یلدرم کی ناول نویسی پر غور کرتے ہیں تو ان کے سب سے مشہور قصے ’’خارستان وگلستان‘‘ میں عورت کی نمود لطیف اور اس کی صنفی کشش کا کھلا کھلا اعتراف ملتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی دوسرے قصوں میں ان کے یہاں عشق کا ہی رجحان ملتا ہے۔ ممکن ہے ناول نویسی کے یہ اصول و ضوابط انہوں نے مشرقی ناولوں سے اخذ نہ کر کے مغربی مفکرین اور ناقدین کے مضامین پڑھ کر اخذ کیے ہوں جس کے نتیجے میں یہ تضاد رہ گیا ہے ناول کی اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’ہمارے ناولوں میں پلاٹ کی بہت بڑی کمی ہوتی ہے۔ ناول کے لئے عشق اتنا ہی ضروری ہے جتنا جسم کے لئے جان۔ عشق کے بعد جنگ کا نمبر ہے...... انگریزی ہی پر کیا موقوف ہے خود اردو کے قصوں میں عشق داخل کیا جاتا ہے، لیکن ایک بہت بڑا فرق انگریزی اور اردو کے قصوں میں یہ ہے کہ ان میں جب عشق کا سلسلہ چلتا ہے تو بالکل نیچرل معلوم ہوتا ہے اور اردو میں از سرتا پا بے جوڑ...... پرانے قصوں میں تو کوئی شہزادہ چھت پر سوتا ہوتا تھا اور عاشق ہونے کے لئے کوئی پری اڑ کر آتی تھی...... میں شمس العلما مولوی نذیر احمد کا کمال اسی بات میں سمجھتا ہوں کہ وہ اردو کے پہلے قصہ نویس ہیں جن کی غائر

نظر اس نکتہ پر پہنچ گئی کہ ہندوستانی سوسائٹی یا زیادہ صحیح طور پر ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی میں شادی سے پہلے جائز عشق معدوم ہے اور اس لئے انہوں نے عشق کا حصہ ہی اپنے قصوں میں نہیں رکھا اور حق یہ ہے کہ اس کمی سے قصہ میں کچھ خرابی واقع نہیں ہوئی، بلکہ میرے نزدیک ان کے ناول سوسائٹی کے حال کے بالکل مطابق ہو گئے۔ ہمارے اور ناول نویس اس تہہ کو نہیں پہنچے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انہیں اپنا پلاٹ ہندوستان کے باہر رکھنا پڑتا ہے یا عشق کو اس ترکیب سے داخل کرنا پڑتا ہے جو معمولی شریف آدمی کے ہاں ہرگز نہیں ہوتا۔'' (۲۰)

اس اقتباس کا بھی مقصد واضح ہے کہ ناول کی کہانی عموماً عشق پر مبنی ہوتی ہے۔ ہمارے ناول نویس اس سے آگے بڑھ کر دیکھ ہی نہیں سکتے۔ ہاں نذیر احمد کو اس سلسلے میں وہ مجتہد سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے قصوں سے عشقیہ عنصر نکال دیا جو ہندوستانی سماج کے مطابق تھا اور سجاد حیدر کے نزدیک یہی نذیر احمد کا بڑا کمال بھی تھا۔ سجاد حیدر کی ان باتوں سے اتفاق کرنا ان حضرات کے لیے مشکل ہوگا جو اس عہد کے ہندوستانی سماج سے واقف ہیں اور اسی بناء پر سجاد حیدر، نذیر احمد کے قصوں میں جس چیز کو کمال سمجھتے ہیں وہی ان کا عیب ہے کہ انہوں نے قصہ سے عشق کا عنصر نکال کر اسے اخلاق اور اصلاح کا پلندہ بنا دیا۔ پھر یہ کہنا کہ ''نذیر احمد کے ناول سوسائٹی کے حال کے مطابق ہوئے'' اور بھی بے بنیاد ہے۔ نذیر احمد نے تو دراصل اپنے عہد کے سماج سے نظریں چرائی ہیں اور سماج کو جیسا ہونا چاہے اس کی تصویریں اپنے ناولوں میں پیش کی ہیں۔ اس کے برعکس رسوا یا عزمی دہلوی وغیرہ نے سماج جیسا تھا، اس کی عکاسی اپنے ناولوں میں کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان کے ناول زندہ ہیں۔

سجاد حیدر کا یہ کہنا کہ وہ ناول نویس جو اپنے قصوں کے پلاٹ میں عشق کا عنصر شامل کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں اپنا پلاٹ ہندوستان کے باہر لے جانا پڑتا ہے، یہ خیال بھی مضحکہ خیز ہے۔ سرشار یا رسوا نے جس نوعیت کے عشق کا ذکر کیا ہے، کیا وہ ہندوستان کے باہر سے آئے ہیں اور خود سجاد حیدر نے اپنے قصوں میں عشقیہ مضامین کا دخل کیا ہے۔

اردو میں جس طرح ناول کی ابتدا ہو جانے کے بعد بھی داستان پوری آب و تاب کے ساتھ زندہ رہی۔ اسی طرح ناول کے عین فنی عروج کے زمانہ میں مختصر افسانہ پیدا ہوا اور پروان چڑھنا شروع ہوا۔ افسانہ کی پیدائش کے دن وہ ہیں جب ہمارا ناول آہستہ آہستہ فلسفہ، منطق اور نفسیات کی دنیا میں قدم رکھ رہا تھا۔ امراؤ جان ادا اور خواب ہستی کی تخلیق کا دور افسانہ کی پیدائش کا زمانہ ہے پھر ایک اور بات ہے کہ ناول کہانی کی ایک منفرد اور ممتاز صنف ہونے کے باوجود مدتوں اپنے آپ کو داستان کے سحر و افسوں سے آزادانہ کر سکا اور ہمارے ابتدائی ناول نگاروں میں سے ہر ایک کے یہاں داستان کے رنگ کی جھلکیاں اور اس کے نور کی کرنیں برابر اپنا جلوہ دکھاتی رہیں۔ یہی صورت مختصر افسانہ کے ساتھ پیش آئی۔ ہمارے مختصر افسانہ کے ابتدائی دور میں واضح طور پر داستان کی دلکش روایت کا عکس جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

اردو افسانہ پر تنقید کا آغاز نقادوں کی معرفت نہیں بلکہ خود افسانہ نگاروں کے ہاتھوں ہوا۔ قدیم رسائل و جرائد کے اوراق اس امر کے شاہد ہیں کہ مغرب میں بھی تنقید کی بنیادی اینٹ تخلیق کار ہی نے رکھی تھی۔ مغرب کے مشہور ناول نگار فیلڈنگ نے اپنے ناول کے دفاع میں تنقید لکھی اور اس کا یہ جملہ بعد کے ناول نگاروں اور ناول نقادوں کے لئے زادِ راہ بنا۔ اسی طرح ایڈگر ایلن پو نے افسانے کے اصول و ضوابط بھی وضع کیے گویا یہ اصول مناسب معلوم ہونے لگتا ہے کہ تنقید، تخلیق کے بطن سے جنم لیتی ہے۔

اردو افسانہ کا باضابطہ آغاز پریم چند نے کیا۔ ان کے مختصر افسانوں کے کئی ابتدائی مجموعے سوزِ وطن، پریم پچیسی اور پریم بتیسی اور ان میں بھی نمایاں طور پر سوز وطن، ان کے ہم عصروں میں سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں خارستان وگلستان، سلطان حیدر جوش کے اکثر اصلاحی افسانے اور نیاز فتح پوری کے افسانوں کا مجموعہ نگارستان اور اس میں بھی بالخصوص کیوپڑ اور سائکی اور الحمرا کا گلاب وغیرہ اس رنگین روایت کی نشانیاں اور یادگار ہیں۔

اردو افسانہ کے معمار پریم چند کہے جائیں گے۔ اس لیے کہ انہوں نے ہی پہلے پہل اس صنف کو فنی اعتبار سے روشناس کیا۔ ساتھ ہی اردو افسانہ پر تنقیدی نگارشات کے سلسلے میں بھی پریم چند کو اولیت حاصل ہے۔ اس لیے کہ ان کے ذہن میں صنف افسانہ کی کوئی نہ کوئی تعریف رہی ہوگی، اس کا کوئی اچھا یا برا، کم تر یا برتر معیار فن ضرور رہا ہوگا۔ چنانچہ پریم چند کی بعض تحریریں اس سلسلے میں ہماری رہنمائی کرتی ہیں اور اردو افسانے کی تنقید کی

تاریخ کو بیسویں صدی کے اوائل کی طرف لے جاتی ہیں۔ مثلاً ''سوز وطن کا دیباچہ'' یا ''میں افسانہ کیوں لکھتا ہوں'' یا ''میرے بہترین افسانے'' یا ''ہماری قوت بیانیہ کا زوال'' ان کے علاوہ ''مختصر افسانہ'' ، ''مختصر افسانے کا فن'' اور ایک شخصی مقالہ ''راشدالخیری کے افسانے'' یہ مضامین ابتدائی ضرور ہیں مگر جہاں پریم چند کی تنقیدی اور فنی بصیرت کا پتہ دیتے ہیں وہیں افسانے کی تنقید کی بنیاد بھی استوار کرتے ہیں۔

اسی کے ساتھ ۱۹۳۵ء تک کے رسائل و جرائد میں شائع ہونے والے مضامین، ان رسائل میں نیرنگ خیال، مخزن، زمانہ، ہمایوں، نگار، ادبی دنیا، اردو، العصر، عالمگیر، ادیب وغیرہ خصوصی اہمیت رکھتے ہیں، لیکن ان رسائل میں بمشکل پچیس مضامین ایسے ملیں گے جن کا تعلق براہ راست اردو افسانے سے ہے۔ اس لیے کہ اکثر ناقدین افسانہ کو فسانہ اور حکایت قرار دیتے ہیں۔ خود عبدالقادر سروری اور مجنوں کے یہاں بھی ایسی مثال موجود ہے۔ مثال کے طور پر مضامین کی چند سرخیاں ملاحظہ فرمائیے:

(۱) فن قصہ نویسی، از ضیاء الدین شمسی، مطبوعہ رسالہ 'ہمایوں' مئی تا نومبر ۱۹۲۲ء

(۲) فن افسانہ نگاری، از محمد عبدالقادر سروری، مطبوعہ 'نگار' دسمبر ۱۹۲۶ء

(۳) افسانہ کی ماہیت، از حسیب احمد صدیقی، مطبوعہ 'ہمایوں' نومبر ۱۹۲۷ء

(۴) کہانی کا سفر از ایم ضیاء الدین، مطبوعہ 'نیرنگ خیال' ۱۹۳۱ء

(۵) قصہ نویسی اور قصہ خوانی از محمد حسین ادیب مطبوعہ ہمایوں، ستمبر تا نومبر ۱۹۳۲ء

(۶) افسانے کے لئے مواد کی فراہمی از محمد حسین ادیب، مطبوعہ 'ہمایوں' جنوری ۱۹۳۳ء

(۷) عہد حاضر کے افسانہ نگار، از حمورابی، مطبوعہ 'نگار' مئی ۱۹۳۴ء

(۸) افسانہ نویسی، از عظیم بیگ چغتائی، 'ساقی' جنوری ۱۹۳۵ء

(۹) افسانہ نگاری کی قسمیں، از عظیم بیگ چغتائی، مطبوعہ 'ساقی' ۱۹۳۵ء

اسی نوع کے کئی مضامین ہیں، لیکن ان میں نہ کوئی اس وقت کا بہت اہم ناقد تھا نہ اب ہے......البتہ ۱۹۳۵ء کے بعد وقار عظیم، جمیل احمد کندھائے پوری اور ۱۹۴۰ء کے بعد صلاح الدین احمد، احتشام حسین، علی عباس حسینی، ممتاز حسین، محمد حسن عسکری، احسن فاروقی اور دوسرے نقاد سامنے آئے۔ تقسیم ملک کے بعد اردو افسانے پر

خوب خوب تنقید لکھی گئی جس کا زیادہ تر سرمایہ اس وقت کے رسائل میں محفوظ ہے۔

الختصر اردو فکشن کی تنقید، کے سلسلے میں سترہویں صدی عیسوی سے انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک اردو میں افسانوی ادب کی تنقید کا کوئی واضح رجحان نہیں ملتا، لیکن انیسویں صدی کی آخری پانچ دہائیوں میں افسانوی ادب کی تنقید میں نئے اور واضح تصورات ملتے ہیں اور یہ تصورات اچانک نہیں بلکہ بتدریج سامنے آئے ہیں اس لحاظ سے افسانوی ادب کی تنقید کا یہ ارتقاء اپنے آپ میں تدریجی نظر آتا ہے جس نے بیسویں صدی عیسوی میں اردو تنقید کے مختلف دبستان کو جنم دیا۔ ناول اور مختصر افسانے کی تنقید کی ابتدائی نگارشات پر سرسری طور پر دو چند باتیں ضابطہ تحریر میں لائی گئی ہیں، اس سلسلے کی تفصیلی گفتگو مقالے کے دوسرے اور تیسرے باب میں ہوں گی۔

☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔سب رس، ملا وجہی، مرتب: قمر الہدیٰ فریدی، ص۴۰

۲۔عجائب القصص، شاہ عالم ثانی، مرتبہ راحت افزا بخاری، ۲۶۔۲۵

۳۔داستان امیر حمزہ، خلیل علی خاں اشک، علمی پرنٹنگ پریس، لاہور، ص۲

۴۔ایضاً، ص۲

۵۔بحوالہ باغ و بہار، مرتب سلیم اختر، ص۱۰۶

۶۔بحوالہ باغ و بہار مرتب قمر الہدیٰ فریدی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۷ء، ص۲۸

۷۔فسانۂ عجائب، رجب علی بیگ سرور، ص۶۱

۸۔تذکرہ غوثیہ، شاہ گل حسن قادری، ص۱۰۱

۹۔اردو نثر کا فنی ارتقا، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۷ء، ص۱۵۵

۱۰۔کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی، انشاءاللہ خاں انشاء، جامعہ مکتبہ، دہلی، ۳۱۔۳۰

۱۱۔بوستانِ خیال، تقریظ مرزا غالبؔ، ۲۵۷

۱۲۔مرأۃ العروس، نذیر احمد، ص۲

۱۳۔انتخاب ڈاکٹ نمبری ۹۲۵، مورخہ ۲۲ جولائی ۱۸۶۹، مقام نینی تال، ص۶۔۴، مشمولہ اردو فکشن کی تنقید ارتضیٰ کریم، ص۲۴

۱۴۔صورۃ الخیال، شاد عظیم آبادی، ص۲۱

۱۵۔بحوالہ شاد کی نثر نگاری، وہاب اشرفی، ص۸۵

۱۶۔اصلاح النساء، رشیدۃ النساء، ۱۸۹۴ء، ص۳

۱۷۔افشائے راز، مرزا ہادی رسوا، ۱۸۹۶ء، ص۱۲۔۱۳

۱۸۔ناول نویسی، سجاد حیدر یلدرم، معارف، اکتوبر ۱۸۹۸ء، ۹۸۔۹۹

۱۹۔ایضاً، ص۹۸۔۹۹

۲۰۔ایضاً،ص ۱۰۵

باب دوم

اردو ناول کی تنقید: ابتدا تا حال

اردو ناول کی تنقید کا آغاز دیباچوں، تقاریظ اور تبصروں کی شکل میں ہوا۔ اس سلسلے میں جن لوگوں نے ابتدائی گفتگو کی ہے ان میں گارساں دتاسی، ایم کیمپسن اور ڈپٹی نذیر احمد کے نام اہم اور قابل ذکر ہیں۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، سجاد حیدر یلدرم اور پریم چند نے دیباچوں کے علاوہ تنقیدی مضامین بھی لکھے۔ پریم چند سے پہلے مرزا محمد ہادی رسوا نے باضابطہ کوئی مضمون تو نہیں لکھا لیکن ناول کی تنقید میں ان کے خیالات اپنے متقدمین اور معاصرین سے زیادہ اہم اور قابل قدر ہیں۔ اس ضمن میں ان کے ناول ''افشائے راز''، ذات شریف'' اور ان کے تنقیدی مراسلے کے صفحات یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔

محمد حسن عسکری کے بقول ناول کی تنقید کا آغاز سید سجاد حیدر یلدرم کے مضمون ''اردو ناول'' سے ہوتا ہے وہ اس سلسلے میں تحریر کرتے ہیں:

> ''داستان کے بعد قصہ کی نئی قسم کے لیے اردو میں ''ناول'' کی اصطلاح سب سے پہلے شاد عظیم آبادی نے استعمال کی انھیں معنوں میں جن معنوں میں یہ انگریزی میں مستعمل تھی۔ ناول نگاری کی ابتدا تو نذیر احمد کے ناول مرأۃ العروس یا پھر مولوی کریم الدین کے خط تقدیر سے مانی جاتی ہے لیکن ناول کی تنقید کا آغاز سید سجاد حیدر یلدرم کے مضمون ''اردو ناول'' سے ہوتا ہے جو معارف علی گڑھ میں ۱۸۹۸ء میں شائع ہوا۔'' (۱)

بقول ارتضی کریم سجاد حیدر یلدرم کا مضمون ''اردو ناول'' کو ''اردو ناول پر لکھا جانے والا سب سے پہلا اور طویل تنقیدی مضمون کہا جاسکتا ہے جس میں اردو ناول کی مقبولیت کے اسباب، اس کا تجزیہ ناول کی فنی خصوصیات، اس کے موضوعات وغیرہ پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔'' (۲)

ابتدا سے مرزا محمد ہادی رسوا تک ناول کا ارتقا بتدریج ہوتا رہا اور اس امید کو تقویت ملتی رہی کہ یہ صنف

ہمارے ادب میں پوری طرح جذب ہو جائے گی اور عنقریب کوئی لافانی شاہکار ظہور میں آئے گا۔لیکن رسوا کے بعد صورت حال یکسر بدل گئی اگرچہ ناول کے نام کا شہرہ تو خوب ہوا اور اس میں عوام کی دلچسپی بھی بڑھی مگر ناول کے نام سے وہ چیزیں شائع ہوئیں جن کا تعلق ناول سے برائے نام یا محض سطحی قسم کا تھا۔اور یوں ناول سے متعلق نہ صرف خوش آئند امیدوں کا خاتمہ ہوا بلکہ اردو ناول بھی اپنے ارتقا کی ایک منزل طے کرنے سے پہلے ہی دم توڑ گئی۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہو کہ رسوا کے بعد ہمارے مصنفین ناول اور اس کے متعلقات سے رسوا، جتنی واقفیت حاصل نہ کر سکے یا شاید کسی نے پست اور اعلیٰ ناولوں میں تمیز کی ضرورت ہی محسوس نہ کی اور اگر کسی کو خیال آیا بھی تو یہ کہ ناول میں انشا کے پھول کھلائے جائیں تو ناول اعلیٰ درجہ کا ہو جائے گا۔ چنانچہ اس عرصے میں جو ناول لکھے گئے وہ فنی اعتبار سے انتہائی ناقص تھے۔رسوا کے بعد جس نے ناول کے سلسلے میں اپنے خیالات ونظریات کا بھرپور اظہار کیا، وہ پریم چند ہیں۔ پریم چند نے ناول کے بارے میں تنقیدی نوعیت کے کئی مضامین لکھے جن میں ا۔اردو زبان اور ناول (۱۹۱۰ء) ۲۔شرر اور سرشار (۱۹۲۰ء) ۳۔ناول کا فن (۱۹۳۱ء) ۴۔ناول کا موضوع (۱۹۳۱ء) قابل ذکر ہیں۔ پریم چند اپنے پہلے مضمون ''اردو زبان اور ناول'' میں لکھتے ہیں:

> ''اردو دنیا کے لیے ناول ایک اچھوتی چیز تھی۔زبان میں ایک ایسی چیز کا رواج ہو رہا تھا جو معمولی افسانوں سے زیادہ دلآویز اور معمولی مثنویوں سے زیادہ پر لطف تھی۔ اس لئے پبلک نے حسب حیثیت ناولوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور برائے چند ناولوں کی خوب گرم بازاری رہی۔''(۳)

لیکن اچھے مصنفوں کے علاوہ پریم چند کے مطابق اور کتنے ہی درجہ دوم وسوم کے ناول نویس بھی میدان میں آئے اور وہ اپنی یادگاریں چھوڑ گئے یہاں تک کہ رینالڈس کا کوئی ناول ترجمہ ہونے سے نہ بچا۔ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

> ''ملک کا افلاس اور ناولوں کی کثرت ایسے عام وجوہ ہیں جو ہندوستان کی ہر ایک زبان پر یکساں جاری ہیں۔''(۴)

لیکن بالخصوص اردو زبان میں بقول پریم چند'' آخر ناولوں کی ایسی افراط ہوگئی کہ پڑھنے والے تنگ

آ گئے۔ من وسلویٰ بھی اگر افراط سے ملے تو اس سے طبیعت سیر ہو جاتی ہے، یہ خاصہ انسانی ہے۔ سنجیدہ مذاق کے لوگوں میں رفتہ رفتہ ناول خوانی کا شوق کم ہونے لگا۔'' اور دیکھتے دیکھتے ناولوں کا بازار سرد ہو گیا۔ ظاہر ہے ناول کے نام پر جنسی، جذباتی اور سنسنی خیز قصوں کی وجہ سے ادبی ناولوں کے فروغ کو جو نقصان پہنچا وہ ادیبوں اور ناقدوں کے لیے کسی سانحۂ عظیم سے کم نہ تھا۔ چنانچہ انتہائی کم عرصہ گزرنے کے باوجود پریم چند ناول کے تعلق سے یوں گفتگو کرتے ہیں جیسے بیتے دنوں کی باتیں ہوں:

> ''ابھی بہت زمانہ نہیں گزرا کہ اردو میں ناول نویسی اور ناول خوانی کی دھوم تھی۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولوی عبدالحلیم شرر، منشی عاشق حسین اور حکیم محمد علی یہ اسمائے گرامی انھیں دنوں کی یادگار ہیں۔۔۔ ان کی کتابوں کو پڑھنے والے ان کی قدر کرنے والے کم نہ تھے، یہ لوگ صنف ادب میں پیش رووٗں کا کام کر گئے۔'' (۵)

لیکن ایسے وقت میں جب اردو ناول اپنی ارتقائی منزل بڑی خوش اسلوبی سے طے کر رہی تھی اور اس کے قدردانوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا، اس کے زوال اور اس کی بے قدری کے اسباب کیا بنے؟ پریم چند نے اپنے جائزے میں اس کے تین اہم اسباب کی نشاندہی کی ہے۔ ایک تو یہ کہ قارئین کا میلان انگریزی ناولوں کے ترجموں کی طرف بڑھ گیا تھا۔ دوسرا یہ کہ لوگ ناول پڑھنے کو لغو اور وقت کا ضیاع سمجھتے تھے اور تیسرا یہ کہ بعض اہم ناول نگاروں کی تخلیقات میں تعصب راہ پا گیا تھا۔

پریم چند نے اپنے اس پہلے مضمون میں ناول کے زوال کا ایک سبب یہ بتایا ہے کہ عوام کی ایک بڑی تعداد ناول کو مخرب اخلاق سمجھتی تھی اور اس کے مطالعہ کو لغو محض اور تضیع اوقات سے تعبیر کر کے اس کی مخالفت کر رہی تھی۔ ان لوگوں کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ ناول پڑھنے سے مذاق سلیم بگڑ جاتا ہے اور طبیعت میں کسی ادق مسئلہ پر غور کرنے کی قابلیت باقی نہیں رہتی۔ پریم چند ایسے لوگوں کو کسی جنس یا صنف کو معتوب کرنے کے بجائے اپنے اندر نظر تمیز پیدا کرنے کا مشورہ دیتے ہیں اور کہتے ہیں ناول ہی پر کیا موقوف دوسری اصناف اور فنون بھی ادنی و اعلیٰ مذاق کی حامل ہوتی ہیں، لہٰذا ادنیٰ قسم کی شاعری اور ادنیٰ مذاق کا فلسفہ یا تعصب سے بھری ہوئی تاریخ سب ہی اپنے

اپنے دائرہ میں نقصان دہ ہوجاتی ہیں مگر اس بنیاد پر شاعری، فلسفہ یا تاریخ کو عضو بیکار نہیں قرار دیا جانا چاہیے۔ وہ اس صنف کی اہمیت کے ثبوت اور اس کے جواز میں لکھتے ہیں:

''اعلیٰ مذاق کا ناول انسان کی عادت پر اس سے بدرجہا زیادہ اخلاقی اثر پیدا کرتا ہے جتنا کہ کوئی فلسفیانہ، مورخانہ یا شاعرانہ تصنیف کرسکتی ہے۔ دنیا کی تاریخ تمدن میں بعض اوقات ناول نے ایسے ایسے معرکے کے مسئلے طے کردیے ہیں جن پر ملکی مدبر، فلاسفر اور مورخ مدتوں تک سرکھپایا کئے۔''(۶)

پریم چند ناول کے معترضین پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک ہی لاٹھی سے تمام ناولوں کو ہانکنے والے غالباً یہ فراموش کر جاتے ہیں کہ تاریخ یا پالیٹکس یا فلسفہ کا مطالعہ ہر خاص و عام کے لیے ممکن نہیں کہ دنیا کی بیشتر آبادی جو کسب معاش کی فکروں میں پریشان رہتی ہے، ان کے لیے ایسے علوم کا مطالعہ بجائے دلچسپی کے ایک مشکل ترین عمل ثابت ہوگا، لہٰذا یہ غریب یا تو ناول پڑھ سکتے ہیں یا کچھ نہیں پڑھ سکتے۔ چنانچہ وہ یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس فن کے توسط سے دوسرے اہم اور مفید علوم کی تحصیل زیادہ بہتر اور آسان طریقے سے کی جاسکتی ہے جس سے ہر کوئی یکساں طور پر فیضیاب ہوسکتا ہے:

''یہی سبب ہے کہ آج یورپین زبانوں میں سائنس، فلسفہ اور تاریخ کے اکثر موضوع پر ناول لکھے جاتے ہیں تاکہ انسانی آبادی کا یہ مصروف حصہ ان مسائل سے بالکل غیر مانوس نہ ہو پائے اور علم کے خشک مسئلے اول درجے کی دماغی کاوش اس کے ذہن نشیں ہوجائیں۔''(۷)

بلاشبہ پریم چند یورپی ممالک میں رائج اس طریقے کے حامی تھے اور زندگی اور معاشرے کی اصلاح کو ناول کے فرائض میں بھی شامل کرتے تھے۔ لیکن وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ انسانی فطرت پر اثر انداز ہونے والی یہ تحریر کب تک فن رہتی ہے اور کب اس کے دائرے سے باہر نکل جاتی ہے۔ لہذا وہ ناول نگاروں کو ہدایت دیتے ہیں کہ:

''انھیں استادان فن کی تصانیف کا غور سے مطالعہ کرنا چاہیے ان کا فرض ہے کہ طبائع انسانی کا نظر غائر سے مشاہدہ کریں اور سچے جذبات کے نمونے پیش

کریں ۔۔۔ بندشوں میں جذبہ، خیالات میں تازگی، جذبات میں عمق، یہ

اچھے ناول کے لوازم ہیں ۔‘‘(۸)

پریم چند کے آخری تین مضامین سے ناول کی تعریف و تقسیم اور اس کے منصب و مقصود کی تعین ہوتی ہے۔ وہ اپنے مضمون ’’ناول کا فن‘‘ میں لکھتے ہیں کہ ناول کی تعریف انتہائی مشکل ہے آج تک اس کی کوئی ایسی تعریف نہیں ہوسکی جس پر سب لوگ متفق ہوں لیکن اپنے ایک دوسرے مضمون ’’شرر و سرشار‘‘ میں وہ اس کی مفصل تعریف یوں کرتے ہیں:

’’ناول انگریزی لفظ ہے اور اگر اس کا ترجمہ ہوسکتا ہے تو وہ فسانہ ہے۔ لفظی حیثیت سے دونوں میں کچھ فرق نہیں مگر مفہوم کے لحاظ سے البتہ نمایاں فرق ہے۔ ناول اس فسانہ کو کہتے ہیں جو زمانہ کا جس کا وہ تذکرہ کر رہا ہو، صاف صاف چربہ اتار لے اور اس کے رسم و رواج، مراسم و آداب، طرز معاشرت وغیرہ پر روشنی ڈالے اور مافوق العادت کو دخل نہ دے۔ یا اگر دے تو ان کی تاویل بھی اس خوبی سے کرے کہ عوام ان کو واقعہ سمجھنے لگے۔ اسی کا نام ہے ناول یا فسانہ۔‘‘(۹)

دراصل یہ مضمون حکیم برہم گورکھپوری کے مقالے کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ حکیم برہم نے اپنے مضمون میں سرشار کے مقابلے میں شرر کو کامیاب اور بڑا ناول نگار ثابت کرنے کی کوشش کی تھی اور ’’فسانہ آزاد‘‘ کے بارے میں لکھا تھا کہ:

’’اس میں کوئی پلاٹ ہے نہ کوئی نتیجہ ہے، نہ کوئی مبحث ہے لہذا یہ ناول کے لقب سے یاد کیے جانے کے قابل نہیں ہے۔ اور اگر فضول و بے نتیجہ پریشان خیالی کا نام ہی ’’ناول‘‘ ہے تو پھر ایجاد و اختراع کا نام لینا بھی بے محل ہے۔‘‘(۱۰)

پریم چند کے مذکورہ اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ ناول کی تعریف کرتے وقت ان کے پیش نظر حکیم برہم کا

جواب اور ''فسانہ آزاد'' کا دفاع ہے۔ چنانچہ یہ تعریف اس سے مختلف نہیں جو خود سرشار نے اپنے مضمون ''ناول نگاری'' مشمولہ دبدبۂ آصفی حیدر آباد جمادی الثانی ۱۳۱۵ھ میں کی تھی اور چکبست نے اپنے مضمون ''پنڈت رتن ناتھ سرشار'' (اشاعت ۱۹۰۴ء) میں کی تھی۔ بلاشبہ تب ناول کی یہی تعریف تھی کہ وہ مافوق العادت واقعات سے عاری ہو اور اپنے زمانے اور معاشرے کی عکاسی کرتا ہو لیکن جب ۱۹۲۰ء میں پریم چند ناول کی بعینہ یہی تعریف کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے۔ وہ آگے لکھتے ہیں:

> ''یہ طرز جدید فسانہ عجائب یا گل بکاولی یا قصہ ممتاز یا طلسم ہوشربا یا بوستان خیال سب پرانے ڈھنگ کے قصے ہیں جن میں جدید فسانہ کی خوبیوں کا شائبہ تک نہیں۔ ہاں میر امن دہلوی کی مقبول عام کتاب ''باغ و بہار'' یا داستان الف لیلہ ایک حد غیر محسوس تک مرقومہ بالا خوبیاں رکھتی ہیں یعنی اپنے زمانہ کی تہذیب پر ایک دھندلی روشنی ڈالتی ہیں۔'' (۱۱)

باغ و بہار اور الف لیلہ کو اپنے زمانے کے تہذیب کی دھندلی عکاسی کی بنا پر سراہنے کے باوجود وہ شرر کے ناولوں کو محض اس بنا پر رد کرتے یا کمتر بتاتے ہیں کہ ان کے جو ناول مشہور ہیں ان میں سے کوئی تو صلیبی لڑائیوں کے زمانے کا ہے، کوئی محمود غزنوی کے حملے کے زمانے کا، کوئی روم وروس کی لڑائی کے وقت کا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''وہ سبھی ناظر کو دس پانچ صدیاں پیچھے لے جاتے ہیں اور چونکہ حضرت شرران باتوں کا ذاتی تجربہ نہیں ہے اس لیے وہ اس وقت کے واقعات کی ایسی تصویر ہرگز نہیں کھینچ سکتے جو اصل سے مطابقت رکھے۔۔۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ خیال کبھی مشاہدے کا ہم وزن نہیں ہوسکتا'' (۱۲)

جب کہ وہ اپنے ایک اور مضمون ''ناول کا موضوع''، میں قوت تخیل کو دوسری صلاحیتوں سے برتر اور ناول نگار کے لیے لازمی قرار دیتے ہیں:

> ''اس میں (ناول نگار میں) اور چاہے جتنی کمیاں ہوں لیکن تخیل کی قوت ناگزیر ہے۔ اگر اس میں یہ قوت موجود ہے تو وہ ایسے کتنے ہی مناظر و واقعات اور

کیفیات کی تصویر کشی کر سکتا ہے جس کا اسے ذاتی تجربہ حاصل نہیں ہوا'' (۱۳)

پریم چند کی اس تضاد بیانی یا ان کے زمانے کے لحاظ سے ان کے خیالات کی قدامت کو کم علمی یا فن سے ان کی ناواقفیت پر ہرگز محمول نہیں کیا جانا چاہیے کہ ان کا مضمون ''شررو سرشار'' جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ایک اختلافی مضمون کا جواب ہے، جس میں ان کا بنیادی مقصد سرشار کو شرر سے بڑا ناول نگار اور فسانہ آزاد کو اہم ناول ثابت کرنا تھا۔ اس نوع کی تحریر میں علمیت کی جگہ عصبیت اور متانت کی جگہ مخاصمت غیر شعوری طور پر درآتی ہے اور اہم مسئلہ کی توضیح و تشریح کے بجائے مصنف کا رجحان از خود اپنے مدعا کے اثبات کی طرف ہو جاتا ہے جس میں جذبات کو کافی حد تک دخل ہوتا ہے۔ اس لیے اس نوع کی گفتگو کو سنجیدہ بیانات کے مقابلے میں دلیل بنانا از روئے انصاف درست نہیں لہٰذا ہمیں پریم چند کی دوسری تحریروں کا جائزہ لینا چاہیے۔ ''شررو سرشار'' کے گیارہ سال بعد ۱۹۳۱ء میں ان کے دو اور مضامین ''ناول کا فن'' اور ''ناول کا موضوع'' شائع ہوئے۔ اول الذکر مضمون میں ناول سے متعلق وہ اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''میں ناول کو انسانی کردار کی مصوری سمجھتا ہوں۔ انسان کے کردار پر روشنی ڈالنا اور اس کے اسرار کو کھولنا ہی ناول کا بنیادی مقصد ہے۔۔۔ آدمیوں کے کردار میں بھی بہت کچھ مشابہت کے باوجود کچھ فرق ضرور ہوتا ہے۔ کرداروں کے بارے میں یہی مشابہت اور اختلاف، یکسانیت میں تضاد اور تضاد میں یکسانیت دکھانا ناول کا بنیادی فریضہ ہے۔'' (۱۴)

پلاٹ کے سلسلے میں اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''ناول نگار کو حق ہے کہ وہ اپنے قصہ کو واقعات سے دلچسپ بنائے لیکن شرط یہ ہے کہ ہر واقعہ قصے کے اصل خاکے سے قریبی تعلق رکھتا ہو بلکہ اتنا ہی نہیں اس میں اس طرح گھل مل گیا ہو کہ قصہ کا ضروری حصہ معلوم ہو۔۔۔ ناول میں وہی واقعات وہی خیالات لانا چاہیے جن سے قصہ کی روانی بڑھ جائے جو پلاٹ کے ارتقا میں معاون ہوں یا کرداروں کی داخلی کیفیت اور کش مکش کو سامنے

لاتے ہیں۔'' (۱۵)

کردارنگاری کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ کرداروں کا مطالعہ جتنا واضح اور وسیع ہوگا اتنی ہی کامیابی سے کرداروں کی مصوری ہو سکے گی۔ کمال یہ نہیں ہے کہ کرداروں میں محض انسانی خصوصیات پیدا کر دیئے جائیں بلکہ سچی صناعی تو یہ ہے کہ کریکٹروں میں جان ڈال دی جائے۔ کرداروں کے ارتقا کو وہ ناول کا لازمی جز قرار دیتے ہیں اور جس کردار میں ارتقا نہ ہوا سے ناول سے نکال دینے کا مشورہ دیتے ہیں۔ یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''ناول کے کردار بھی ناول نگار کے تخیل میں مکمل صورت میں نہیں آجاتے بلکہ ان میں بتدریج ارتقا ہوتا جاتا ہے۔ یہ ارتقا اتنے غیر محسوس اور پوشیدہ طور پر ہوتا ہے کہ پڑھنے والے کو کسی تبدیلی کا علم بھی نہیں ہوتا۔ اگر کرداروں میں کسی کا ارتقا رک جائے تو اسے ناول سے نکال دینا چاہیے کیوں کہ ناول اشخاص کے ارتقا کا ہی نام ہے۔ اگر اس میں ارتقا کمزور ہے تو وہ ناول کمزور ہو جائے گا۔'' (۱۶)

مذکورہ اقتباس پریم چند کے ہندی سے ترجمہ کیے ہوئے مضمون ''ناول کا موضوع'' سے ماخوذ ہے جو ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عبدالقادر سروری نے اپنی کتاب ''دنیائے افسانہ'' میں کردار سے متعلق بعینہ یہی باتیں لکھی تھیں۔ ان کی تحریر ملاحظہ کریں:

''اسی طرح اشخاص قصہ بھی سارے صفات سے متصف ناول نگار کے ذہن میں نہیں آجاتے بلکہ ان کی خصوصیات بتدریج ظاہر ہوتی ہے۔ ان میں ارتقا ہوتا ہے...... یہ ارتقا اس قدر چپ چاپ اور فطری ہوتا ہے کہ پڑھنے والے کو کسی تبدیلی کا احساس تک نہیں ہوتا۔ اگر اشخاص قصہ میں سے کسی کا ارتقا رک جائے تو جس قدر جلد ممکن ہو اس کو قصے سے خارج کر دینا چاہیے......ایسا شخص قصہ حقیقت میں ناول کے حسین چہرہ کے لئے ایک بدنما دھبہ ہے جس کو اعلیٰ سے اعلیٰ محاسن قصہ بھی نہیں دھو سکتے۔'' (۱۷)

پریم چند کا یہ خیال بھی ''دنیائے افسانہ'' میں موجود ہے: ''کرداروں کا ارتقا حالات سے مطابقت رکھتا

ہو یعنی لکھنے اور پڑھنے والا دونوں اس سے متفق ہو۔'' اسی طرح اپنے مضمون ''شرر و سرشار'' (۱۹۲۰ء) میں کردار نگاری کی وہی خوبیاں اور خامیاں بیان کرتے ہیں جو چکبست نے اپنے مضمون ''سرشار'' (۱۹۰۴ء) میں بیان کی تھیں۔ گویا ناول اور اس کے عناصر سے متعلق خیالات میں کسی طرح کی تبدیلی یا ترقی نہ تو زمانی عرصے کا فرق پیدا کرسکی، نہ ہی ناقد، شاعر یا ناول نگار کی تنقیدیں اس میں کوئی نیا پہلو دریافت کرسکیں۔

کرداروں کی گفتگو کے سلسلے میں وہ بڑی اچھی بات لکھتے ہیں کہ ''ناول میں مکالمے جتنے زیادہ ہوں اتنا ہی وہ خوبصورت ہوگا'' یعنی ناول نگار کو کہانی کے ارتقا بیانیہ کے بجائے مکالموں سے زیادہ کام لینا چاہیے اور ان مکالموں میں مصنف کے خیالات کا دخل ممکنہ حد تک کم ہونا چاہیے۔ ان کا خیال یہ بھی ہے کہ مکالمے نہ صرف کرداروں کی نفسیات اور ان کے حالات سے مطابقت رکھتے ہوں بلکہ وہ آسان اور سلجھے ہوئے ہوں۔

وہ ناول کو اس کے مصنف کی نفسیات، اس کے کردار، اس کے فلسفہ حیات اور نتائج فکر کا آئینہ قرار دیتے ہیں اور یہ کہ اس میں مصنف کی شخصیت کا مکمل اظہار ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ مصنف اگر رجائی ہے تو اس کی تخلیقات میں بھی امیدوں کی روشنی اور حوصلوں کی تازگی نظر آتی ہے، اور اگر وہ قنوطی ہے تو ہزار کوششوں کے باوجود بھی اپنے کرداروں کو زندہ دل بنانے میں ناکام رہتا ہے۔ پریم چند کا خیال ہے کہ ''ناول کا طرز بیان دلکش اور موثر ہونا چاہیے''۔ وہ اس بات کو ناپسند کرتے ہیں کہ ''ناول میں الفاظ کا گورکھ دھندا رچا کر قارئین کو اس مغالطے میں ڈالنے کی کوشش کی جائے کہ اس میں کوئی حسن، خوبی یا کوئی اعلیٰ مقصد پوشیدہ ہے''۔ ان کے مطابق ایسے ادیبوں کو بھلے کچھ دیر کے لیے مقبولیت مل جائے لیکن ''عوام ان ہی ناولوں کو پسند کرتے اور قابل احترام کہتے ہیں جن کی خصوصیت پیچیدگی اور دقت پسندی نہیں بلکہ عام فہم ہونا ہے۔'' پریم چند ناول نگاری کے لیے تعلیم اور مشق کے بجائے قدرت کی جانب سے عطا کی ہوئی صلاحیت اور فطری میلان کو ضروری بتاتے ہیں اور ناول نگار کے لیے سب سے اہم چیز اس کی تخلیقی صلاحیت کو قرار دیتے ہیں جس سے ان کی مراد قوت تخیل ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''اس میں (ناول نگار میں) اور چاہے جتنی کمیاں ہوں لیکن تخیل کی قوت ناگزیر ہے۔ اگر اس میں یہ قوت موجود ہے تو وہ کتنے ہی مناظر، واقعات اور کیفیات کی تصویر کشی کرسکتا ہے۔'' (۱۸)

ساتھ ہی انھوں نے یہ پیشین گوئی بھی کی تھی کہ مستقبل کے ناول میں تخیل کی اڑان کم اور حقیقت کا عنصر زیادہ ہوگا۔ ہمارے کردار خیالی نہیں ہوں گے ان کا تعلق افراد کی ارضی زندگی سے ہوگا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

''مستقبل کا ناول انسانی زندگی کی ہو بہو تصویر پر ہوگا۔ خواہ اس زندگی کا تعلق اعلیٰ اشخاص سے ہو یا ادنیٰ انسانوں سے۔ دراصل کردار کی عظمت یا برتری و کمتری کا فیصلہ ان مشکلات سے کیا جائے گا جن پر اس نے فتح پائی ہے۔ ہاں اسے اس ڈھنگ سے پیش کیا جائے گا کہ ناول معلوم ہو۔'' (۱۹)

آج اس بات سے انکار یا اس پر مزید گفتگو کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ ناول سے متعلق پریم چند کی پیشین گوئی نہ صرف حرف بہ حرف صحیح ثابت ہو چکی ہے بلکہ اس میں بیان کی گئی باتوں کو اعلیٰ ناول کی صفات تسلیم کیا جا رہا ہے۔ پریم چند کے نزدیک اعلیٰ یا کامیاب ناول وہ ہے جس کے مطالعہ کے بعد قاری کو اپنے اندر ایک تکمیل یا آسودگی کا احساس ہو اور اس کے پاکیزہ جذبات بیدار ہو جائیں۔ وہ اپنے تنقیدی مضمون ''ناول کا فن'' میں آدرش واد (مثالیت پسندی) اور حقیقت پسند ناول کی بحث چھیڑتے ہیں اور دونوں کے منصب و منہاج سے متعلق تقابلی گفتگو کرتے ہیں۔ حقیقت پسند مصنفین کے طریقہ کار کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''حقیقت پسند کردار کو قاری کے سامنے اس کے اصلی روپ میں عریاں کر دیتا ہے اسے اس سے کچھ سروکار نہیں کہ برے چلن کا انجام برا ہوتا ہے یا اچھے چلن کا اچھا۔ اس کے کردار اپنی کمزوریاں اور خوبیاں دکھاتے ہوئے اپنی زندگی کا کھیل ختم کر دیتے ہیں۔'' (۲۰)

پریم چند کی رائے میں انسان جس مکر وفریب کی دنیا میں زندگی بسر کرتا ہے اس کی دوبارہ تخلیق اسے محفوظ نہیں کرتی لہٰذا وہ ایسی دنیا کا متلاشی ہوتا ہے جہاں اس کے دل کو ایسے پست اور ادنیٰ جذبات سے نجات مل جائے۔ یہ عارضی دنیا اسے مثالیت پسند ادب فراہم کرتا ہے:

''اندھیری گرم کوٹھری میں جب ہم کام کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو خواہش ہوتی ہے کہ کسی باغ میں نکل کر تازہ ہوا کا لطف اٹھائیں۔ آدرش واد

> اسی کمی کی تلافی کرتا ہے۔ وہ ہمیں ایسے کرداروں سے متعارف کراتا ہے جن کے دل پاک وصاف ہوتے ہیں جن میں خودغرضی اور بوالہوسی کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اگرچہ ایسے کردار عملی زندگی میں کامیاب نہیں ہوتے لیکن اکتائے ہوئے انسانوں کو ایسے شریف النفس کرداروں کے درشن سے ایک خاص مسرت حاصل ہوتی ہے۔'' (۲۱)

گویا حقیقت پسند ادب اگر انسان، اس کی زندگی اور اس کے مسائل کو اصلی رنگ و روپ میں پیش کر کے قاری کو ان کی تلخی اور ہولنا کی سے دوچار کراتا ہے تو آدرش وادی ادب اسے فرحت بخش مقام پر پہنچا کر اس کے تھکے ہوئے ذہن و جسم کو سکون بخشتا ہے لیکن پریم چند آدرش واد کے اس خطرے سے بھی آگاہ کرتے ہیں:

> ''کہیں ہم ایسے کرداروں کی تخلیق نہ کر بیٹھے جو محض عقائد کی بے جان مورتی ہوں کہ کسی دیوتا کا تصور اور اس کی آرزو مشکل نہیں لیکن اس دیوتا میں انسانی روح کا پھونکنا مشکل کام ہے۔'' (۲۲)

چنانچہ وہ دونوں دبستانوں کے تقابلی جائزے کے بعد یہ فیصلہ سناتے ہیں کہ وہی ناول اعلیٰ درجے کے سمجھے جاتے ہیں جن میں حقیقت اور آدرش آمیز ہو گئے ہوں۔ اسے آپ آدرش وادی حقیقت پسندی کہہ سکتے ہیں۔ تاہم حقیقت پسندی کے مقابلے ان کا جھکاؤ آدرش واد کی طرف زیادہ ہے۔

پریم چند کے نزدیک بشمول ناول، ادب کا مقصودِ منتہی انسان اور اس کے حوالے سے معاشرے کی اصلاح ہے۔ انھیں اپنے قدیم ادب پر بھی آدرش کی چھاپ نظر آتی ہے اور وہ اسے محض دلبستگی کا ذریعہ ماننے کے بجائے اس کا بنیادی مقصد تفریح کے ساتھ ساتھ روح و قلب کی صفائی اور شائستگی قرار دیتے ہیں۔ تخلیق کار کا معیار و مقام متعین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ادیب کا کام صرف قارئین کا دل بہلانا نہیں ہے۔ یہ تو نقالوں، مداریوں اور مسخروں کا کام ہے۔ ادیب کا منصب اس سے کہیں بلند ہے وہ ہمارے راستے کا رہنما ہوتا ہے وہ ہماری انسانیت کو بیدار کرتا ہے۔ ہمارے اندر اعلیٰ

وارفع خیالات پیدا کرتا ہے۔ ہماری نظر کو وسعت بخشتا ہے۔کم از کم اس کا آدرش یہی ہونا چاہیے۔'' (۲۳)

اس مقصد کے حصول کے لیے وہ حرص وطمع پر غلبہ پانے والے ایسے مثبت کرداروں کی تخلیق کو ضروری قرار دیتے ہیں جن کے اندر رذلت، پست جذبات اور نفسانی خواہشوں کو شکست دینے کی قوت وصلاحیت موجود ہو۔ وہ ناول میں انسان کے تاریک پہلوؤں، نفسانی خواہشوں اور رسوائیوں کے تفصیلی بیان کو غیر مستحسن سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ادب کا معیار یہ ہے کہ اس کی تخلیق فن کی تکمیل کے لیے کی جانی چاہیے اور فن کا منصب یہ ہے کہ اس کا کوئی مقصد ہو، لہذا ان کے مطابق:

''وہی ادب قابل قدر ہوسکتا ہے جس کی بنیاد انسانی فطرت کے مظاہر پر رکھی جائے۔ محبت اور رقابت، غصہ اور حرص، عقیدت اور نفرت، تکلیف اور آسائش یہ سب ہماری مختلف ذہنی حالتیں ہیں۔ ان کی ہی جھلکیاں دکھانا ادب کا بنیادی مقصد ہے اور بغیر مقصد کے تو کوئی ادبی تخلیق ہو ہی نہیں سکتی۔'' (۲۴)

تاہم وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ:

''جب ادب کی تخلیق کسی سماجی، سیاسی یا مذہبی عقیدہ کی اشاعت کے لیے کی جاتی ہے تو وہ اپنے منصب سے گر جاتا ہے۔'' (۲۵)

لیکن ان کا آدرش وادی ذہن اس بات کو پوری طرح قبول نہیں کرتا چنانچہ وہ یہ تاویل پیش کرتے ہیں کہ آج تیز رفتاری سے حالات بدل رہے ہیں اور نئے نئے تصورات سامنے آرہے ہیں ایسے میں تخلیق کاروں کے لیے اس آدرش پر عمل کرنا انتہائی مشکل ہے۔ وہ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ:

''آج کل ہندوستان کے ہی نہیں یورپ کے بڑے بڑے ادیب اور عالم بھی اپنی تخلیقات کے ذریعہ کسی نہ کسی ''ازم'' کی اشاعت کر رہے ہیں۔ وہ اس کی پرواہ نہیں کرتے کہ اس سے ہماری تخلیق زندہ رہے یا نہیں۔ اپنے عقائد کا اظہار اور ان کا تحفظ ہی ان کا نصب العین ہے۔'' (۲۶)

چنانچہ وہ ناول میں نظریے، عقیدے اور تصورات کی اشاعت کی اس التزام و انتباہ کے ساتھ حمایت کرتے ہیں:

''ناول نگار کو اس بات کی کوشش ضرور کرنی چاہیے کہ اس کے خیالات غیر محسوس طور پر قارئین تک پہنچیں۔ ان کی وجہ سے ناول کی روانی اور دلچسپی میں کسی طرح کی رکاوٹ نہ ہو۔ ورنہ ناول بے کیف ہو جائے گا۔''(۲۷)

ناول کی تنقید کے حوالے سے پریم چند کے مضامین کے بعد ناول کی تنقید کے حوالے سے عبدالقادر سروری کی کتاب میں موجود نظریات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ فکشن کی تنقید پر پہلی مبسوط کتاب عبدالقادر سروری کی ''دنیائے افسانہ'' ۱۹۲۷ء میں شائع ہو چکی تھی جس کے چھوٹے چھوٹے بیس ابواب میں سے بیشتر میں ناول کی تاریخ و تنقید سے بحث کی گئی ہے۔ اور چار ابواب میں مختصر افسانے کی تاریخ، اس کے فن، اس کے مستقبل اور اردو افسانہ نگاروں کی تخلیقات کے تجزیوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ دراصل سروری نے ''افسانہ'' کو ''فسانہ'' کے معنی میں استعمال کیا ہے جس کا اطلاق بشمول افسانہ، داستان، حکایت، تمثیل اور مثنویاں سبھی پر ہوتا ہے۔ یوں اردو ناول کی تنقید میں ''دنیائے افسانہ'' اور عبدالقادر سروری کو علی عباس حسینی اور ان کی کتاب پر زمانی تقدم حاصل ہے۔ ''دنیائے افسانہ'' اور ''اردو ناول کی تاریخ و تنقید'' کے تقابلی مطالعہ کے بعد اگر معیارِ تنقید پر تبصرہ کا حق محفوظ رکھتے ہوئے کہا آخر الذکر کتاب اول الذکر کے اجمال کی تفصیل ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ ''اردو ناول کی تنقید و تاریخ'' میں جگہ جگہ ''دنیائے افسانہ'' کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ سروری اردو کے افسانوی ادب میں تنقید کے فقدان اور اس طرف سے ناقدوں کی بے توجہی کی شکایت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اردو زبان میں افسانوی ادب کا کافی ذخیرہ موجود ہے اور ہر قسم کے اچھے برے قصوں پر مشتمل افسانوں کی پیدائش کا سلسلہ برابر جاری ہے بلکہ اس کی رفتار مقابلتاً تیز ہوگئی ہے۔ ایسی صورت میں اس کی ضرورت ہے کہ افسانوں کے ساتھ ساتھ خود افسانوں کے فن کی طرف بھی توجہ کی جائے اور اردو زبان میں بھی وہی اصول اور قواعد مروج کیے جائیں جو مغربی زبانوں میں مروج

ہیں۔کسی زبان میں افسانے کے فن پر ادب کا پیدا ہونا اس بات کا کافی ثبوت ہوتا ہے کہ اس زبان کے افسانوں کو فن کا رتبہ حاصل ہو چکا ہے۔'' (۲۸)

یہ اس وقت کی تحریر ہے جب اردو ناول کی عمر نصف صدی سے تجاوز کر رہی تھی اور اس کا حلقہ مقبولیت وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا تھا چنانچہ زمانے کی ہوا اور بازار کی مانگ دیکھتے ہوئے ہر کس و ناکس قصے چھپوا کر ناول نگاروں کی صف میں شامل ہونے کا آرزومند تھا۔لیکن بیشتر تخلیق کار نہ تو ناول نویسی کے صحیح اصول وضوابط سے واقف تھے نہ قارئین کے پاس ناولوں کے انبار سے معیاری ناول چھانٹنے کی کوئی کسوٹی موجود تھی۔ نتیجے میں ہمارا ادب بے اعتباری کا شکار ہو رہا تھا۔ ایسے میں سروری کو اردو ناول کی تنقید کی ضرورت اور اہمیت کا شدت سے احساس ہوتا ہے:

''اردو زبان کی وسعت پذیری پر نظر کرتے ہوئے بھی ادب کے اس شعبے پر تصنیفات کا فقدان ایک بڑی کمی ہے جس کو پورا کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ افسانہ نگاری پر لٹریچر کے پیدا ہونے سے نہ صرف ناول نگاروں کی رفتار پر قیود عائد ہوتے ہیں بلکہ عوام کو بھی ایک معیار قصوں کے جانچنے کا مل جاتا ہے۔اس میں شبہ نہیں کہ باکمالوں کے لیے اس قسم کے اصول اور قواعد ایک ثانوی اہمیت رکھتے ہیں لیکن مبتدیوں کے لیے تو ان کی مثال اس سہارے کی سی ہے جس کے وسیلے سے ایک بچہ پاؤں چلنا سیکھتا ہے۔'' (۲۹)

سروری اپنی کتاب ''دنیائے افسانہ'' میں ناول کی تاریخ و تعریف بیان کی ہے اور مختلف دلائل سے ثابت کیا ہے کہ یہ فن بھی فنون لطیفہ میں شامل ہے۔شاعری اور ڈرامے سے اس کا تقابل و توازن کرنے کے بعد متعدد حوالوں کے ذریعہ اسے شاعری اور ڈرامے سے افضل قرار دیا ہے۔ناول کے عناصر ترکیبی سے بحث کی ہے۔اعلیٰ ناول کی خصوصیات گنوائی ہیں۔ناول نگار کے فرائض بتائے ہیں، ناول کی قسمیں متعین کی ہیں اور ناول کے منازل و مراحل سے گفتگو کی ہے۔سروری نے ناول کی مندرجہ ذیل پانچ عناصر بتائے ہیں۔ اشخاص قصہ (یعنی کردار)، پلاٹ، مکالمہ، مقصد ناول یا فلسفہ حیات، زمان و مکان۔

کردار کے سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ جس طرح افراد انسانی ایک دوسرے سے بلحاظ صورت وسیرت مختلف نظر آتے ہیں اسی طرح اشخاص قصہ بھی ایک دوسرے سے ممیّز ہونے چاہیےاور ناول میں ان کی صفات بیک وقت نہیں بلکہ بتدریج ظاہر ہونی چاہئیں۔ ارتقا کو کردار کا لازمی عنصر بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''یہ ارتقا اس قدر چپ چاپ اور فطری ہونا چاہیے کہ پڑھنے والے کو کسی تبدیلی کا احساس تک نہ ہو''۔ وہ ناول نگاروں کو مشورہ دیتے ہیں کہ اگر کسی کردار کا ارتقا رک جائے تو جس قدر جلد ممکن ہو اسے قصے سے خارج کر دینا چاہیے ورنہ یہ سمجھا جائے گا کہ مصنف اپنی تخلیقات ذہنی کے کرداری نکات کو سمجھنے سے قاصر ہے گویا مصنف کو ایسا کردار تخلیق کرنا چاہیے جس کے وہ نہ صرف ظاہری حرکات وسکنات سے باخبر ہو بلکہ اسے اس کے باطن سے بھی آگاہ ہونا چاہیے۔ ایسے کردار سے متعلق جس کا ارتقا کچھ تو ہو اور پھر رک جائے اسے وہ ناول کے حسین چہرے پر ایک بدنما داغ سے تعبیر کرتے ہیں جسے چھپانے میں قصہ کے اعلیٰ محاسن بھی ناکام رہتے ہیں۔

پلاٹ کی روایتی تعریف اور اس کی تقسیم انھوں نے انگریز مصنفوں کے حوالے سے کی ہے لیکن اس سلسلے میں ایک اہم بات انھوں نے یہ لکھی ہے کہ ناول کے پلاٹ میں تھوڑی سی پیچیدگی کا ہونا مستحسن ہے کہ یہ قاری کے دماغ کے لئے محرک کا کام دیتی ہے اور اسے اکساتی ہے کہ جو راز ہائے سربستہ ان کی نظروں کے سامنے سے گزر رہے ہیں وہ ان کے افشا کی کوشش کرے۔ اسے وہ قاری کی توجہ مبذول کرنے کا بہترین ذریعہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''ایک عمیق سمندر سے موتی نکالنے والے یا ایک امنڈتی ہوئی موج کو چیر پھاڑ کر نکل آنے والے کو جس قدر مسرت ہوتی ہے ناول کی پیچیدہ گھاٹیوں کو طے کر کے باہر آنے والا بھی اس سے کچھ کم مسرور نہیں آتا۔'' مکالمے کی خوبی وہ یہ بتاتے ہیں کہ اسے فصیح دلچسپ فطری اور متکلم کے حسب حیثیت ہونا چاہیے۔ مقصد ناول یا فلسفہ حیات کے ضمن میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> ''اس میں شک نہیں کہ ناول کا ہمیشہ انھیں محرکات کے ماتحت عمل کرنا ضروری نہیں تاہم ناولوں کی عام روش سے اس بات کا صاف طور پر پتہ چل سکتا ہے کہ حیات انسانی کے متعلق ناول نگار کچھ نہ کچھ خیالات رکھتا ہے جن کا وہ اظہار کرنا چاہتا ہے۔''(۳۰)

سروری ناول کے منازل کے عنوان سے ایک الگ باب قائم کرتے ہیں جس کی بحث دراصل پلاٹ کے ضمن میں ہونی چاہیے۔ان کا خیال ہے کہ ناول ایک طرح سے حیات کا خاکہ ہوتا ہے اور جس طرح حیات انسانی کے تین مراحل ہیں ایک ناول کو بھی کم از کم تین مدارج ابتدا، واقعات اور خاتمے سے گزرنے کی سخت ضرورت ہے لیکن ان کے مطابق:

''عام طور سے بہترین ناول وہ تصور کیا جاتا ہے جو ذیل کی بلندیوں اور پستیوں سے گزرے: ۱۔تمہید۲۔واقعات ۳۔جوش یا تحریک ۴۔تعویق ۵۔عروج ۶۔انکشاف ۷۔خاتمہ۔''(۳۱)

بیان واقعہ کے متعلق انھوں نے اہم بات یہ لکھی ہے کہ بے جا معلومات کو ٹھونس دینے سے ناول کا حسن جاتا رہتا ہے۔ناول میں خود مصنف کو نہیں واقعات کو گویا ہونا چاہیے۔اعلیٰ ناول کی جن خصوصیات پر سروری نے تفصیلی گفتگو کی ہے ان میں ناول کے موضوع کی عظمت، صداقت پر مبنی قصہ، ڈرامائی پیش کش، الفاظ اور معانی میں لچک اور سادہ اور عام فہم واقعات کو شامل کیا ہے۔ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

''عمدہ ناول قاری کے دل میں ایک ایسا احساس پیدا کر دیتے ہیں جو دنیا کی تہذیب کے بنانے کا رفیع الشان ذریعہ بن جاتا ہے، اس احساس کو عموماً لفظ ''ہمدردی'' سے موسوم کیا جاتا ہے......قدیم افسانوں میں اس احساس کی کمی کو ہم شدت سے محسوس کرتے ہیں۔''(۳۲)

ناول کی ایک خصوصیت انھوں نے صداقت پر مبنی واقعات بتائی ہے لیکن صداقت سے ان کی مراد واقعات کا من وعن بیان نہیں بلکہ ان کے بقول: ''اس سے وہ صداقت مراد ہے جس کو ارسطو ''صداقت شعری'' کہتا تھا۔'' ان کا خیال یہ بھی ہے کہ شاعری، مصوری اور موسیقی کی طرح ناول میں بھی یہ خوبی ہونی چاہیے کہ وہ مصنف کے خیالات کے ساتھ ساتھ قاری کے خیالات کا بھی حامل معلوم ہو اور مذکورہ فنون کی طرح ناول میں بھی یہ شان ہونی چاہیے کہ اس کا قاری بھی دوسرے فنون لطیفہ کے ناظر یا سامع کی طرح کہانی کے واقعات سے اس کے وسیع تر مفہوم تک سفر کر سکے۔

ناول کے عناصر ترکیبی اور ناول کے متعلقات سے بحث کرنے کے بعد سروری ناول نگار پر چند فرائض بھی عائد کرتے ہیں۔ اس فہرست میں وہ مشاہدہ، مواد کی تلاش، انتخاب، واقعات کی پیش کش، مقصد اور فنی تکمیل کو شامل کرتے ہیں۔ آخر الذکر کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''فنی تکمیل سے ہماری مراد نہ صرف ضروریات ناول نگاری پر خیال رکھنا ہے بلکہ اسلوب بیان پر بھی زور دینا ہے۔ ناول میں بھی مثل نظم کے کوئی جملہ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ جس کی بندش الفاظ چست نہ ہو اور ایک لفظ بھی ایسا نہ ملے جس پر کافی غور وخوض نہ کر لیا گیا ہو۔'' (۳۳)

لیکن وہ اس بات سے بھی متنبہ کرتے ہیں کہ اسلوب بیان پر ہی سارا زور قلم صرف کر دینے کے نتیجے میں ناول دوسری تمام صفات سے عاری ہو کر محض عبارت آرائی کا نمونہ بن جاتا ہے۔ مگر غالباً ان کے سامنے ایسے کسی ناول کی مثال موجود نہ تھی اس لیے وہ مرزا رجب علی بیگ سرورؔ کے ''فسانہ عجائب'' کے اس حصے سے عبارت آرائی کی مثال پیش کرتے ہیں جہاں شہزادہ جان عالم کے سفر پر نکلنے کا حال رقم کیا گیا ہے۔

ناول و افسانے کے سلسلے میں سروری کا نقطہ نظر خالص مقصدی اور افادی ہے اگر چہ وہ اس صنف نثر کو فنون لطیفہ میں شامل کرتے ہیں اور یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ''فنون لطیفہ کا تعلق جسمانی ضروریات کے بجائے روحانی تسکین سے ہے'' تاہم بالواسطہ وہ اس صنف کو تعلیمی اور اخلاقی اصلاح کے علاوہ مختلف علوم وفنون کی تحصیل و ترویج کا ذریعہ قرار دینے پر مصر ہیں۔ اور افسانہ نگاروں سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ایسے افسانے تخلیق کریں جو نوجوانوں کے اخلاق سنوارنے اور معاشرت کی اصلاح میں معاون ہوں۔ اس سلسلے میں ان کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''ادب لطیف کی مانگ کو پورا کرنے کے لیے سینکڑوں قصے اور ناول معرض وجود میں آ رہے ہیں۔ ان کا ایک بڑا حصہ ہے جو اردو ادب کے لیے کلنک کا ٹیکہ نہ ہو لیکن ہر قسم کی دیرپا اہمیت سے خالی ضرور ہے۔'' (۳۴)

سروری کے نزدیک ناول کا منصب ومقصد انتہائی بلند اور قابل احترام ہے۔ اس سلسلے میں وہ اپنے خیالات کا اس طرح اظہار کرتے ہیں:

''انسان میں ایک لطیف شے پوشیدہ ہے جس کو وجدان، ذوق یا احساس جمال سے تعبیر کرتے ہیں اور جس کی بدولت انسان حسن فطرت سے متاثر ہوتا رہتا ہے جس طرح جسمانی توقعات بہت سے علوم وفنون کے ذریعہ پوری کی جاتی ہیں اسی طرح ذوق کی پیاس بجھانے کی بھی سخت ضرورت ہے۔اور اسے سرانجام فنون لطیفہ کے ذریعہ کیا جاتا ہے''(۳۵)

سروری ناولوں کو مقصدی یا تبلیغی ناول کی ذیل میں رکھتے ہوئے نظر آتے ہیں اور انھیں کسی سیاسی، مذہبی، معاشرتی یا فنی اور علمی مسائل کی اشاعت کی غرض سے لکھا جانے والا ناول قرار دیتے ہیں۔لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ ناول کے اصلاحی یا مقصدی پہلو یا اس میں اخلاقی عنصر کی شمولیت سے انکار کرتے ہوں بلکہ وہ تو کسی اعلیٰ مقصد کو بطور محرک ناول نگار کے اہم فرائض میں داخل سمجھتے ہیں:

''ناول نگار کا مہتم بالشان فرض یہ ہے کہ مقصد جو محرک قصہ ہو، نہایت اعلیٰ ہونا چاہیے۔تمام مستند ناول نگار کسی اعلیٰ مقصد کو منزل مقصود قرار دے کر اس کی طرف گامزن ضرور کرتے ہیں اور اسی لیے ان کے ناول میں فلسفۂ اخلاق کا کچھ نہ کچھ جز ضرور پایا جاتا ہے۔''(۳۶)

''۔۔۔لیکن اخلاقی عنصر کا ناول میں پوشیدہ ہونا واجب ہے تاکہ ناول اخلاقیات یا پندونصائح کی کتاب نہ بن جائے۔''(۳۷)

اس جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ سروری ناول میں اصلاحی اور اخلاقی پہلو کے تو قائل ہیں لیکن اس طور پر کہ اس سے ناول کا حسن یا اس کی روح متاثر نہ ہونے پائے یعنی وہ ناول کو محض فن کے نمونے یا کسی فکر کے ترجمان کے بجائے اس میں دونوں کی ایسی آمیزش کے قائل ہیں کہ فکر کو فن کا درجہ حاصل ہو جائے۔

ناول کی تنقید کے حوالے سے پہلی مکمل اور جامع کتاب علی عباس حسینی کی ''ناول کی تاریخ وتنقید'' کے نام سے ۱۹۴۴ء میں منظر عام پر آئی۔اس کے بعد آج تک ناول کے بارے میں سینکڑوں تنقیدی کتابیں لکھی گئیں۔ان میں سے چند ایک اس طرح ہیں۔

ناول کیا ہے؟ احسن فاروقی ونورالحسن ہاشمی (۱۹۵۱ء)، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار، پروفیسر قمر رئیس (۱۹۵۹ء)، داستان سے افسانے تک، پروفیسر وقار عظیم (۱۹۶۰ء)، اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، احسن فاروقی (۱۹۶۳ء) ، ادبی تخلیق اور ناول، احسن فاروقی (۱۹۶۳ء) اردو ناول نگاری، سہیل بخاری (۱۹۷۲ء)، بیسویں صدی میں اردو ناول، پروفیسر عبدالسلام (۱۹۷۳ء)، بیسویں صدی میں اردو ناول، پروفیسر یوسف سرمست (۱۹۷۳ء)، اردو ناول: سمت ورفتار، سید علی حیدر (۱۹۷۸ء)، اردو ناول پریم چند کے بعد، ہارون ایوب (۱۹۷۸ء) وغیرہ۔

جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ علی عباس حسینی کی تصنیف ''ناول کی تاریخ وتنقید'' ناول کی تنقید کے حوالے سے پہلی کتاب مانی جاتی ہے جس میں مصنف نے ناول کے فن کے فارم سے متعلق مفصل گفتگو کی ہے۔ پہلے باب میں قصہ کے آغاز وارتقا کو بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں ناول کی تعریف، اس کے اقسام، ناول کے عناصر ترکیبی سے بحث کی گئی ہے، جس میں انگریزی ناول نگاری پر ناقدوں کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ تیسرا باب انگریزی ناول نگاروں اوران کے اہم ناولوں کا احاطہ کرتا ہے۔ چوتھے باب میں مصنف نے اردو ناول کے عناصر ترکیبی کو بیان کیا ہے اوراسی ذیل میں اردو کے ناول نگاروں پر کچھ گفتگو کی ہے۔ پانچواں باب رتن ناتھ سرشار پر مشتمل ہے اوراس باب میں سرشار کے ناولوں اوران کے ناولوں کے کردار پر بحث کی ہے۔ کتاب کے چھٹے باب میں عبدالحلیم شرر اوران کے تاریخی ناول اور محمد علی طیب کے ناولوں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ ساتویں باب میں مصنف نے سجاد حسین، مرزا عباس حسین ہوشؔ، مرزا محمد ہادی رسواؔ اور راشد الخیری کے ناولوں پر بحث کی ہے اوراسی طرح آٹھواں باب منشی پریم چنداوران کے ناولپر مشتمل ہے جس میں بیوہ، بازارحسن، نرملا، میدان عمل، گئودان پر گفتگو کی گئی ہے اورنویں باب میں مرزا محمد سعید، فیاض علی، محمد مہدی تسکین، پنڈت کشن پرشاد کول، نیاز فتح پوری، نواب محمد حسین اور دوسرے ناول نگاروں پر مفصل تبصرہ کیا ہے۔ آخری باب میں علی عباس حسینی نے ''ترقی پسند ناول نویس'' اور ''دوسرے ناول نگار''، ''اردو کے ناول کا مستقبل'' کے عنوانات کے تحت اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اپندرناتھ اشک، عصمت چغتائی، کرشن چندر، سجاد ظہیر، قیسی رام پوری، عزیز احمد، رشید احمد وغیرہ کے ناولوں پر اجمالی تنقید کی ہے۔ پروفیسر ارتضی کریم علی عباس حسینی کی اس کتاب کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''اگر'' ناول کی تاریخ وتنقید'' کا مجموعی جائزہ لینا ہوتو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ علی عباس حسینی کی یہ کتاب دراصل ناول کی تاریخ ہے جس میں تقریباً نصف کتاب انگریزی ناول کی تاریخ بیان کرتی ہے۔ بقیہ تصنیف میں اردو ناول کی تاریخ ملتی ہے۔ان کا مقصد تنقید تو تھا مگر مقصد اولین تھا ''اپنوں کے گن گانا'' چنانچہ تنقید کے اصولوں سے صرف نظر کرتے ہوئے انھوں نے اپنے ہم عصروں اور دوستوں کی تصنیفات پر تعریفی کلمات لکھے۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا محمد سعید، بیگم احمد علی، اے۔ آر، خاتون وغیرہ کم درجہ ناول نویسوں پر کھل کر اظہار خیال ملتا ہے اور پریم چند، کرشن چندر یا دوسرے اہم ناول نگاروں پر کم بات کی گئی ہے۔ گویا اردو تنقید میں جانبداری کی روایت کو فروغ دینے میں علی عباس حسینی کا بھی عمل دخل رہا ہے۔'' (۳۸)

علی عباس حسینی کے بعد ناول کی تنقید کے حوالے سے احسن فاروقی اور نورالحسن ہاشمی کی تصنیف ''ناول کیا ہے'' اہمیت کی حامل ہے۔ یہ ناول نگاری کی تکنیک کے حوالے سے ایک اہم کتاب ہے اور ناول کے فن پر اردو زبان میں اس طرح کی شاید کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔اس کتاب میں مصنف نے انگریزی ناول کے تعلق سے جو کچھ اساتذہ اور انگریزی زبان کی کتابوں سے حاصل کی ہے ان سب کو اختصار کے ساتھ مربوط طریقے سے جمع کر دیا ہے۔

یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے جن میں ناول کے عناصر، ناول اور زندگی، ناول کی ہیئت، ناول کے اقسام، پرانا فن، نئے تجربات، اردو ناول کا ارتقا، ناول کی فنی حیثیت، ناول کا مستقبل جیسے اہم موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ جس وقت یہ کتاب لکھی گئی اس تناظر میں آل احمد سرور ناول کی تنقید کے حوالے سے لکھی جانے والی کتابوں کے بارے میں یوں اظہار نظر کرتے ہیں:

''اردو میں اچھے ناول زیادہ نہیں مگر ناول پر اچھی کتابیں تو نہ ہونے کے برابر ہیں۔ عبدالقادر سروری، علی عباس حسینی، جمیل احمد کندھائے پوری اور مجنوں کی

چھوٹی سی کتاب کے علاوہ کچھ بھی تو نہیں ملتا۔علی عباس حسینی نے ناول کی تاریخ وتنقید میں فن اور فارم پر مفید اشارے کیے ہیں مگر وہ بہت تشنہ ہیں اور اردو ناول پر اتنے طویل تبصرے ہیں کہ اس سے زیادہ گنجائش بھی نہ تھی۔''(۳۹)

آل احمد سرورؔ اس کتاب ''ناول کیا ہے؟'' کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

''یہ کتاب اچھے موقع پر لکھی گئی ہے اور ایک بڑی ضرورت کو پورا کرتی ہے۔اس میں ناول کے اقسام، اس کی ہیئت، کردار، پلاٹ، فلسفہ زندگی، نفسیاتی تجزیہ، مکالمہ، تاریخی، ڈرامائی کرداروں اور معاشرتی ناول کی خصوصیات، ناول کی روایات اور اس کے تجربے واضح اور دل نشیں انداز سے بیان کیے گئے ہیں۔ کتاب کے آخری دو باب خاص دلچسپ ہیں ایک میں ناول کے مستقبل سے اور دوسرے میں اردو ناول کی خصوصیات سے بحث کی گئی ہے۔''(۴۰)

خود شمس الرحمٰن فاروقی اور نور الحسن ہاشمی اپنی کتاب کے ہدف کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ناول کے فن پر اس طرح کی تصنیف اردو زبان میں شاید کوئی شائع نہیں ہوئی۔علی عباس حسینی صاحب کی ناول نگاری کی تاریخ کا ایک باب ناول کے فن پر کافی روشنی ڈالتا ہے مگر یہ بیان ناکافی ہے۔اس کتاب کا مقصد تمام تر تاریخی ہے اور وہ اپنے مقصد یعنی اردو ناول کی تاریخ پیش کرنے میں ہر طرح کامیاب ہے لیکن ہماری یہ مختصر تصنیف محض فنی نقطۂ نظر سے مرتب کی گئی ہے۔ اس کتاب میں ہم نے کوئی نئی بات پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انگریزی ناول کی بابت جو کچھ ہم نے اپنے استادوں سے یا انگریزی زبان کی کتابوں سے سیکھا ہے اس کو اختصار کے ساتھ مربوط طریقے سے ایک جگہ جمع کر دیا ہے خیالات کی سطح اور زبان کے طرز دونوں کو ایسا رکھا ہے کہ عام ناظر اور اوسط طالب علم کو سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو۔۔اس کتاب کے پڑھنے والے پر ناول نگاری کے دقیق نکتے شاید واضح نہ ہوں مگر اس فن کے موٹے موٹے اصول

ضرور روشن ہو جائیں گے۔‘‘(۴۱)

مصنفین نے ناول کے عناصر میں قصہ پن، پلاٹ، کردار نگاری، ماحول، مکالمہ، بیان، جذبات نگاری، فلسفۂ حیات وغیرہ کو اہم قرار دیتے ہیں اور ان کے نزدیک ناول کے لیے قصہ ضروری ہے قصہ میں اوقات کا تعین اور اس کی ابتدا، درمیان اور آخر کا ہونا لازمی ہے۔ قصہ میں انتظار یا تجسس کی خلش خاص چیز ہے اور جتنی انتظار کی خلش ہوگی اتنا ہی قصہ بھی دلچسپ ہوگا۔ احسن فاروقی اور نورالحسن ہاشمی کی اس کتاب کے تعلق سے پروفیسر ارتضی کریم یوں اظہار خیال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

> ’’ناول کیا ہے؟ مجموعی طور پر ہمیں کسی بڑی اور اہم تنقید یا معلومات سے باخبر نہیں کرتی۔ اس کتاب میں تکرار اور تضاد بھی ہے اور بیانات میں تسامحات بھی پائے جاتے ہیں۔ فاروقی اور ہاشمی صاحبان نے تنقیدی شہادت کے لیے زیادہ تر مغربی ادب سے ہی استفادہ کیا۔ اردو کے سرمایہ پر ان کی نظر گئی ہی نہیں اور گئی بھی تو وہ نگہ جو ایک نگاہ سے بھی کم ہے لیکن ایک خاص بات یہ ہے کہ ان صاحبان نے ناول کے متعلق لکھنے اور سوچنے پر دوسرے قلم کاروں کو دعوت دی۔‘‘(۴۲)

محمد احسن فاروقی کی ایک اور کتاب ’’اردو ناول کی تنقیدی تاریخ‘‘ بھی ناول کی تنقید کے حوالے سے اہمیت رکھتی ہے جس میں انھوں نے اردو ناول نگاری کے ارتقاء کا جائزہ لیا ہے لیکن اس سلسلے میں ان ناولوں کا ہی تنقیدی اور تفصیلی ذکر کیا ہے جو ان کے نزدیک اہم ہیں۔ وہ اردو نثر کی ابتدا اور نثری اصناف، داستان سے ناول کا آغاز اور ارتقا پر گفتگو کرتے ہیں اور میر امن کی باغ و بہار میں ناول کے اجزائے ترکیبی تلاش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مصنف نے کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے جس کے پہلے حصے میں اردو ناول کے اولین نقوش تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور نذیر احمد کے تمثیلی افسانے پر گفتگو کی ہے۔ دوسرے حصے میں سرشار، شرر اور رسوا کی ناول نگاری پر بحث کی ہے اور تیسرے حصے میں جدید ناول کے رجحانات اور ضروریات اور مستقبل پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ ارتضی کریم اس کتاب کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''احسن فاروقی کی تنقید نے اردو ناول کے تنقیدی سرمایے میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ان کی آراء افراط وتفریط کا شکار ہیں۔ وہ نثر کے کلیم الدین احمد لگتے ہیں جیسے کلیم الدین احمد صاحب کو اپنی اور اپنے والد کی شاعری بہترین لگتی ہے اسی طرح احسن فاروقی کو بھی اپنے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔ اس کا اندازہ ان کی دوسری تنقیدی تصنیف ''ادبی تخلیق اور ناول'' سے ہوتا ہے جس میں انگریزی ناول نگاروں پر زیادہ گفتگو ہے۔اردو ناول کے سلسلے میں بھی انگریزی ناولوں سے ہی مقابلہ اور موازنہ کیا گیا ہے۔'' (۴۳)

اردو ناول کی تنقید میں عبدالسلام نے اپنی کتاب ''بیسویں صدی میں اردو ناول'' لکھ کر ناول کے تنقیدی سرمایے میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔انھوں نے اپنی اس کتاب میں عمیق مطالعے اور بصیرت سے کام لیتے ہوئے شرر سے لے کر رسوا، پریم چند، کرشن چندر، عصمت چغتائی، عزیز احمد، احسن فاروقی اور قرۃ العین حیدر تک کی ناول نگاری کے مخصوص فن اور فکر کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔شرر کی ناول نگاری کو خصوصیت کے ساتھ مفصل بیان کیا ہے اور بقول ارتضیٰ کریم:

''بیسویں صدی میں اردو ناول'' ایک تحقیقی اور تنقیدی کتاب ہے۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ اردو ناول کی تنقید میں عبدالسلام کی یہ کاوش بڑی اہمیت رکھتی ہے۔اس تصنیف میں انھوں نے پرانی باتوں کو دہرایا نہیں بلکہ بے تکلفی سے اور نہایت ایمانداری کے ساتھ جس ناول نگار کے متعلق انھوں نے جو محسوس کیا، لکھا ہے۔'' (۴۴)

اس کے علاوہ اردو ناول کے تنقیدی سرمایے میں اضافے کے طور پر ڈاکٹر یوسف سرمست کی تصنیف '' بیسویں صدی میں اردو ناول'' کا بھی جائزہ لیا جا سکتا ہے جس میں انھوں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ اردو ناول نے بیسویں صدی کے ابتدائی پانچ دہوں میں جو ارتقائی منزلیں طے کی ہیں ان کا مکمل طور پر تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا جائے۔ یوسف سرمست کی اس تصنیف کے بارے میں ڈاکٹر ارتضیٰ کریم لکھتے ہیں کہ:

''یوسف سرمست نے بیسویں صدی میں اردو ناول کے ارتقائی سفر کو صاف ستھری زبان میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔اسے اردو ناول کی تاریخ جدید کا نام ضرور دیا جاسکتا ہے۔''(۴۵)

نمائندہ ناول نگاروں کی ناول نگاری کے تنقیدی جائزے کی شروعات یوں تو ہنس راج رہبر کی کتاب ''پریم چند''(۱۹۵۰ء) میں اور لطیف حسین ادیب کی تصنیف ''سرشار کی ناول نگاری''(۱۹۵۸ء) سے ہوچکی تھی لیکن پروفیسر قمر رئیس نے ۱۹۵۹ء میں ناول کے نئے فنی و جمالیاتی تقاضوں اور امکانات کی بنیاد پر ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ: بحثیت ناول نگار'' لکھ کر گویا اردو میں ناول کی سائنٹیفک اور تجزیاتی تنقید کی بنیاد رکھ دی تھی لیکن ۱۹۸۰ء کے بعد اگرچہ نذیر احمد، مرزا محمد ہادی رسوا، شرر اور سرشار سے لے کر عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر تک کی ناول نگاری کے بارے میں تحقیقی وتنقیدی تصانیف سامنے آئیں پھر بھی ناول کی تنقید کا جو معیار پروفیسر قمر رئیس نے قائم کیا تھا ۱۹۸۰ء کے بعد اس معیار کو نہ تو بلند کیا جاسکا اور نہ ہی ناول کی تنقید کے نئے امکانات کی باقاعدہ طور پر نشاندہی کی جاسکی۔

ناول کے تنقیدی سرمایے میں پروفیسر قمر رئیس کی تصنیف ''پریم چند کا تنقیدی مطالہ: بحثیت ناول نگار'' ایک اہم تنقیدی وتحقیقی کتاب ہے۔اس سے قبل پریم چند کے بارے میں اتنی تفصیل سے کوئی تنقیدی مطالعہ نظر نہیں آتا اور بقول رشید احمد صدیقی:

''اردو میں شاید یہ پہلا مقالہ ہے جس میں پریم چند کے تصورات اور ان کی تخلیقات کا اس تفصیل سے مطالعہ کیا گیا ہے اور ان کے محرکات بعض ناولوں اور کرداروں کے ماخذوں، موضوعات اور ناول کی فنی ساخت و پرداخت کو تنقیدی زاویے سے پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔''(۴۶)

ارتضی کریم پروفیسر قمر رئیس کی اس تنقیدی تصنیف کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''پروفیسر قمر رئیس نے اپنی اس تنقیدی تصنیف میں پریم چند کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس میں استدلال نظر آتا ہے۔ وہ ایک اچھی اور معیاری تنقید کے مزاج

آشنا ہیں چنانچہ وہ جذباتیت سے دامن بچا گئے ورنہ اردو کا نقاد اور ناول نگار اس معاملے میں یکساں نظر آتا ہے جس طرح ہر ناول نگار کو اپنے ہیرو سے ہمدردی خاص ہو جاتی ہے۔ اسی طرح نقاد کو کسی فن پارہ کی تنقید کے دوران صرف خوبیاں نظر آتی ہیں یا خامیاں۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے جہاں پریم چند کے ناول میں کمزوریاں فن کے اعتبار سے یا زبان کے اعتبار سے کسی اور طرز سے دیکھی ہیں، ان کی بھی نشاندہی کی ہے۔'' (۴۷)

پروفیسر قمر رئیس کا دنیا کی بڑی زبانوں کے افسانوی ادب کا مطالعہ قابل رشک تھا۔ ٹالسٹائی، چیخوف، جیمس جوائس اور ورجینا وولف سے لے کر گبریل گارشیا مارکیز تک کے ناولوں کے فنی و جمالیاتی معائر کا ذکر انھوں نے اپنے ۱۹۸۰ء سے قبل اور بعد کی تنقیدی تحریروں میں بار بار کیا ہے لیکن پوری غیر جانبداری کے ساتھ مثلاً پریم چند کے ناولوں کی فنی خوبیوں کا اعتراف تو انھوں نے شدت کے ساتھ کیا ہی ہے پریم چند کی خامیوں اور کمزوریوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔ وہ پریم چند کے ناولوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جب ہم ناول کے عالمی معیاروں اور کرداروں کو سامنے رکھتے ہیں تو پریم چند کے فن کا پہلو کمزور نظر آتا ہے۔ وہ اپنے کرداروں کے جذبات کی وسعت، پیچیدگی اور گہرائی کا پوری طرح احاطہ نہیں کر پاتے۔ عام طور پر ان کے کرداروں کے تجربات میں گہری واقفیت، تعمیمی صداقت اور تعاقبانہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی جو قاری کو اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہے۔ ان کے کردار برف کے مجسموں کی طرح شفاف اور پاکیزہ ہیں لیکن اتنے ہی سرد بھی۔ ان میں زندگی کا وہ گداز حرارت اور تڑپ نہیں جو ہمیں شدت سے متاثر کر سکے۔'' (۴۸)

پرفیسر قمر رئیس کے بعد بہت سی کتابیں منظر عام پر آئیں جن میں نمائندہ ناول نگاروں کی ناول نگاری کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ اور یہ کتابیں بھی ناول کی تنقید میں قابل قدر اضافہ کے طور پر دیکھی جاتی ہیں ان میں مندرجہ ذیل کتابیں قابل ذکر ہیں۔

مرزا رسوا: سوانح حیات اور ادبی کارنامے، میمونہ بیگم (۱۹۶۳ء)، سرشار: ایک مطالعہ، پریم پال اشک (۱۹۶۴ء)، اردو کا پہلا ناول: خط تقدیر، محمود الٰہی (۱۹۶۵ء)، مرزا رسوا: حیات اور ناول نگاری، آدم شیخ (۱۹۶۸ء)، رسوا کی ناول نگاری، ظہیر فتح پوری (۱۹۷۱ء)، پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار، شمیم نکہت (۱۹۷۵ء)، نذیر احمد: شخصیت اور کارنامے، اشفاق احمد اعظمی (۱۹۷۷ء) شرر کی تاریخی ناول، ممتاز بنگلوری (۱۹۷۸ء)، فسانہ آزاد: تنقیدی تجزیہ، تبسم کاشمیری (۱۹۷۸ء) وغیرہ۔

عصر حاضر میں بالخصوص ۱۹۸۰ء کے بعد اردو ناول کی تنقید کے حوالے سے دیکھا جائے تو ماحول و معاشرے کے تیزی سے بدلتے ہوئے سماجی وثقافتی اور سیاسی و معاشی حالات کے حوالے متعدد ناول لکھے گئے اور ناول نگاروں نے آزادانہ طور پر اپنے آس پاس کی زندگی اور زمانے کو مدنظر رکھتے ہوئے سماجی وثقافتی اور اخلاقی نظام اقدار کو اس کے اصل چہروں کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی۔ ایسے ناول میں جوگیندر پال کا ''نادید''، عبدالصمد کا ''دوگز زمین'' اور ''دھمک''، حسین الحق کا ''فرات''، الیاس احمد گدی کا ''فائر ایریا''، پیغام آفاقی کا ''مکان'' اور ''پلیتہ''، علی امام نقوی کا ''تین بتی کا راما''، شموئل احمد کا ''ندی'' اور ''مہاماری''، غضنفر کا ''پانی''، ''کینچلی'' اور ''دویہ بانی''، مشرف عالم ذوقی کا ''بیان'' اور ''پوکے مان کی دنیا'' اور ''لے سانس بھی آہستہ''، ساجدہ زیدی کا ''مٹی کا حرم'' اور آنند لہر کا ''اگلی عید سے پہلے'' وغیرہ اہم ہیں۔

بیسویں صدی کے نصف آخر کی آٹھویں دہائی کے بعد اردو ناول کے تنقیدی سرمایے میں علی احمد فاطمی کی تصنیف ''تاریخی ناول: فن اور اصول'' اہم کوشش رہی ہے جو ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی۔ اس موضوع پر اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں تاریخی ناول کے فن اور اصول پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اگر چہ فاطمی نے یہ کتاب مغربی مفکرین اور بعض ہندی کی کتابوں سے استفادہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے مگر یہ کتاب ''شرریات'' کی تفہیم میں پیش نامہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

اسی طرح بیسویں صدی کے نصف آخر کی اواخر کی دہائیوں میں پروفیسر ارتضیٰ کریم کی تصنیف ''اردو فکشن کی تنقید'' جو ۱۹۹۶ء میں پہلی بار منظر عام پر آئی، فکشن کی تنقید منجملہ ناول و افسانے کی تنقید میں اہمیت کی حامل ہے۔ بقول پروفیسر محمد حسن ارتضیٰ کریم نے اردو کے افسانوی ادب کی تنقید کی مختلف جہات کی بھرپور نمائندگی کی ہے

لیکن بیسویں صدی کی نصف آخر کی آٹھویں دہائی کے بعد جن ناقدین نے تواتر کے ساتھ ناول کی تنقید کے ایک سے بڑھ کر ایک نمونے پیش کیے ہیں وہ پروفیسر وہاب اشرفی، گوپی چند نارنگ، عبدالمغنی، وارث علوی، شمیم حنفی، قدوس جاوید، ابوالکلام قاسمی، عتیق اللہ، سلیمان اطہر جاوید اور علی احمد فاطمی ہیں۔

وہاب اشرفی نے ناول کے حوالے سے متعدد مضامین لکھے ہیں ان کی کتاب ''اردو فکشن اور تیسری آنکھ (۱۹۹۸ء)'' میں ناول کے حوالے سے پانچ مضامین شامل ہیں۔ ا۔ سال بیلو کی ناول نگاری ۲۔ شاد عظیم آبادی کی ناول نگاری۔ ۳۔ حسرت تعمیر: ایک فنی جائزہ ۴۔ دوگز زمین: ایک جائزہ ۵۔ گوتم نیلمبر (آگ کا دریا)۔ وہاب اشرفی نے ناول کے تازہ ترین فنی و جمالیاتی اقدار سے بحث کرتے ہوئے عبدالصمد کے ناول ''دوگز زمین'' کا بہترین تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے اور انھوں نے ناول سے متعلق جدید ترین مباحث کی روشنی میں واضح طور پر یوں تحریر کیا ہے:

> ''ناول کا کوئی معین فارم نہیں ہے پھر بھی زندگی اسے کوئی نہ کوئی شکل دیتی رہتی ہے جس سے اس کی شناخت آسانی سے ہو جاتی ہے۔ ورنہ اس صنف کے جتنے رنگ سامنے آتے رہے ہیں وہ اس کے تنوع پر دال ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ناول کا رشتہ کسی نہ کسی طرح زندگی سے رہا ہے اس لیے اسے کلاسیکی تنقید میں بجا طور پر نثری ایپک کیا گیا ہے۔'' (۴۹)

اردو ناول کی تنقید کے ضمن میں سید عقیل رضوی کا نام بھی اہمیت رکھتا ہے ان کی کتاب ''اردو ناول کا فن جدید ناول کے تناظر میں'' ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ اس کتاب کے علاوہ انھوں نے ناول اور اس کے فن کے حوالے سے متعدد مضامین تحریر کیے ہیں جو ناول کی تنقید کے حوالے سے مثال و معیار کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اسی طرح ڈاکٹر انور پاشا کی تصنیف ''ہندو پاک میں اردو ناول: تقابلی مطالعہ'' بھی اردو تنقید کے حوالے سے اہم کام ہے۔ اگرچہ مصنف نے اپنے کام کو بہت محدود رکھا ہے اور کسی ٹھوس نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ تاہم اس کتاب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ناول کی تنقید کے باب میں پاکستان کے مصنفین نے بھی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ بیسویں صدی

کے نصف آخر کی آخری دہائیوں میں پاکستانی مصنفین کی طرف سے شائع ہونے والی کتابوں میں ڈاکٹر ممتاز احمد خان کی تصانیف ''اردو ناول کے بدلتے تناظر (۱۹۹۳ء)''، ''آزادی کے بعد اردو ناول (۱۹۹۷ء)'' اور رضی عابدی کی تصنیف ''تین ناول نگار ۲۰۱۱ء)'' اہمیت کے حامل ہیں۔

ممتاز احمد خان نے ''اردو ناول کے بدلتے تناظر'' میں دو درجن سے زائد ناولوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ اور انھوں نے اپنی دوسری کتاب '' آزادی کے بعد اردو ناول'' میں ہیئت، اسالیب اور رجحانات کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے ناقدانہ نگاہ بھی ڈالی ہے۔ ان کی پہلی کتاب کے بارے میں قمر جمیل لکھتے ہیں:

> ''اردو میں یہ ایک ایسی کتاب ہے جس سے ظاہر ہوگا کہ ناول کسے کہتے ہیں اور اردو میں جدید عہد میں کون سے ناول لکھے گئے ہیں۔ ان کے موضوعات کیا ہیں اور ان کا ہماری تہذیبی اور سماجی زندگی سے کیا رشتہ ہے۔ اس میں عزیز احمد، قرۃ العین حیدر، شوکت صدیقی، ڈاکٹر احسن فاروقی سے لے کر انتظار حسین تک سب ہی قابل ذکر ناول نگاروں کے ناول زیر بحث ہیں۔ اردو میں ناولوں پر تنقید کی کمیابی کو دیکھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ممتاز احمد خان کی یہ کوشش انتہائی قابل غور ہے۔ انھوں نے جدید عہد کے ہر اہم ناول کے بنیادی جوہر کو آشکار کر دیا ہے۔ چنانچہ ہر ناول پر مختلف جہتوں سے گفتگو کرتے ہوئے اس کی نوعیت اور اس کے اسٹرکچر کو واضح کیا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ نقاد کی حیثیت سے اس کی ایسی تعبیر بھی پیش کی ہے جو ناول کے باطن کو روشنی میں لے آتی ہے''۔ (۵۰)

رضی عابدی نے اپنی کتاب ''تین ناول نگار'' میں قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور عبداللہ حسین کے ناولوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ اردو ناول کی تنقید میں ایک اہم نام اسلوب احمد انصاری کا بھی ہے جنھوں نے اپنی کتاب ''اردو کے پندرہ ناول (۲۰۰۳ء)'' میں اردو کے نمائندہ پندرہ ناولوں بالخصوص توبتہ النصوح، فردوس بریں، امراؤ جان ادا، میدان عمل، ایسی بلندی ایسی پستی، آگ کا دریا، اداس نسلیں، آنگن، ایوان غزل اور آگے سمندر ہے وغیرہ پر عمیق مطالعہ پیش کیا ہے۔ بقول ابوالکلام قاسمی:

''اردو میں فکشن کی تنقید علی العموم اتنی ترقی یافتہ نہیں کہ اسے شاعری کی تنقید کے مساوی مرتبہ کا حامل قرار دیا جا سکے تاہم جن معدودے چند نمائندہ نقادوں کی تحریروں نے فکشن کی تنقید کو وقار واعتبار بخشا ہے ان میں ایک اہم اور ممتاز نام پروفیسر اسلوب احمد انصاری کا ہے۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے فکشن کی عمومی تنقید کے بجائے اپنا اختصاص ناول کی تفہیم وتعبیر اور محاکمے سے وابستہ کیا ہے۔ افسانے کے مقابلے میں ناول اپنی وسعت، ہمہ جہتی اور اسالیب کی رنگارنگی کے اعتبار سے تنقید کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری اس اعتبار سے تنقید کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پروفیسر اسلوب انصاری اس اعتبار سے قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے مختلف اسالیب کی نمائندگی کرنے والے ناولوں کی قدر وقیمت متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔(۵۱)

ڈاکٹر فضیل احمد نے رال فاکس کی کتاب Novel and The People کا اردو ترجمہ ''ناول کا فن اور عام انسان'' ۱۹۹۷ء میں شائع کیا ہے لہذا اس کتاب نے بھی ناول کی تنقید پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔

مذکورہ مصنفین کے علاوہ اردو فکشن کی تنقید بالخصوص ناول کی تنقید میں ان چند نمائندہ ناقدین کا بھی شمار ہوتا ہے جنھوں نے اپنے مضامین کے ذریعہ ناول کی تنقید کو مختلف تنقیدی تصورات سے ہم آہنگ کرنے کے ساتھ ساتھ ناول کی تنقید کو وقار و معیار بخشا ہے۔ ان میں گوپی چند نارنگ، عبدالمغنی، وارث علوی، شمیم حنفی، قدوس جاوید، ابوالکلام قاسمی، عتیق اللہ، سلیمان اطہر جاوید اور علی احمد فاطمی کے نام خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے علاوہ عصر حاضر میں اردو ناول کے کئی نئے ناقد بھی سامنے آئے ہیں جن میں شہاب ظفر اعظمی کی کتاب ''اردو ناول کے اسالیب'' صالحہ زرین کی کتاب ''اردو ناول کا سیاسی و سماجی مطالعہ (۱۹۷۴ء سے ۱۹۶۹ء)''، ''اردو فکشن میں طوائف (۱۹۹۲ء)''، ڈاکٹر ریاض احمد کی تصنیف ''ترقی پسند تحریک اور اردو ناول (۲۰۰۷ء)''، ''اردو ناول میں عورت کا تصور (۱۹۹۲ء)''، اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار (۱۹۹۲ء)'' قابل ذکر ہیں۔ بہرحال عصر حاضر میں بالخصوص اکیسویں صدی میں ناول کا تنقیدی سرمایہ ابھی زیادہ تشفی بخش نہیں کہا جا سکتا اور موجودہ صورتحال میں

کلیم الدین احمد کی بات آج بھی درست نظر آتی ہے کہ:

> ''اردو ناول پر کوئی اچھی جامع کتاب نہیں ملتی، ایک کتاب کی ضرورت ہے جو موجودہ ذخیرہ کا جائزہ لے۔ اس کی قدر و قیمت کا تعین کرے۔ اچھے ناولوں کی کمی کے اسباب کا پتہ لگائے، نئی راہیں کھولے اور اس میں مغربی کارناموں کا ایک دھندلا سا نقش پیش کرے۔ ایسی کتاب کی ضرورت ہے، بہت ضرورت ہے۔''(۵۲)

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو ناول کی تنقید کے حوالے سے یہ معروضات آخری گفتگو نہیں ہے اور ہو بھی نہیں سکتی کیوں کہ تیزی سے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ اردو ناول کی زبان و موضوعات بدل رہے ہیں اور فکشن کی پیش کش کے اسالیب اور تخلیقی رویوں میں بھی تیزی تبدیلی آ رہی ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔انتخاب ''طلسم ہوشربا''، محمد حسن عسکری، ۱۹۳۵ء، ص ۲۶

۲۔ارتضی کریم، اردو فکشن کی تنقید، تخلیق کار پبلیشرز، دہلی ۱۹۹۶ء، ص ۲۴۷

۳۔مضامین پریم چند، مرتبہ عتیق احمد، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۱ء، ص ۲۲۸

۴۔ایضا، ص ۲۲۹

۵۔ایضا، ص ۲۲۸

۶۔ایضا، ۲۳۳

۷۔ایضا، ص ۲۳۴

۸۔ایضا، ۲۳۴

۹۔مضمون شرر و سرشار، مضامین پریم چند، ص ۲۳۸

۱۰۔اردوئے معلیٰ، اگست و ستمبر ۱۹۰۵ء، ص ۳۲

۱۱۔مضامین پریم چند، ص ۲۳۸

۱۲۔ایضاً، ص ۲۳۸ و ۲۳۹

۱۳۔ایضاً، ص ۲۲۰

۱۴۔ناول کا فن، مضامین پریم چند، ص ۲۰۹

۱۵۔ایضاً، ص ۲۲۱

۱۶۔ایضاً، ص ۲۲۴

۱۷۔عبدالقادر سروری، دنیائے افسانہ، مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد، ۱۹۲۷ء، ص ۸۳

۱۸۔ایضاً، ص ۲۲۱

۱۹۔ایضاً، ص ۲۲۷

۲۰۔ایضاً، ص ۲۱۰

۲۱۔ایضاً، ص ۲۱۲

۲۲۔ایضاً، ص ۲۱۲

۲۳۔ایضاً، ص ۲۱۳

۲۴۔ایضاً، ص ۲۱۳

۲۵۔ایضاً، ص ۲۱۳

۲۶۔ایضاً، ص ۲۱۳

۲۷۔ایضاً، ص ۲۱۴

۲۸۔عبدالقادر سروری، دنیائے افسانہ، دیباچہ، ص ۴

۲۹۔ایضاً، دیباچہ، ص ۱۱و۱۲

۳۰۔دنیائے افسانہ، ص ۹۲

۳۱۔ایضاً، ص ۹۴

۳۲۔ایضاً، ص ۱۰۲

۳۳۔ایضاً، ص ۱۱۶

۳۴۔ایضاً، دیباچہ، ص ۹و۱۰

۳۵۔ایضاً، ص ۲۹

۳۶۔ایضاً، ص ۱۱۴

۳۷۔ایضاً، ص ۱۵

۳۸۔ارتضی کریم ،اردو فکشن کی تنقید،ص۲۸۳،

۳۹۔محمد احسن فاروقی ونورالحسن ہاشمی ، ناول کیا ہے؟ پیش لفظ ، دانش محل لکھنؤ ،۱۹۵۱ء،ص۱۰

۴۰۔ایضاً،ص۱۰

۴۱۔ایضاً، دیباچہ،ص۱۵

۴۲۔اردو فکشن کی تنقید،ص۲۹۶

۴۳۔ایضاً،ص۳۱۹

۴۴۔ایضاً،ص۳۳۴

۴۵۔ایضاً،ص۳۳۵

۴۶۔قمر رئیس ، پریم چند کا تنقیدی مطالعہ: بحثیت ناول نگار، سرسید بک ڈپو،علی گڑھ،۱۹۵۹ء،ص۱۹و۲۰

۴۷۔اردو فکشن کی تنقید،ص۳۱۰

۴۸۔ پریم چند کا تنقیدی مطالعہ،ص۴۲۹

۴۹۔اردو فکشن اور تیسری آنکھ، وہاب اشرفی ،ص ۳۵

۵۰۔اردو ناول کے بدلتے تناظر، ممتاز احمد، ویلکم بک ڈپو لمیٹڈ، کراچی۱۹۹۳ء، ۵۶

۵۱۔اردو کے پندرہ ناول، ابوالکلام قاسمی ،ص ۸۷

۵۲۔کلیم الدین احمد، اردو زبان اور فن داستان گوئی لکھنؤ ۱۹۶۵ء،ص ۱

☆☆☆

باب سوم

اردو افسانے کی تنقید: ابتدا تا حال

اردو میں افسانہ کی تنقید کا سلسلہ، اردو کے ابتدائی دور کے افسانوں کے حوالوں سے لکھی گئی بعض تاثراتی تحریروں سے ہی شروع ہوتا ہے۔ اردو میں افسانہ نگاری کا نقطہ آغاز کس افسانہ کو قرار دیا جائے اس کے بارے میں کوئی متفقہ فیصلہ نہیں ہوسکا ہے۔ بعض ناقدین کی رائے میں سرسید کی تحریر ''گزرا ہوا زمانہ'' اردو کا پہلا مختصر افسانہ ہے جب کہ مرزا حامد بیگ اور کئی دوسرے ناقدین نے اسے مکمل افسانہ تسلیم نہیں کیا ہے۔ کیوں کہ ''گزرا ہوا زمانہ'' میں کردار واقعہ، پلاٹ اور جزئیات کی جگہ اخلاق و اصلاح پر زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ افسانہ کے مشہور محقق اور نقاد ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے اپنی کتاب ''اردو افسانے کی روایت'' میں ''گزرا ہوا زمانہ'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''سرسید احمد خان کی یہ تحریر ''گزرا ہوا زمانہ'' اپنے آغاز میں یقیناً افسانہ کہلانے کی مستحق ہے اور بنت کے حوالے سے اس تحریر میں شعور کی رو کا اولین استعمال بھی دیکھنے کو ملتا ہے جو آگے چل کر احمد علی، قرۃ العین حیدر کے ہاں فنی پختگی تک پہنچا لیکن اس کا وسط اور اختتامیہ اسے واضح طور پر ایک اصلاحی مضمون بنا دیتا ہے۔''(۱)

''گزرا ہوا زمانہ'' علی گڑھ تحریک کے ترجمان رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں مارچ ۱۸۷۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اگر ''گزرا ہوا زمانہ'' کو فنی اعتبار سے کمزور ہی سہی افسانہ مان لیا جائے تو پھر یہ بھی ماننا ہوگا کہ سرسید اردو کے پہلے افسانہ نگار ہیں۔ لیکن سرسید افسانہ نگار ہرگز نہیں تھے۔ ''گزرا ہوا زمانہ'' اور ان کی ایک دو اور تحریروں میں بعض واقعات ضرور بیان ہوئے ہیں لیکن ان کا مقصد افسانہ طرازی نہیں تھا وہ محض معاشرے کی اصلاح اور بیداری چاہتے تھے یہی وجہ ہے کہ ''گزرا ہوا زمانہ'' اردو کا پہلا افسانہ تسلیم نہیں کیا گیا۔

ایک عرصہ تک پریم چند کے افسانہ ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' کو اردو کا پہلا افسانہ قرار دیا جاتا

رہا۔خود پریم چند نے بھی ۱۹۳۲ء میں اپنی ادارت میں شائع ہونے والے مجلّہ ''ہنس'' کے ''آتم کتھا نمبر'' میں لکھا ہے کہ: ''میری سب سے پہلی کہانی کا نام تھا ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' وہ ۱۹۰۷ء میں رسالہ ''زمانہ'' کانپور میں چھپا۔''(۲)

پریم چند کے اس بیان کی بنیاد پر اردو کے اکثر ناقدین نے جن میں وقار عظیم، احتشام حسین اور قمر رئیس بھی شامل ہیں ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' کو اردو کا پہلا افسانہ اور پریم چند کو اردو کا پہلا افسانہ نگار قرار دیتے ہیں لیکن بعد میں محققین نے اپنی تحقیق کے ذریعہ یہ ثابت کیا کہ نہ تو ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' اردو کا پہلا افسانہ ہے اور نہ پریم چند اردو کے پہلے افسانہ نگار۔ بعض محققین نے دریافت کیا کہ راشد الخیری کا افسانہ ''نصیر اور خدیجہ'' جو ۱۹۰۳ء میں لاہور کے رسالہ مخزن کے شمارہ ۳ میں شائع ہوا تھا، پہلا افسانہ ہے۔ اسی طرح ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' سے پہلے شائع ہونے والے پانچ افسانوں کی نشان دہی اس طرح کی جاتی ہے:

۱۔افسانہ ''نصیر اور خدیجہ''، راشد الخیری، مطبوعہ، مخزن لاہور، ماہ دسمبر ۱۹۰۳ء

۲۔افسانہ ''بدنصیب کا لال''، راشد الخیری، مطبوعہ، مخزن لاہور، ماہ اگست ۱۹۰۵ء

۳۔افسانہ ''دوست کا خط'' سجاد حیدر یلدرم، مطبوعہ، مخزن لاہور، ماہ اکتوبر ۱۹۰۶ء

۴۔افسانہ ''غربت وطن''، سجاد حیدر یلدرم، مطبوعہ، اردوئے معلی علی گڑھ، ماہ اکتوبر ۱۹۰۶ء

۵۔افسانہ ''نابینا بیوی'' سلطان حیدر جوش، مطبوعہ، مخزن لاہور، ماہ دسمبر ۱۹۰۷ء

پریم چند کا پہلا افسانہ ''عشق دنیا اور حب وطن'' زمانہ کانپور میں ماہ اپریل ۱۹۰۸ء میں شائع ہوا۔ اس اعتبار سے اردو کا پہلا افسانہ راشد الخیری کا ''نصیر اور خدیجہ'' ہے۔ نصیر اور خدیجہ خط کی تکنیک میں لکھا گیا ہے اور یہ تکنیک اس وقت تک یعنی انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل تک مغربی فکشن میں مقبول ہو چکی تھی۔ انگریزی ادب میں بقول مرزا حامد بیگ پہلی بار سیموئیل رچرڈسن نے اسی تکنیک میں اپنا تمثیلی قصہ ''پاملا'' لکھا تھا۔ دلچسپ حقیقت ہے کہ اردو مختصر افسانے کی تنقید کا آغاز بھی پریم چند سے ہی ہوتا ہے۔ پریم چند نے اپنے پہلے افسانوی مجموعے ''سوز وطن'' کے دیباچے میں مختصر افسانہ کے بارے میں جو خیالات ظاہر کیے ہیں ان میں افسانہ کی تنقید کے عناصر موجود ہیں۔ دراصل پریم چند نے ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۳۳ء تک افسانہ کے حوالے سے کئی

تنقیدی مضامین لکھے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر ارتضی کریم نے لکھا ہے:

''اردو افسانے پر تنقید کا آغاز نقادوں کی معرفت نہیں بلکہ خود افسانہ نگاروں کے ہاتھوں ہوا......اردو افسانہ پر تنقیدی نگارشات کے سلسلے میں بھی پریم چند کو اولیت حاصل ہے اس لیے کہ ان کے ذہن میں صنف افسانہ کی کوئی نہ کوئی تعریف رہی ہوگی۔اس کا کوئی اچھا یا برا، کم تر یا برتر معیار فن ضرور رہا ہوگا۔''(۳)

چنانچہ پریم چند کی بعض تحریریں اس سلسلے میں ہماری رہنمائی کرتی ہیں اور اردو افسانے کی تنقید کی تاریخ کو بیسویں صدی کے اوائل کی طرف لے جاتی ہیں۔مثلاً ''سوز وطن'' کا دیباچہ یا ''میں افسانہ کیوں لکھتا ہوں'' یا ''میرے بہترین افسانے'' یا ''ہماری قوت بیانیہ کا زوال'' جو ۱۹۰۸ء اور ۱۹۳۳ء کے دوران شائع ہوئے ان کے علاوہ ''مختصر افسانے کا فن'' اور ایک شخصی مقالہ ''راشد الخیری کے افسانے'' ۔یہ مضامین ابتدائی ضرور ہیں لیکن جہاں پریم چند کی تنقیدی اور فنی بصیرت کا پتہ دیتے ہیں وہیں افسانے کی تنقید کی بنیاد بھی استوار کرتے ہیں۔پریم چند نے یہ مضامین ایسے زمانے میں لکھے جب اردو افسانہ اپنی تعمیر کی منزلوں سے گزر رہا تھا۔اردو افسانہ کو فنی اور جمالیاتی اعتبار سے عروج پر پہنچانے کی ذمہ داری خود پریم چند ہی نبھا رہے تھے۔اس پورے دور میں افسانہ پر داستان نگاری اور قصہ گوئی کے اثرات غالب رہے۔صرف کرداروں اور واقعات کی پیش کش میں بادشاہوں اور وزیروں، شہزادیوں اور مافوق الفطری مخلوقات اور تصورات، حیران کن واقعات کی جگہ فرضی سماجی کردار اور واقعات لے رہے تھے۔اردو مختصر افسانہ، قصہ اور کتھا کے دائرے سے پورے طور پر باہر نہیں نکل سکا تھا۔ایسی حالت میں افسانہ کے بارے میں پریم چند کے خیالات اردو مختصر افسانہ کی تنقید کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔پریم چند نے اپنے ایک ابتدائی مضمون میں لکھا ہے:

''یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ کہانی کا سب سے بڑا مقصد تفریح ہے لیکن ادبی تفریح وہ ہے جس سے ہمارے نازک ذہنی احساسات کو تحریک ملتی ہے۔ہم صداقت، بے لوث خدمت، انصاف اور نیکی کا جو غیر ملوث عنصر ہے وہ جاگ اٹھتے ہیں۔''(۴)

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ پریم چند افسانہ کے بارے میں ایک آدرش وادی تصور رکھتے تھے۔

صداقت، خدمت، انصاف اور نیکی جیسے عناصر یا صفات کو بیدار کرنا وہ افسانے کا مقصد تصور کرتے تھے۔لیکن بیسویں صدی کی دوسری دہائی تک آ کر پریم چند کے فن (افسانہ نگاری) کی طرح ان کے نظریہ فن کا بھی ارتقا ہوتا ہے اور تب وہ اپنے زمانے کے اردو افسانہ کے حوالے سے زیادہ عملی خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اپنے ایک مضمون ''مختصر افسانے کا فن'' میں وہ لکھتے ہیں:

''موجودہ افسانہ تحلیل نفسی اور زندگی کی فطری مصوری کو ہی اپنا مقصد سمجھتا ہے اس میں تخیلی باتیں کم اور تجربات زیادہ ہوتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ تجربات ہی تخلیقی تخیل سے دلچسپ ہو کر کہانی بن جاتے ہیں۔''(۵)

افسانے سے متعلق پریم چند کے اس دوسرے اقتباس پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پریم چند جہاں پہلے اقتباس میں تفریح کو افسانہ کا بنیادی مقصد قرار دیتے تھے اور قاری کے اندر نیک اور صالح جذبات واحساسات کو بیدار کرنا افسانہ کا فرض منصبی سمجھتے تھے وہیں دوسرے اقتباس میں افسانہ کے لیے انسانی نفسیات اور سچے تجربات کے دلچسپ بیان پر زور دیتے ہیں۔ پریم چند کا دوسرا اقتباس ۱۹۳۰ء کے آس پاس کا ہے جب پریم چند کے علاوہ پنڈت سدرشن، مجنوں گورکھپوری اور نیاز فتح پوری وغیرہ نے افسانہ میں حقیقت نگاری کے علاوہ جذبات نگاری، رومانیت اور نفسیات نگاری کی ابتدا کر دی تھی اور اردو میں روسی، انگریزی اور فرانسیسی افسانوں کے ترجمے بھی شائع ہونے لگے تھے۔ظاہر ہے پریم چند کے فکروفن پر اس سارے منظرنامے کے اثرات مرتب ہو رہے تھے۔اسی لیے پریم چند نے اپنے مضمون ''مختصر افسانے'' کا فن میں آگے یہ بھی لکھا ہے کہ''اب کہانی لکھنے والوں میں موضوع، نقطہ نظر اور اسلوب کی ترقی ہونے لگی ہے،اس کی زمین اب اتنی بسیط نہیں......اب ہم افسانہ کی قدر واقعات سے نہیں کرتے۔ ہماری خواہش ہوتی ہے کہ کردار اور ان کی ذہنی رفتار سے واقعات پیدا ہوں۔''

پریم چند نے یہ باتیں اس وقت لکھی تھیں جب ابھی افسانہ کی تنقید کے حوالے سے کوئی باضابطہ کتاب تو کیا مضمون بھی سامنے نہیں آیا تھا۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح پریم چند اردو افسانہ کے پہلے کل وقتی اور معتبر معمار ہیں اسی طرح انھوں نے افسانہ کی تنقید کی تشکیل کی بھی سنجیدہ کوششیں کیں۔ اردو افسانہ میں نظریاتی فنی اور جمالیاتی محاسن کے جو ابتدائی عناصر سامنے آئے اس کا اندازہ، اردو کے چند اولین افسانوں یا افسانہ نما تحریروں

سے لگایا جاسکتا ہے۔

۱۹۳۵ء تک اردو کے بعض رسائل مثلا نیرنگ خیال، مخزن، زمانہ، ہمایوں، نگار، ادبی دنیا، اردو، العصر، عالمگیر اورادیب وغیرہ میں افسانہ اورافسانہ نگاروں کے بارے میں کبھی کبھار تنقیدی مضامین شائع ہوتے رہے لیکن ایسے تنقیدی مضامین کی تعداد پچیس تیس سے زیادہ نہیں ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس پورے دور میں اکثر ناقدین افسانہ(Short Story) کو مغربی Short Story کی ہیئت وتکنیک کی روشنی میں نہیں بلکہ مشرقی ''فسانہ'' یعنی قصہ یا کتھا کے طور پر دیکھتے تھے۔اسی لیے اس دور میں افسانے کی تنقید کے نام پر جو کچھ بھی لکھا گیا ان میں داستان، حکایت اور قصہ کی خوبیوں اور خامیوں کو ذہن میں رکھ کر ہی لکھا گیا۔اس عرصے میں شائع ہونے والے چند ایک تنقیدی مضامین کے عنوانات سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

۱۔فن قصہ نویسی، ضیاءالدین شمسی، مطبوعہ رسالہ ''ہمایوں'' ماہ مئی تا ماہ نومبر ۱۹۲۲ء

۲۔فن افسانہ نگاری، محمد عبدالقادر سروری، مطبوعہ رسالہ ''نگار''، ماہ دسمبر ۱۹۲۶ء

۳۔افسانہ کی ماہیئت، حسیب احمد صدیقی، مطبوعہ رسالہ ''ہمایوں'' ماہ نومبر ۱۹۲۷ء

۴۔کہانی کا سفر، ایم ضیاءالدین، مطبوعہ رسالہ ''نیرنگ خیال''، ماہ جون ۱۹۳۱ء

۵۔قصہ نویسی وقصہ خوانہ، محمد حسین ادیب، مطبوعہ رسالہ ''ہمایوں''، ماہ ستمبر تا ماہ نومبر ۱۹۳۲ء

۶۔افسانے کے لیے مواد کی فراہمی، محمد حسین ادیب، مطبوعہ رسالہ ''ہمایوں، ماہ جنوری ۱۹۳۳ء

۷۔عہد حاضر کے افسانہ نگار، جمورابی، مطبوعہ رسالہ ''نگار''، ماہ مئی ۱۹۳۴ء

۸۔افسانہ نویسی، عظیم بیگ چغتائی، مطبوعہ رسالہ ''ساقی''، ماہ جنوری ۱۹۳۵ء

۹۔افسانہ نگاری کی قسمیں، عظیم بیگ چغتائی، مطبوعہ رسالہ ''ساقی'' ۱۹۳۵ء

مذکورہ بالا مضامین میں افسانہ کے فنی و جمالیاتی تقاضوں کی بنیاد پر افسانہ اورافسانہ نگاری کے بارے میں غیر جانبدارانہ اور سائنٹفک تنقیدی رویہ نہیں ملتا بلکہ اس کی جگہ ذاتی تاثرات اور تعصّبات کا اظہار کیا گیا ہے۔اس لیے ایسے مضامین کو اردو افسانہ کی تنقید کے ابتدائی نقوش تو کہا جاسکتا ہے باضابطہ افسانوی تنقید کا نام دینا مشکل ہے پھر بھی اردو میں افسانوی تنقید کی روایت کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیتے ایسے مضامین کی اہمیت سے انکار بھی نہیں کیا

جا سکتا ہے۔ اس دور یعنی ۱۹۳۵ء سے قبل کے افسانوں میں چوں کہ عام طور پر کردار نگاری اور واقعہ نگاری سے زیادہ زبان اور انشا پردازی پر زور دیا جاتا تھا اس لیے افسانے کی تنقید میں افسانے کی زبان و بیان پر خاص توجہ دی جاتی تھی لیکن ابتدا میں ہی بعض ناقدین نے افسانہ میں حقیقت پسندی کا رنگ بھرنے اور عام قارئین تک موضوع اور خیال کی آسان ترسیل کے لیے مفرس اور معرب زبان کے استعمال سے پرہیز کرنے پر بھی زور دیا ہے مثلاً نیاز فتح پوری نے آل احمد اکبر آبادی کے افسانہ ''احتساب'' کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا ہے:

> ''آل احمد صاحب کا یہ افسانہ فارسی اور عربی آمیز اردو کے بہترین نمونے کی حیثیت سے شائع کیا جا رہا ہے۔ ملک میں نوجوان کی ایک جماعت اسی ''اردوئے معلیٰ'' کو رائج کرنے پر مصر ہے۔ مگر ہمارا عقیدہ ہے کہ اس قسم کی اردو ہندوستان کی قومی زبان کی حیثیت کبھی نہیں حاصل کر سکتی۔''(۶)

لیکن ۱۹۳۵ء کے بعد چوں کہ اردو ادب میں حقیقت پسندی کا رجحان شروع ہو چکا تھا۔ مشہور افسانوی مجموعہ ''انگارے'' شائع ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ احمد علی کے افسانوں کا مجموعہ ''شعلے'' بھی منظر عام پر آ چکا تھا۔ ساتھ ہی پریم چند کا شاہکار افسانہ ''کفن'' بھی لکھا جا چکا تھا۔ ہندوستان میں تحریک آزادی اپنے شباب پر پہنچ رہی تھی دوسری جانب سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں وغیرہ ۱۹۳۵ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈال چکے تھے۔ ترقی پسند تحریک کا دور شروع ہو چکا تھا۔ لہٰذا ان حالات کا اردو شاعری اور افسانہ پر بھی اثر پڑا اور اردو شعر و ادب میں جہاں ایک طرف لسانی اور موضوعاتی تبدیلیاں رونما ہوئیں وہاں اردو تنقید کے رویہ اور طریقہ کار میں بھی جدت اور تازہ کاری پیدا ہوئی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں ہوئی جس کی صدارت پریم چند نے کی تھی۔ پریم چند نے اپنے صدارتی خطبے میں ادب کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ تاریخی اور معنی خیز جملہ کہا تھا ''ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا''۔

پریم چند نے اپنے افسانوں میں اپنے نظریئے کو برتا بھی۔ مشہور افسانہ نگار آل احمد اکبر آبادی نے پریم چند کے افسانوی مجموعے ''واردات'' کے حوالے سے ان کی افسانہ نگاری کی خصوصیات کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

''پریم چند کی توجہ زیادہ تر معاشرتی مسائل پر مرکوز رہی اور انھوں نے بالعموم ادنیٰ اور متوسط طبقہ کی زندگی کو پیش کیا ہے۔اس کتاب ''واردات'' کے دیکھنے سے مجھے دو خاص باتیں نظر آئیں۔۔۔زندگی میں بعض مسائل معمے کی صورت رکھتے ہیں جن کی موافقت میں جتنا کہا جا سکتا ہے اتنا ہی ان کی مخالفت میں مثلاً ایثار اور بقائے ذات کا مسئلہ یا حق اور ناحق کا مسئلہ، منشی جی ایسے مسائل اکثر پیش کرتے ہیں اور تصویر کے دونوں رخ پیش کر کے فیصلہ آپ پر چھوڑ دیتے ہیں۔''(۷)

خود پریم چند نے اپنے کئی ابتدائی مضامین میں اردو افسانہ اور افسانہ نگاروں کا تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہوئے ان کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیوں کی بھی نشان دہی کی ہے مثلاً اپنے ایک شخصی مقالہ ''راشد الخیری کے افسانے'' میں پریم چند نے لکھا تھا:

''ان کے (راشد الخیری) جتنے سوشل ناول اور افسانے ہیں وہ سب جوش، اصلاح سے لبریز ہیں۔ وہ استقلال سے بھی کام لیتے ہیں، نصیحتوں سے بھی اور اسلام کی تاریخ اور روایات اور شرعی احکام سے بھی، کاش ان کی آواز میں صور اسرافیل کی سی ہنگامہ خیزی ہوتی۔اس انہاک میں بعض اوقات ان کی تصانیف میں فنی خامیاں پیدا ہوگئی ہیں۔کبھی کبھی ایسا خیال ہونے لگتا ہے کہ یہ کسی خطیب کی اپیل ہے، کوئی ادبی تخلیق نہیں۔اکثر مصلح اور مفکر، ادیب پر غالب آ گیا ہے لیکن مولانا راشد الخیری حقائق سے اتنے قریب تھے اور ان سے اس درجہ متاثر ہوتے تھے کہ ان کا ذہن فنی اصولوں کو نظر انداز کرنے کے لیے مجبور ہو جاتا تھا۔''(۸)

۱۹۳۵ء تک پریم چند کے علاوہ بھی متعدد افسانہ نگاروں اور دانشوروں نے افسانے کی تنقید کی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔اس سلسلے میں ایک اہم نام پروفیسر عبدالقادر سروری کا ہے جن کی تصنیف ''دنیائے افسانہ'' اردو میں فکشن یا افسانوی ادب کے اصول وضوابط مرتب کرنے کی سنجیدہ اور قابل تعریف کوشش ہے۔حالاں کہ عبدالقادر سروری نے اپنی تصنیف میں مغربی افسانہ نگاروں اور مغربی افسانہ کے امتیازات کی باتیں

زیادہ کی ہیں اور وہ یہ مانتے ہیں کہ اردو میں ان کے عہد تک افسانہ کے فن پر زیادہ نہیں لکھا گیا ہے۔''دنیائے افسانہ'' کی اشاعت ۱۹۲۷ء میں عمل میں آئی ہے جس میں عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

> ''اردو زبان میں افسانوی ادب اور افسانے کے فن کے متعلق کسی قسم کا ادبی ذخیرہ موجود نہیں۔ وقتی ضرورت کے لیے اب تک جو کچھ لکھا گیا ان میں ضیاء الدین شمسی کا ''قصہ نویسی'' سے متعلق ایک طویل مقالہ ہے جو ''ہمایوں'' ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا ہے۔''(۹)

عبدالقادر سروری کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ ملک کے بدلتے ہوئے سماجی و ثقافتی منظرنامے میں افسانوی ادب کو بھی زیادہ سے زیادہ فطری اور حقیقت پسندانہ ہونا چاہیے۔ دراصل عبدالقادر سروری کے سامنے مغرب کا افسانوی ادب تھا جس میں زندگی کی ترجمانی کی جارہی تھی کہ مغربی معاشرے کی خوبیاں اور خامیاں کھل کر سامنے آرہی تھیں اور اس کے اثر سے مغربی معاشرہ کو اپنی اصلاح اور تعمیر میں مدد بھی مل رہی تھی۔ اسی لیے عبدالقادر سروری محض تفریح اور وقت گذاری کے لیے افسانوی ادب کی تخلیق کے حق میں نہیں تھے۔ ان کی رائے میں اردو افسانہ کو ایک تعمیری روپ دینے کے لیے مغربی افسانہ کے فنی اصول و قواعد کی پیروی ضروری ہے۔ عبدالقادر سروری نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

> ''اس کی ضرورت ہے کہ افسانوں کے ساتھ ساتھ خود افسانہ نگاروں کے فن کی طرف بھی توجہ کی جائے اور اردو زبان میں بھی وہی اصول اور قواعد مروج کیے جائیں جو مغربی زبانوں میں مروج ہیں۔''(۱۰)

عبدالقادر سروری نے ''دنیائے افسانہ'' میں ناول اور افسانہ دونوں اصناف پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان کے ذہن میں مغربی ناول اور افسانہ تو تھے ہی لیکن وہ اردو ناول اور افسانہ پر مغربی ناول اور افسانہ کے ساتھ ساتھ مشرق کے افسانوی ادب کو ذہن میں رکھ کر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ ناول کی طرح افسانہ میں بھی ملک اور معاشرہ کے نئے ماحول، نئے حالات کی روشنی میں سچے واقعات اور کرداروں کی پیش کش پر زور دیتے ہیں۔ اور واضح لفظوں میں لکھا ہے کہ ''قدیم افسانہ نگاری کا اصول تصوریت (Idealism) تھا اور موجودہ افسانے حقیقت

(Realism) کے اصول پر لکھے جاتے ہیں'' ۔اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سروری نے آج سے تقریباً سو سال یعنی ۱۹۲۷ء تک خود پریم چند کا فن افسانہ نگاری ابھی ترقی کی منزلوں کو طے ہی کر رہا تھا۔

اردو کے انقلابی افسانوں کا مجموعہ ''انگارے'' ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا اور احمد علی کے مغربی افسانوں کے معیار کے افسانوں کا مجموعہ ''شعلے'' ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا لیکن ۱۹۳۰ء کے آس پاس تک آ کر پریم چند کے کئی افسانے شاہکار کا درجہ حاصل کر چکے تھے۔ان کا غیر معمولی شاہکار ''کفن'' بھی ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔''انگارے''، ''شعلے'' اور ''کفن'' کی اشاعت کے بعد اردو افسانہ میں جہاں فنی و تکنیکی ،لسانی و موضوعاتی اعتبار سے اجتہادی تبدیلیاں رونما ہوئیں وہیں افسانہ کی تنقید میں بھی نئے امکانات پیدا ہوئے۔چوں کہ ۱۹۳۵ء تک آ کر ایک طرف تو برطانوی حکومت کے خلاف تحریک آزادی اپنے شباب پر پہنچ رہی تھی وہیں دوسری جنگ عظیم کے آثار بھی نمایاں ہونے لگے تھے اور غلام کمزور اور ترقی پذیر ملکوں میں آزادی اور بیداری کی بھی شروعات ہو رہی تھی عالمی سطح پر، ادیب اور دانشور انسان اور انسانیت کے تحفظ، انصاف اور امن وخوشحالی کے لیے آواز بلند کرنے لگے تھے۔اسی دوران ہندوستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا اور ترقی پسند تحریک کی شروعات ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء کے بعد ایک طرف جہاں حقیقت پسندانہ اور انقلابی افسانے بڑی تعداد میں لکھے جانے لگے خاص طور پر پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، غلام عباس، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو اور خواجہ احمد عباس وغیرہ نے شاہکار افسانے تخلیق کیے وہیں وقار عظیم، مجنوں گورکھپوری، علی عباس حسینی، صلاح الدین احمد، احتشام حسین، اختر اورینوی، ممتاز حسین، محمد حسن عسکری اور احسن فاروقی وغیرہ نے افسانہ کے فنی و جمالیاتی تقاضوں اور امکانات کے حوالے سے مضامین لکھ کر اردو میں افسانے کی تنقیدی روایت کو ایک نیا معیار بھی بخشا اور اس کی رفتار بھی تیز کی لیکن ۱۹۳۵ء تک افسانہ کے بارے میں جو تنقیدی مضامین لکھے گئے ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔

یہ مضامین بھی زیادہ تر اس طرح لکھے گئے ہیں کہ ان سے قصہ کہانی کی تمام قسموں کا ذکر کیا گیا ہے مثلاً داستان، حکایت مثنوی اور منظوم قصہ وغیرہ۔لیکن چند ایک مضامین میں قصہ کہانی یا افسانہ کا رشتہ مغربی مختصر افسانہ کے فنی، ہیئتی اور جمالیاتی تقاضوں سے جوڑنے کی کوشش ضرور کی گئی ہے اور ایسے ہی مضامین میں افسانے کی تنقید بھی بڑی حد تک نظر آتی ہے اس ضمن میں عبدالقادر سروری کی تصنیفات ''دنیائے افسانہ'' ۱۹۷۲ء اور ''کردار اور

افسانہ'' ۱۹۲۹ء کے علاوہ بھی کچھ مضامین اہم ہیں جن کا تذکرہ ہم نے ابتدا میں کیا ہے جو رسالہ نیرنگ خیال، ساقی، نگار، ہمایوں وغیرہ میں ۱۹۳۵ء تک چھپتے رہے ہیں۔

اس دوران یعنی ۱۹۳۵ء میں ہی مجنوں گورکھپوی کی کتاب ''افسانہ اور اس کی غایت'' کے عنوان سے منظر عام پر آئی جو آج کے معیار کے مطابق بہت زیادہ اہم تو نہیں ہے پھر بھی مجنوں نے افسانہ میں پلاٹ، واقعات، کردار، عصری زندگی اور زمانہ کی پیش کش اور طرز بیان کی دلکشی وغیرہ کے برتاؤ کے بارے میں جو خیالات بیان کیے ہیں ان سے ان کی تنقیدی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ مجنوں گورکھپوری نے اپنی اس کتاب میں افسانہ نگاری کے اصول و شرائط مقرر کرنے کی کوشش کی ہے جو ایک نقاد کا فرض ہوتا ہے۔ لیکن چوں کہ مجنوں گورکھپوری ترقی پسند نظریہ کے حامی تھے اس لیے وہ اپنے ماحول اور معاشرہ کے مسائل اور حقائق کی پیش کش کو افسانہ کے لیے لازمی قرار دیتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری نے واضح لفظوں میں لکھا ہے کہ:

> ''ایسے فن پارہ کی ادب عالیہ میں کوئی جگہ نہیں ہے جن میں زندگی کے متعلق افسانہ نگار کا کوئی نقطہ خیال نہ ہو۔'' (۱۱)

لیکن مجنوں گورکھپوری افسانہ میں نظریہ حیات کی پیش کش پر زور تو دیتے ہیں پھر بھی کہتے ہیں کہ نظریہ حیات فلسفیانہ انداز میں نہیں پورے فن کارانہ مہارت کے ساتھ پیش کرنا ضروری ہے۔ کیوں کہ فن کارانہ مہارت کے بغیر افسانہ، افسانہ نہیں بن سکتا۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے مجنوں گورکھپوری نے عالمی شہرت کے مالک جانے مانے تاریخ ساز مغرب کے معروف افسانہ نگاروں کے افسانوں کی فنی خوبیوں کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب تک افسانہ میں ان کے افسانوں کی جیسی خوبیاں نہیں ہوں گی افسانہ معیاری نہیں ہوسکتا اور افسانہ میں نظریہ حیات، واقعات اور کردار نگاری کے لیے مجنوں گورکھپوری، ماحول اور معاشرہ کے حوالے سے جزئیات نگاری پر توجہ دینے کی ضرورت پر بھی زور دیتے ہیں اور اسلوب و اظہار کو بامعنی، مسرت بخش اور بصیرت افروز بنانے پر بھی اصرار کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ادب میں اسلوب اور اظہار پر ہی فن پارے کی اہمیت اور انفرادیت کا انحصار ہوتا ہے۔

اس طرح بحیثیت مجموعی عبدالقادر سروری اور مجنوں گورکھپوری نے تقسیم ملک سے پہلے ہی اردو افسانہ کی

تنقید کی روایت کو بڑی حد تک مستحکم کر دیا تھا۔ ۱۹۴۷ء سے قبل چوں کہ برصغیر ہندوستان کا پورا معاشرہ، جدوجہد آزادی میں مصروف تھا یا پھر کانگریس اور مسلم لیگ کی سیاست کے سبب فرقہ واریت کا جو بخار پورے معاشرے پر چڑھ رہا تھا، فسادات اور گمشدگی کا جو ماحول پیدا ہو رہا تھا اس کا اثر ادیبوں پر بھی پڑا۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء تک اور اس کے بعد بھی دو چار برسوں تک اردو ادب پر جمود طاری رہا۔ تخلیقی ادب کی رفتار بے حد سست ہوگئی اور اس کے نتیجے میں تنقیدی تحریریں بھی برائے نام ہی سامنے آئیں۔

۱۹۴۷ء کے آس پاس بڑے پیمانے پر ہونے والے ہندو مسلم سکھ فسادات، لوٹ مار، اغوا اور قتل و غارت گری کے واقعات نے جیسے ادیبوں اور دانشوروں پر سکتہ طاری کر دیا۔ لیکن پھر ادیب خاص طور پر افسانہ نگاروں نے ہی اپنے افسانوں کے ذریعہ فرقہ وارانہ منافرت ختم کرنے، ہجرت کو روکنے اور امن و امان قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں جب دونوں آزاد ممالک کی ترقی اور خوشحالی کے نئے دور کا آغاز ہوا۔ چنانچہ فسادات، ہجرت، مشترکہ تہذیب اور قومیت کے موضوعات پر ہزاروں افسانے لکھے گئے اور افسانہ سے متعلق متعدد تنقیدی کتابیں بھی سامنے آئیں۔

اس سلسلے میں کئی نام سامنے آئے ہیں لیکن اردو میں افسانے کی تنقید سے متعلق سید وقار عظیم کی سب سے مقبول اور تفصیلی تصنیف ''داستان سے افسانے تک'' ۱۹۶۰ء ہے۔ وقار عظیم کی یہ کتاب اردو میں فکشن کی اشاراتی تاریخ بھی ہے۔ تذکرہ بھی، تحقیق و تنقید بھی ہے۔ وقار عظیم نے اپنی اس تصنیف میں اردو افسانہ کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے مغرب مختصر افسانہ کے آغاز و ارتقا کا جائزہ لیا ہے اور افسانہ سے متعلق مغربی افسانہ نگاروں اور نقادوں کی تعریفوں اور وضاحتوں کی تفصیل درج کرتے ہوئے اردو میں افسانے کی روایت کے حوالے سے تجزیہ و تفہیم اور تشریح و تعبیر کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔

اردو افسانے کی تنقید کے حوالے سے آج بھی وقار عظیم کی کتاب ''داستان سے افسانے تک'' حوالے کی ایک اہم کتاب تصور کی جاتی ہے۔ حالاں کہ اس کتاب میں جن افسانوں اور افسانہ نگاروں کا ذکر ہے ان میں سے چند ایک کو چھوڑ کر بقیہ سب کے سب ماضی کا حصہ بن چکے ہیں۔ اسی لیے پروفیسر قاضی عبدالستار نے اپنے ایک مضمون میں وقار عظیم کی تصنیف ''داستان سے افسانے تک'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مصنف نے کسی خاص نقطہ نظر، معیار یا کسوٹی پر فن کاروں کے فن پاروں کو دیکھنے پرکھنے کے بجائے ان تمام افسانہ نگاروں کا ذکر کر دیا ہے جن کی یا تو بازار میں کھپت ہے یا جن کو مصنف ذاتی طور پر پسند کرتا ہے۔اس کتاب میں آپ کو دروں بینی اور ژرف نگاہی کہیں نہیں ملے گی جو صف اول کے نقادوں کی تصنیفات میں عام ہے۔''(۱۲)

وقار عظیم کی کتاب میں افسانے کے حوالے سے دس مضامین شامل ہیں:

۱۔ داستان سے افسانے تک ۲۔ داستانی عہد کی کہانیاں ۳۔ ہمارے مختصر افسانے میں زندگی اور فن کا امتزاج ۴۔مختصر افسانے میں روایت اور جدت ۵۔مختصر افسانے کے پچیس سال ۶۔ پریم چند کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ۷۔منٹو کا فن ۸۔تقسیم کے بعد منٹو کے افسانے ۹۔تقسیم کے بعد افسانہ ۱۰۔افسانہ نگاروں کی نئی پود۔

وقار عظیم نے اپنی کتاب میں ۱۹۶۰ء تک کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور پہلی بار داستان اور ناول سے الگ افسانہ کی منفرد فنی، ہیئتی اور جمالیاتی انفرادیت پر روشنی ڈالی ہے۔ان کے مطابق:

''افسانہ کہانی میں پہلی مرتبہ وحدت کی مظہر ہے۔کسی ایک واقعے ایک جذبے، ایک احساس، ایک تاثر، ایک اصلاحی مقصد، ایک رومانی کیفیت کو اس طرح کہانی میں بیان کرنا کہ وہ دوسری چیزوں سے الگ نمایاں ہو کر پڑھنے والے کے جذبات واحساسات پر اثر انداز ہو، افسانہ کی وہ امتیازی خصوصیت ہے جس نے اسے داستان اور ناول سے الگ کیا ہے۔''(۱۳)

وقار عظیم نے ہی سب سے پہلے ''کفن'' کو ایک مثالی افسانہ قرار دیا۔ان کے خیال میں پریم چند کا افسانہ ''کفن' ' ایسا شاہکار افسانہ ہے جسے مغربی افسانوں کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔اس کے ساتھ ہی وقار عظیم نے ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک کے زمانے کو اردو مختصر افسانے کا عہد زریں قرار دیتے ہوئے بتایا ہے کہ اس عرصے میں علی عباس حسینی، کرشن چندر، منٹو اور بیدی، اختر اورینوی اور غلام عباس سے لے کر قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور وغیرہ نے اردو افسانے کو عروج پر پہنچایا ہے۔

وقار عظیم نے افسانہ کے لیے مقصدیت اور زندگی کے جھیلے ہوئے حقائق کی ترجمانی کو لازمی قرار دیا۔اس اعتبار سے وقار عظیم نے پہلی بار،عبدالقادر سروری اور مجنوں گورکھپوری کے مقابلے میں کہیں زیادہ پختہ تنقیدی شعور کا ثبوت دیا ہے۔وقار عظیم نے ۱۹۶۰ء سے قبل سامنے آنے والے افسانہ نگاروں میں انتظار حسین کے حوالے سے اردو افسانہ کے شاندار مستقبل کی بشارت بھی دی تھی اور واقعی انتظار حسین نے آگے چل کر یہ ثابت کر دیا کہ اردو افسانہ کسی بھی طرح دوسری زبانوں کے افسانوں سے پیچھے نہیں ہے۔اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ وقار عظیم نے اردو میں افسانے کی تنقید کا ایک معیار قائم کیا جسے بعد کے ناقدین پروفیسر قمر رئیس،شکیل الرحمٰن،ممتاز شیریں،جعفر رضا،ش اختر اور کئی دوسرے ناقدین نے بڑی کامیابی کے ساتھ آگے بڑھایا۔قمر رئیس نے اپنی مشہور تصنیف ''پریم چند:شخصیت اور کارنامے'' میں افسانے کی تنقید کے بہترین نمونے پیش کیے ہیں۔

قمر رئیس نے افسانہ اور ناول اور ادب سے متعلق پریم چند کے مضامین بھی یکجا کر کے ''ادب کی غرض و غایت'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع کرایا۔''ادب کی غرض و غایت'' دراصل انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس منعقدہ ۱۹۳۶ء میں پریم چند کے خطبہ صدارت کا عنوان تھا۔قمر رئیس نے پریم چند کی شخصیت افسانہ نگاری اور ناول نگاری پر لکھے گئے مضامین کا ایک انتخاب بھی ''پریم چند شخصیت اور کارنامے'' کے عنوان سے شائع کیا تھا۔اس کتاب میں فراق گورکھپوری،علی جواد زیدی،آغا عبدالمجید،عبدالماجد دریابادی،شکیل الرحمٰن اور مسعود حسین خان کے مضامین شامل ہیں۔ان مضامین میں شکیل الرحمٰن کا مضمون ''پریم چند کے افسانوں میں المیہ کردار'' تنقیدی اعتبار سے بے حد اہم مضمون ہے جس میں افسانے کی تنقید کی نئی جہات سے روشناس کراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ملک کی تقسیم کے بعد جس نقاد نے کچھ مضامین کے ذریعہ ہی اردو میں افسانے کی تنقید کے معیار کو بلند سے بلند تر کیا وہ اردو کی پہلی خاتون تنقید نگار ممتاز شیریں ہیں جنھوں نے بذات خود افسانے بھی لکھے ہیں۔لیکن اردو میں ان کی پہچان ان کے مضامین کے مجموعے ''معیار'' کی وجہ سے ہے۔ممتاز شیریں نے زیادہ تر مضامین اردد افسانہ،اردو ناول اور سعادت حسن منٹو کے موضوعات پر لکھے ہیں۔افسانے کی ہیئت وتکنیک کے تقاضوں اور اردو افسانہ میں ان کے برتاؤ کی روایت اور اجتہاد کی ضرورت پر سب سے پہلے ممتاز شیریں نے ہی قلم اٹھایا ہے۔

ممتاز شیریں کا مضمون ''تکنیک کا تنوع'' افسانے کی تنقید کے تعلق سے ایک شاہکار تنقیدی تحریر مانی جاتی

ہے۔اس ایک تحریر نے ہی انھیں پوری اردو دنیا میں فکشن کے ممتاز ناقد کے طور پر مشہور کر دیا تھا۔ممتاز شیریں کی کتاب ''معیار'' ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی جس میں مندرجہ ذیل مضامین شامل ہیں:

۱۔تکنیک کا تنوع

۲۔مغربی افسانے کا اثر اردو افسانے پر

۳۔طویل افسانہ کی صنفی حیثیت

۴۔۱۹۴۳ء کے افسانے

۵۔منٹو،نوری نہ ناری

۶۔منٹو،عورت اور گناہ

ممتاز شیریں افسانے کے تکنیکی،ہیئتی،لسانی،موضوعاتی اور جمالیاتی تقاضوں اور امکانات کے بارے میں کتنی گہری آگہی اور کتنا پختہ تنقیدی شعور رکھتی تھیں،اس کا اندازہ ان کے پہلے مضمون ''تکنیک کا تنوع'' کے اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے:

> ''افسانے کی تعمیر میں تکنیک ایک بڑا ضروری جزو ہے۔لیکن مکمل اور خوبصورت چیز اسی وقت تیار ہوگی جب مواد اچھا ہو،اسلوب تحریر اور بیان اچھا ہو،فن کار ان سب کو اچھی طرح گوندھے کہ یہ ہم آہنگ ہو جائیں اور اسے صناعی اور چابکدستی سے ڈھال کر ایسی مکمل اور خوبصورت شکل دے کہ مواد اور ہیئت میں کوئی فرق نظر نہ آئے اور ہم پڑھ کر یہ کہیں کہ اس افسانے کا مواد یا تکنیک اچھی ہے بلکہ یہ کہہ اٹھیں 'یہ افسانہ اچھا ہے۔'' (۱۴)

ممتاز شیریں نے اردو کے ناقدین کی اس عام رائے سے اختلاف کیا ہے کہ اردو افسانہ،مغربی افسانہ سے بہت پیچھے ہے۔ممتاز شیریں نے اردو کے افسانوی سرمایے کا ہر ہر پہلو سے گہرا تجزیاتی مطالعہ کیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ اردو افسانہ نے پچاس ساٹھ سال کے عرصہ میں ہی جو معیار حاصل کر لیا تھا اسے وہ باعث فخر تصور کرتی تھیں۔اسی لیے انھوں نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا ہے کہ:

''ہمارے افسانے کا دائرہ ہر لحاظ سے وسیع ہے، تکنیک، رجحان، موضوع و مواد ہر اعتبار سے ہمارا افسانہ متمول اور متنوع ہے۔ اگر معاشرتی حقیقت نگاری میں ''آخری کوشش'' (حیات اللہ انصاری)، ''کلیاں اور کانٹے'' (اختر اورینوی)، ''زندگی کے موڑ پر'' (کرشن چندر) کے سے شاہکار ہیں تو رمزیت میں ''قیصر خانہ'' (احمد علی) کا سا نہایت گہرا اور مکمل افسانہ۔ ایک طرف ''بابو گوپی ناتھ'' (منٹو) اور ''حرامجادی'' (حسن عسکری) کے سے انفرادی افسانے ہیں تو دوسری طرف ''آنندی'' (غلام عباس) کا سا اجتماعی افسانہ۔ ایک طرف بلونت سنگھ کے رنگ کا سا ہلکا پھلکا نازک افسانہ ہے جس میں محض رنگوں کے امتزاج اور تبدیلی کے ذریعہ مختلف چھوٹے چھوٹے تاثرات یکجا کیے گئے ہیں۔ اور قدرت اللہ شہاب کا ''تلاش'' جس میں صرف ایک موڈ کی گرفت ہے تو دوسری طرف ''ان داتا'' (کرشن چندر)، ''مدن سیتا اور صدیاں'' (عزیز احمد) اور ''میگھ ملہار'' (ممتاز شیریں) وغیرہ افسانے ہیں جو ایک وسعت گہرائی، عظمت وشان اور ایک Collasus کا احساس دلاتے ہیں۔ ان افسانوں کو پڑھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ ہمارا افسانہ کسی بھی لحاظ سے مغربی افسانے سے پیچھے رہ گیا ہے۔'' (۱۵)

۱۹۶۰ء کے بعد نئے تہذیبی تناظر میں افسانہ نگاروں کو نئے مسائل مہمیز کرنے لگے۔ علامتی اور تجریدی کہانیوں کے رجحان کو فوقیت حاصل ہوئی۔ علامت کو جذبے اور فکر کی شدت کے اظہار کا موثر وسیلہ تصور کیا جانے لگا، نئے اسالیب اور تکنیک کے استعمال اور نئے تجربات کو برتنے کی دھن میں افسانے کے روایتی انداز سے گریز کرنا پڑا۔ پلاٹ کے ترتیبی نظام کو توڑنے میں انہی تکنیکوں کا رول رہا ہے۔ لیکن یہ وقتی ضرورت کے تحت ہوا کیوں کہ انسانی نفسیات، لاشعور کی پیچیدگیوں کو پیش کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی طریقہ تو اپنانا تھا۔ لہذا افسانے میں آغاز، وسط، انجام کا تصور جاتا رہا اور افسانے سے منضبط و مربوط پلاٹ کی بے دخلی کا عمل شروع ہوا۔ اس سلسلے میں حامدی کاشمیری رقم طراز ہیں:

''الغرض نئے افسانہ نگاروں نے پلاٹ کی منطقی ترتیب، کلائمکس اور غیر متوقع اختتامیہ کو خیر باد کہہ دیا وہ ایسے پلاٹ کی تشکیل دیتے ہیں جو منطقی لحاظ سے انمول اور بے جوڑ کہلائے جاسکتے ہیں۔ ایسے پلاٹ شعور و آزاد تلازمہ خیال کی تجزیاتی تکنیک کے مظہر ہیں۔ اس طرح سے پلاٹ کی منطقیت کے بجائے واقعات کے بہاؤ اور کلائمکس کو واقعات کے نقطہ آخر کے بجائے کلی فضا کی تاثر انگیزی سے مربوط کرنے کے رجحان کو تقویت ملی۔ منٹو کے ''پھندنے'' اور کرشن چندر کے ''غالیچہ'' کے بعد متعدد ایسے افسانے لکھے گئے جو افسانوی تکنیک کی اس تبدیلی کے آئینہ دار ہیں۔''(۱۶)

اس جدیدیت کے رجحان کے تحت اردو میں افسانہ کی بجائے، علامتی افسانہ، تجریدی افسانہ، اینٹی اسٹوری، پلاٹ لس افسانہ وغیرہ پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ حالاں کہ ادب میں تجربہ معیوب نہیں اور نہ ہی روایت سے انحراف کو غلط قرار دیا جاسکتا ہے بلکہ نئے تجربوں سے ہی ادب آگے بڑھتا لیکن جدیدیت کے رجحان کے تحت علامت نگاری اور تجریدیت کے نام پر فیشن پرستی زیادہ ہوئی۔ اس لیے ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۰ء و ۱۹۸۵ء تک انتظار حسین، جوگندر پال، رشید امجد، غیاث احمد گدی، سریندر پرکاش، ظفر اوگانوی، اقبال مجید، سلام بن رزاق، حسین الحق، شوکت حیات وغیرہ کچھ ایسے ہی افسانہ نگار ہوئے ہیں جنھوں نے علامتی، استعاراتی اور اساطیری اسالیب میں بھی عمدہ افسانے لکھے۔ اس دوران افسانے کی تنقید کے حوالے سے، افسانے کی روایت، اردو افسانہ اور جدیدیت، پریم چند کی روایت، افسانہ میں پلاٹ اور کہانی پن کی اہمیت جیسے موضوعات پر سینکڑوں کتابیں اور مضامین لکھے گئے۔

اس ضمن میں خاص طور پر ''افسانے کی حمایت میں'' (شمس الرحمٰن فاروقی)، ''افسانہ حقیقت سے علامت تک'' (سلیم اختر)، ''اردو افسانہ روایت اور مسائل (گوپی چند نارنگ)، ''ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ'' (پروفیسر محمد صادق)، ''نیا اردو افسانہ: مسائل اور میلانات'' (قمر رئیس)، ''شناخت'' (ڈاکٹر اختر)، ''جدید افسانہ اور اس کے مسائل'' (وارث علوی)، ''علامتی افسانہ'' (مجید مضمر) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

عصر حاضر میں بالخصوص ۱۹۸۰ء کے بعد اردو افسانے کی تنقید کے حوالے سے جو اہم کتاب سامنے آتی ہے وہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کے مرتب کردہ مقالات کا مجموعہ ''اردو افسانہ: روایت اور مسائل'' ہے۔اس کتاب میں ایسے مضامین شامل ہیں جو اردو افسانے کی تفہیم وتنقید میں معاون ثابت ہو سکتے تھے۔جن میں ممتاز شریں کے مضامین ''ناول اور افسانے میں تکنیک کا تنوع'' اور اردو افسانے پر مغربی افسانے کا اثر'' قابل ذکر ہیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کتاب میں شامل مضامین کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصہ میں اردو فکشن کے معتبر ناقد آل احمد سرور، ممتاز شیریں، وزیر آغا اور شمس الرحمٰن فاروقی کے چھ مضامین شامل ہیں جن میں اردو افسانے کے فن وموضوع ہیئت وتکنیک اور روایت کے حوالے سے تجزیاتی گفتگو کی گئی ہے۔

دوسرا حصہ اردو افسانہ کے اہم بنیاد گزار پریم چند پر لکھے گئے مضامین شامل ہیں اور اس میں معروف دانشور احتشام حسین، گوپی چند نارنگ، حامدی کاشمیری، مسعود حسین اور شمیم حنفی کے ایک ایک مضمون شامل ہے۔ ان مضامین میں عہد پریم چند، ان کی افسانہ نگاری، ان کی ترقی پسندی اور حقیقت نگاری پر روشنی ڈالنے کے بعد ان کی اقدار کا تعین کیا گیا ہے۔تیسرا حصہ پندرہ مضامین پر محیط ہے جس میں ترقی پسند اردو افسانے کے معمار منٹو، کرشن چندر، بیدی، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کے فکری وفنی شعور کو موضوع بحث قرار دیا گیا ہے۔آخری اور چوتھا حصہ کل اٹھارہ مضامین پر مشتمل ہے جن میں جدید اردو افسانے کی تفہیم وتعبیر اور مسائل وامکانات کو پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

اردو ادب کی سماجیات کی اہمیت اردو کے کم وبیش تمام ناقدین نے کیا ہے۔ان میں ترقی پسند ناقدین احتشام حسین، سید محمد عقیل، شارب ردولوی کے علاوہ جدیدیت مابعد جدیدیت کے حامی دیگر ناقدین گوپی چند نارنگ نے اردو افسانے کی ساخت، کہانی اور بیانیہ وغیرہ کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''اس دور کی کسی اہم کہانی کو لیجیے جس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے خواہ وہ قرۃ العین حیدر کی ''ملفوظات حاجی گل بابا بیکتاشی'' ہو یا انتظار حسین کی ''کایا کلپ''، مین را کی ''وہ''، سریندر پرکاش کی ''بدوشک کی موت''، انور سجاد کی ''کونپل''، جوگندر پال کی ''رسائی''، خالدہ اصغر کی ''سواری'' یا بلراج کومل کی

''کنواں''، تو ایسی تمام کہانیوں میں یہ خوبی ملے گی کہ یہ علامتی و تمثیلی کہانی کے اعلیٰ ترین تخلیقی تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہیں اور ان میں بنیادی کہانی پن بھی ہے یعنی ان میں اپنی صنف بیانیہ کی پہچان بھی ہے۔ ان کہانیوں کو قطع نظر ان کے استعاراتی یا تمثیلی نظام یا تخلیقی معنویت کے ایک عام کہانی کے طور پر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ لیکن کتنی نئی کہانیاں اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔ میرے نزدیک کہانی سے کہانی کا اخراج غیر افسانوی عمل ہے اور اس کی مذمت کرنی چاہیے۔''(۱۷)

اسی طرح اردو افسانے کے تنقیدی سرمائے میں شمس الرحمٰن فاروقی کی متنازعہ تصنیف ''افسانے کی حمایت میں'' بھی اہمیت کا درجہ رکھتی ہے۔ افسانے کی تنقید سے متعلق یہ کتاب فاروقی کے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے جو ۱۹۸۲ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کتاب میں ۱۵ مضامین شامل ہیں جن میں سے نو مضامین میں افسانے کی نظریاتی تنقید سے متعلق گفتگو کی گئی ہے اور دیگر چھ مضامین میں پریم چند، انور سجاد، قمر احسن، بلراج کومل، یلدرم اور بلونت سنگھ کی شخصیت اور افسانہ نگاری پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے اس کتاب میں پہلی بار افسانہ میں بیانیہ کی نئی توضیح پیش کرتے ہوئے افسانے کی روایت کو رد کیا ہے اور افسانے کو تھرڈ کلاس صنف قرار دیا ہے۔ انھوں نے افسانوی روایت کی مخالفت اور جدید افسانہ کی حمایت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''آج کوئی ادیب ایسا نہیں ہے جو محض افسانہ نگاری کے بل بوتے پر زندہ ہو۔ افسانہ پہلے بھی کوئی بہت اہم صنف نہیں تھا اور آج تو ناول کا دوبارہ احیا ہو رہا ہے۔ اس لیے آج افسانے کی وقعت پہلے سے بھی کم ہے......دیکھیے ناول کے مقابلے میں افسانے کی وہی اہمیت ہے جو ہمارے یہاں غزل کے مقابلے میں رباعی کی ہے۔''(۱۸)

شمس الرحمٰن کی اس تنقیدی رائے کا جواب دیتے ہوئے فکشن کے معاصر نقاد ڈاکٹر ارتضیٰ کریم لکھتے ہیں:

''یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کرشن چندر ''شکست'' کی وجہ سے زندہ ہے یا اپنے افسانوں کے باعث، بیدی ''ایک چادر میلی سی'' کی وجہ سے جانے جاتے ہیں یا ''دانہ و دام'' وغیرہ بھی ان کی ادبی زندگی کو امر کرتے ہیں۔ عصمت کو ''لحاف'' نے زندہ رکھا ہے یا ''ٹیڑھی لکیر'' نے اور حد تو یہ ہے کہ جس ادیب کا نام لیتے لیتے ان کا حلق خشک ہوتا ہے اور جس ''پھندنے'' کو یہ جدید تر افسانے کی بنیاد ہی تصور نہیں کرتے بلکہ تسلیم کرتے ہیں اس ادیب منٹو نے کتنے ناول لکھے ہیں اور وہ کس بنا پر ادبی دنیا میں زندہ ہے؟......موپاساں اور چیخوف جو عالمی ادب میں اتنے شہرت یافتہ ہیں کیا ان کو یہ شہرت یافتہ ہیں۔ کیا ان کو یہ شہرت ناول کی وجہ سے ملی ہے؟'' (۱۹)

اسی طرح وارث علوی طنزیہ و مزاحیہ انداز میں شمس الرحمٰن فاروقی کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فاروقی ہزار دلائل کے ذریعہ افسانہ کو تھرڈ کلاس صنف ثابت کرتے ہیں۔ ان کی دلائل کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگاری آرٹ تو ہے ہی نہیں، سانڈے کا تیل بیچنے کی ایک قسم کی کوئی چیز ہے......فاروقی نے افسانہ نگاروں کے ہاتھ پاؤں توڑ دیئے۔ ان کے پاس سے فکشن کی روایت کا احترام چھین لیا۔ اس خود اعتمادی اور افتخار کو ختم کر دیا جو ہر فن کار کو اپنی صنف سخن پر ہوتا ہے۔'' (۲۰)

شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقیدی حیثیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن ماقبل جدید دور کے افسانوں کو رد کرنے کے ان کے رویے کو وہاب اشرفی، قمر رئیس، ارتضیٰ کریم اور وارث علوی وغیرہ جیسے ان کے معاصر ناقدین ان کے جذبے کو جدیدیت کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

عصر حاضر میں افسانے کی تنقید کو وسعت دینے والوں میں ایک اہم نام ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا ہے جو بیسویں صدی کے نصف آخر کی آٹھویں صدی سے لے کر اکیسوی صدی کی دوسری دہائی تک افسانوی تنقید کو مسلسل نئے فکر و خیال سے متعارف کرتے آ رہے ہیں۔ افسانے کی تنقید کے حوالے سے اب تک ان کی تین ضخیم کتابیں

''افسانے کا منظر نامہ (۱۹۸۳ء)''، ''افسانے کی روایت (۱۹۹۱ء)'' منظر عام پر آ چکی ہیں۔

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے اپنی کتاب ''افسانے کا منظر نامہ'' میں اردو افسانے کے ارتقائی سفر کا عہد بہ عہد جائزہ لیتے ہوئے افسانے کے ماضی، حال اور مستقبل پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ مصنف نے داستان اور افسانہ کے فنی و فکری پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور اس بات کا افسوس کیا ہے کہ آج افسانہ کا رشتہ داستان سے کٹ کر رہ گیا ہے۔ وہ داستان کو افسانے کے لیے ایک ایسی کڑی تصور کرتے ہیں جس سے کٹ کر آج اردو افسانہ بھیڑ میں کھوئے ہوئے بچے کی طرح تنہا رہ گیا ہے۔ داستانی روایت کو جدید افسانے کی بنیاد قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''آج ہمارا رابطہ اپنی داستان سے ٹوٹا ہوا ہے۔ ہم نے اپنی داستان سے لفظ کے طلسم کے ہاتھوں شکست کھائی ہے۔ اس طلسم کو توڑ کر اندر کے چھپے ہوئے معنی کی تلاش نہیں کی۔ داستان ہمارے افسانے کی وہ سپلائی لائن ہے جس کا شعور روایت کے ساتھ ہمارا رشتہ مستحکم کرتا ہے۔'' (۲۱)

ان کی دوسری کتاب ''افسانے کی روایت'' افسانے کی تنقید کے حوالے سے ان کا سب سے اہم تحقیقی اور تنقیدی کارنامہ ہے۔ یہ اردو افسانے کے آغاز یعنی ۱۹۰۳ء سے لے کر ۲۰۱۰ء تک یہ افسانے کی ایک ایسی جامع تاریخ ہے جسے ناقدین نے اردو افسانے کا انسائکلو پیڈیا قرار دیا ہے۔

افسانوی تنقید میں انور سدید کی تصنیف ''اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش'' (۱۹۸۳ء) عصر حاضر کے افسانے کی تنقید کی اگلی کڑی شمار کی جاتی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے آغاز سے لے کر دور حاضر تک کے ان تمام افسانوں کا تجزیہ پیش کیا ہے جن میں دیہاتیت دکھائی دیتی ہے۔ انور سدید کتاب کے ابتدا میں یوں تحریر کرتے ہیں:

> ''منشی پریم چند سے لے کر مرزا حامد بیگ تک اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش متعدد زاویوں سے ہوتی ہے۔ زیر نظر کتاب میں ان تمام زاویوں کو جمع کرنے اور ان پر ایک نظر ڈالنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔'' (۲۲)

شمیم حنفی کا نام بھی اردو فکشن بالخصوص افسانے کی تنقید کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔ ان کی کتاب

''کہانی کے پانچ رنگ (۱۹۸۳ء) ہے جس میں انھوں نے پریم چند، سجاد حیدر یلدرم، سعادت حسن منٹو، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کو اردو افسانے کے پانچ رنگوں سے منسوب کیا ہے۔ ان کے مطابق اردو افسانہ اب تک پانچ رجحانات سے گزرا ہے اور مذکورہ پانچوں فن کار اپنے اپنے عہد کے بدلتے ہوئے رجحانات کے نمائندے ہیں۔ یہ رجحانات حقیقت پسندی (پریم چند)، رومانیت (سجاد حیدر یلدرم)، ترقی پسند (سعادت حسن منٹو)، جدیدیت (قرۃ العین حیدر) اور مابعد جدیدیت (انتظار حسین) ہیں۔ یہ کتاب اردو کے نمائندہ افسانہ نگاروں کی تفہیم کے ساتھ ساتھ افسانے کے بدلتے رویوں کو سمجھنے میں بھی مددگار ثابت ہوتی ہے۔

اردو افسانے کی تنقید میں شہزاد منظر نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس حوالے سے ان کی دو تنقیدی کتابیں ''جدید اردو افسانہ (۱۹۸۲ء)'' اور ''علامتی افسانے کے ابلاغ کا مسئلہ (۱۹۹۰ء)'' شائع ہو چکی ہیں۔ پہلی کتاب میں افسانے کی اہمیت و معنویت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور شاید یہ پہلی کتاب ہے جس میں جدید افسانہ کے فنی اور تکنیکی امتیازات پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے اور ساتھ ہی ہندوستان اور پاکستان کے نمائندہ جدید افسانہ نگاروں کی خوبیوں اور خامیوں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ مصنف نے اپنی اس کتاب میں صنف افسانہ کے بنیادی امتیازات، روایات اور اجتہادات کے پس منظر میں اپنے خدشات کا بھی اظہار کیا ہے۔ خاص طور پر افسانویت یا کہانی پن کے بارے میں شہزاد منظر نے کھل کر اظہار خیال کیا ہے اور کہا ہے کہ کہانی پن افسانہ کا لازمی جز ہے۔

شہزاد منظر کی دوسری تصنیف ''علامتی افسانے کے ابلاغ کا مسئلہ'' افسانوی تنقید کے حوالے سے خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کتاب میں تئیس (۲۳) مضامین شامل ہیں جس میں اردو افسانے کے سامنے آنے والے مسائل اور مشکلات کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ شہزاد منظر کے خیال میں کامیاب افسانے ہمیشہ وہی ہوتے ہیں جن میں بیک وقت افسانویت، خیال افروزی اور فکری جہت تینوں چیزیں موجود ہوں لیکن افسانے کی تاریخ کے کسی بھی عہد میں انھیں ایسے افسانے نظر نہیں آتے جن میں بیک وقت تینوں خوبیاں موجود ہوں۔ کیوں کہ کسی عہد میں صرف موضوعات اور مقصدیت پر زور دیا گیا ہے تو کبھی اسلوب و تکنیک کے نئے تجربے کیے گئے ہیں۔

اسی طرح افسانے کی تنقید میں وارث علوی سے ہر کوئی واقف ہے۔ ان کی دو کتابیں ''جدید افسانہ اور اس کے مسائل (۱۹۹۰ء) اور فکشن کی تنقید کا المیہ (۲۰۰۰ء)'' اردو ادب میں بہت ہی اہمیت رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ

انھوں نے مشہور افسانہ نگاروں کرشن چندر، منٹو، بیدی، عصمت چغتائی، اوپندر ناتھ اشک، عزیز احمد، رام لعل، انتظار حسین، اقبال مجید، غیاث احمد گدی اور ترنم ریاض وغیرہ پر مضامین و کتاب اور مونوگراف لکھے ہیں جن سے ان کی افسانوی تنقید کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

''جدید افسانہ اور اس کے مسائل'' میں وارث علوی نے موجودہ افسانے کے درپیش مسائل کے بارے میں تبصرہ کیا ہے اور انھوں نے اپنی کتاب ''فکشن کی تنقید کا المیہ'' میں خاص طور پر شمس الرحمٰن فاروقی کی تصنیف ''افسانے کی حمایت میں'' کو اپنی تنقید کا ہدف بناتے ہوئے گفتگو کی ہے۔

عصر حاضر کے افسانوں کی تنقید کے حوالے سے پروفیسر صغیر افراہیم کا نام بھی قابل ذکر ہیں جنھوں نے افسانوی تنقید سے متعلق آدھا درجن کتابیں تحریر کی ہیں۔ جن میں ''اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل'' اور ''افسانوی ادب کی نئی قرأت'' خاص طور پر افسانے کی تنقید میں اہم درجہ رکھتی ہیں۔ ان کی پہلی کتاب ''اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل'' میں اردو افسانے کے آغاز سے لیکر ترقی پسند تحریک تک کے افسانوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں سب سے پہلے ادب کے چند ممتاز افسانہ نگاروں اور نقادوں کے خیالات سے استفادہ کرتے ہوئے افسانے کے معنی و مفہوم اور فنی اجزا پر بحث کی ہے۔ اس کے بعد حقیقت پسندانہ رجحانات اور رومانی میلانات کے زیر اثر ابھرنے والے افسانہ نگاروں پر خصوصی تبصرہ کیا ہے۔ کتاب کا بیشتر حصہ مختصر افسانہ کے بنیاد گزار پریم چند پر مشتمل ہے۔

افسانے کی تنقید کے حوالے سے پروفیسر قمر رئیس کی مرتب کردہ کتاب ''نیا افسانہ: مسائل اور میلانات'' جو دراصل مقالات کا مجموعہ ہے اور ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کا پہلا حصہ مشہور افسانہ نگار عصمت چغتائی کے لیے وقف کیا گیا ہے۔ جس میں کشمیری لال ذاکر، کے۔ کے کھلر، صغیر مہدی اور حسن عباس رضوی کے مقالات شامل ہیں۔ کتاب کے دوسرے حصہ میں بیشتر مضامین ان حضرات کے ہیں جو عصر حاضر میں اردو کے مشہور و معروف افسانہ نگار ہیں۔ جن میں سلام بن رزاق، ساجد رشید، سید محمد اشرف، پیغام آفاقی اور ابن کنول وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس حصے کے تمام مضامین جدید اور مابعد جدید افسانے کے فن و تکنیک، مسائل و امکانات اور تجربات و میلانات سے متعلق بحث کرتے ہیں۔

وہاب اشرفی کا شمار فکشن کے نمائندہ ناقدین میں ہوتا ہے انھوں نے درجنوں کتابیں اردو ادب کے حوالے سے لکھی ہیں لیکن افسانے کی تنقید کے حوالے سے ان کے مضامین ''اردو فکشن اور تیسری آنکھ''، ''معنی کی تلاش''، آگہی کا منظر نامہ وغیرہ اہم کارنامے ہیں۔ان کی کتاب ''راجندر سنگھ بیدی کی افسانہ نگاری'' افسانے کی تنقید کی خالص کتاب ہے جس میں انھوں نے بیدؔی کے افسانوی مجموعے ''اپنے دکھ مجھے دیدو'' میں شامل سبھی افسانوں کا فنی وتکنیکی تجزیہ کیا ہے۔

اسی طرح افسانے کی تنقید میں سید محمد عقیل کے اردو افسانے پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ''اردو افسانے کی نئی تنقید (۲۰۰۶ء)'' افسانے کی تنقید میں قابل قدر اضافہ ہے جسے ڈاکٹر طاہرہ پروین نے مرتب کیا ہے۔اس کتاب کو دو حصوں میں ترتیب دیا گیا ہے پہلے حصے میں سید محمد عقیل کے نظریاتی مضامین کو جگہ دی گئی ہے جن میں جدید اور جدید تر افسانہ اور افسانہ نگاروں کے مسائل اور کشمکش کو سامنے لایا گیا ہے۔کتاب کے دوسرے حصے میں مشہور افسانہ نگار پریم چند، کرشن چندر، بیدی، عصمت چغتائی، علی عباس حسینی، رشید جہاں اور یلدرم وغیرہ کی شخصیت اور کہانیوں کے تجزیاتی مطالعہ کو پیش کیا گیا ہے۔

سید محمد عقیل نے مذکورہ افسانہ نگاروں پر تبصرہ کرتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا ہے اور کہتے ہیں کہ موجودہ عہد اگرچہ افسانہ اور ناول کا دور ہے، آج میڈیا اور دوسرے بہت سے ایسے وسائل اور سہولیات موجود ہیں جو پچھلے افسانہ نگاروں کو میسر نہیں تھے لیکن پھر آج فکشن کا دور ہوتے ہوئے بھی پریم چند، کرشن چندر، بیدی، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، غلام عباس اور یلدرم وغیرہ جیسے افسانہ نگار کیوں پیدا نہیں ہو رہے ہیں؟ اگرچہ ان کا میدان شاعری کی تنقید ہے لیکن انھوں نے طنزیہ انداز میں فکشن بالخصوص افسانے کی تنقید کے حوالے سے کچھ مفید باتیں کہتے ہوئے نظر آتے ہیں:

> ''اس دور میں تنقید اور افسانہ نگاری دونوں ہی سے قارئین مطمئن نہیں کسی نے کہا کہ تنقید آج لکھی ہی نہیں جا رہی ہے تو کسی نے اس دور کو اچھے فکشن کی نایابی کا دور بتایا۔اس کشمکش میں ایک اور دلچسپ بات ہو رہی ہے کہ افسانہ نگار خود ناقد بن کر شاید بتانا چاہ رہے ہیں کہ افسانے کی تنقید ایسی لکھنی چاہیے۔دوسری

طرف ناقدین خود فکشن اور ناول نگار بن رہے ہیں۔شاید فکشن اور تنقید سے نا
آسودگی کے باعث ہی یہ سب کوششیں نظر آ رہی ہیں۔''(۲۳)

ڈاکٹر غضنفر اقبال کی کتاب ''اردو افسانہ ۱۹۸۰ء کے بعد(۲۰۰۶ء)'' عصری افسانہ اور تنقید پر ایک اہم کارنامہ ہے۔مصنف نے ۱۹۸۰ء کے بعد ابھرنے والے افسانہ نگاروں کو مابعد جدید قرار دیا ہے اور مابعد جدید رجحان کے تناظر میں اردو افسانے کے افق کو نئے رنگوں سے سجانے والے افسانہ نگاروں مثلاً مشرف عالم ذوقی، ساجد رشید، بیگ احساس،سید محمد اشرف، طارق چھتاری،خالد جاوید،احمد صغیر،ترنم ریاض،معین الدین اور عارف خورشید وغیرہ کو شامل کیا ہے۔اور مصنف نے ۱۹۸۰ء کے بعد مابعد جدید افسانے کے موضوع و مسائل، ہیئت و تکنیک، کردار نگاری اور زبان و بیان میں ہونے والی تبدیلیوں کی بھی نشان دہی کی ہے۔البتہ انھوں نے معاصر ناقدین کی آراء سے خوب استفادہ کرتے ہوئے موجودہ افسانے کے فنی وفکری مسائل و امکانات کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر فوزیہ اسلم کی کتاب ''اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات(۲۰۰۹ء)'' افسانے کی تنقید میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتی ہے۔اس کتاب میں اردو افسانے کو تاریخی پس منظر میں اسلوب اور تکنیک کے تجربوں کے ساتھ تفصیلی، تحقیقی اور تنقیدی تجزیات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔

ہمارے اکثر افسانوی ناقد یقین رکھتے ہیں کہ اردو افسانے کی تاریخ میں اسلوب و تکنیک کے تجزیے آزادی کے بعد اور خصوصاً ساٹھ کی دہائی کے بعد شروع ہوئے ہیں لیکن ڈاکٹر فوزیہ اسلم نے اپنی اس کتاب میں علامتی اور تجریدی انداز اور جدید اسلوبیات کی روایت کو پورے افسانے کے سفر میں دریافت کرنے کی کوشش کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ بیانیہ، داخلی خود کلامی، آزاد تلازمۂ خیال، علامتی، تجریدی، اظہاریت اور سرریلزم کی تکنیکوں جیسے خوبصورت تجربوں کا امتزاج ہمیں جدید اور مابعد جدید افسانے میں ہی نہیں ملتا بلکہ اس سے کئی سال قبل حقیقت پسندی اور رومانیت کے بعد ترقی پسند افسانہ بھی نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر احمد صغیر کی تصنیف ''اردو افسانے کا تنقیدی جائزہ ۱۹۸۰ء کے بعد(۲۰۰۹ء) بھی افسانے کی تنقید کے سلسلے سے اہم ہے۔اس کتاب میں سب سے پہلے داستانوی روایت کے پس منظر میں اردو افسانے کے آغاز و

ارتقاء کا جائزہ لیا گیا ہے اس کے بعد ۱۹۸۰ء سے قبل اور بعد کے افسانوں پر بحث کی گئی ہے۔ ساتھ ہی جدید و مابعد جدید افسانہ نگاروں پر تحقیقی و تنقیدی گفتگو کرتے ہوئے اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ کون سا افسانہ نگار کس رجحان یا حلقہ سے منسلک ہے۔ کتاب میں اردو افسانے کے بدلتے ہوئے موضوعات، تجربات اور اسلوب و تکنیک پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے۔

اسی طرح افسانوی تحقیق و تنقید کے حوالے سے ڈاکٹر خالد اشرف کا اہم کارنامہ ان کی دو اہم تصانیف ''فسانے منٹو کے اور پھر بیاں اپنا'' (۲۰۰۶ء) اور ''فسانے منٹو کے'' (۲۰۰۷ء) اپنی نوعیت کے لحاظ سے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں سعادت حسن منٹو کے نمائندہ تمیں افسانوں کا فنی و تکنیکی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

''منٹو اور عصمت کے افسانوں میں عورت کا تصور (۲۰۱۱ء)'' افسانے کی تنقید میں ایک دلچسپ اور اچھوتے موضوع کا اضافہ کرتی ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر پرویز شہریار کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ یہ کتاب اپنی نوعیت کی منفرد کتاب تصور کی جاتی ہے جس میں شہریار نے دونوں اہم فکشن نگاروں کے یہاں عورت کے تصورات اور نسوانی کرداروں کے فنی تقابل کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو افسانے کی بیشتر تنقید تاثراتی نوعیت کی ہے یا تعریف و تحسین سے عبارت ہے۔ چند نقادوں کو مستثنیٰ کر کے باقی نے موضوعی، شخصی یا شاعری کے پیمانوں پر افسانے کو پرکھا اور معیار متعین کیے۔ جب فکشن تنقید کا احتساب کر کے آرٹ کے مباحث اور اس کے فنی امکانات کو نشان زد کیا گیا تو اندازہ ہوا کہ افسانے کی تنقید نہایت کمزور اور محدود رہی ہے۔ اس کی وجہ پروفیسر عتیق اللہ کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

> ''افسانہ کی تنقید ایک مشکل مرحلہ ہے۔ مشکل یوں بھی کہ ہمارے نقادوں کی ذہنی تربیت شاعری کے ماحول اور شعری بوطیقا کے تحت ہوتی ہے۔ انھوں نے مغرب کے جن رجحانات اور اسالیب کا مطالعہ کر کے اردو شاعری اور خصوصاً جدید اردو شاعری پر ان کا اطلاق کیا ہے، افسانہ کے مذاق پر انھیں چست کرنا آسان نہیں ہے۔ جن لوگوں نے ڈھٹائی سے ادھر بھی ایک ترچھی نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے انھوں نے مغالطے زیادہ کیے ہیں اور افسانوی تنقید کی راہ آسان

بنانے کی کوشش کم۔افسانہ کی تکنیک اور اس کے اسلوب کا مسئلہ شاعری کے پیمانوں سے حل نہیں ہوگا۔شاعری نقاد کے لیے استعارے، علامت اور پیکر وغیرہ میں طلسم بے کراں سمویا ہوا ہے۔شعری تجرید کے ضمن میں یہ وسائل یقیناً کارآمد ہیں۔لیکن افسانہ اپنی فطرت میں شعری تجرید کی منطق سے ضد رکھتا ہے۔خالص علامتی، تمثیلی یا اسطوری قماش افسانے کو زیادہ راس نہیں آتی، نہ ہی خالص تمثیلی نثر کا وہ مسلسل عمل افسانہ کو زیادہ خوش آسکتا ہے۔''(۲۴)

☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔بحوالہ اردو فکشن کی تنقید، ناشر تخلیق کار پبلیشر ز،نئی دہلی ۱۹۹۶ء،ص ۲۴۷

۲۔ایضاً،ص ۲۶۱

۳۔ڈاکٹر مرزا حامد بیگ،اردو افسانے کی روایت،ناشر اکادمی ادبیات،پاکستان،اسلام آباد،۱۹۹۱ء،ص ۱۵۸

۴۔ایضاً،ص ۱۵۵

۵۔اردو فکشن کی تنقید،ارتضیٰ کریم،ص ۴۶۵

۶۔وقار عظیم،فن افسانہ نگاری،ناشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،نئی دہلی،۱۹۹۴ء،ص ۲۹

۷۔رسالہ ''ادبی دنیا''،لاہور،ماہ فروری ۱۹۳۰ء،ص ۱۴۳

۸۔ماہنامہ ''زمانہ''،کانپور،زمانہ پریس کانپور،ماہ جون ۱۹۳۸ء،ص ۷

۹۔مضامین پریم چند،مرتبہ عتیق احمد،ناشر یوپی اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۷ء،ص ۲۶۷

۱۰۔عبدالقادر سروری،دنیائے افسانہ،مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد ۱۹۲۷ء،ص ۴

۱۱۔ایضاً،ص ۱۰

۱۲۔افسانہ اور اس کی غایت،مجنوں گورکھپوری،بحوالہ اردو فکشن کی تنقید،ص ۴۰۴

۱۳۔تنقید کے بنیادی مسائل،مرتبہ آل احمد سرور،ناشر اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ،۱۹۹۸ء،ص ۱۹۱

۱۴۔وقار عظیم،داستان سے افسانے تک،ناشر ایجوکیشنل ہاؤس،دہلی،نیا اڈیشن ۲۰۰۱ء،ص ۱۶ و ۱۷

۱۵۔معیار،ممتاز شیریں،ناشر نیا ادارہ،لاہور ۱۹۶۳ء،ص ۱۲۳

۱۶۔اردو افسانہ،تجزیہ،حامدی کاشمیری،مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،نئی دہلی،۲۰۰۶ء،ص ۱۴

۱۷۔اردو افسانہ روایت اور مسائل،گوپی چند نارنگ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی ۲۰۰۱ء،ص ۱۷۴

۱۸۔افسانے کی حمایت میں،شمس الرحمٰن فاروقی،مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،نئی دہلی،۲۰۰۶ء،ص ۸۲

۱۹۔ڈاکٹرارتضی کریم ،اردوفکشن کی تنقید،ص۶۴،۶۳ ۴

۲۰۔وارث علوی،فکشن کی تنقید کا المیہ، جے کے آفسیٹ پرنٹرس، دہلی ،۱۹۹۲ء،ص۴۳

۲۱۔مرزا حامد بیگ، افسانے کا منظر نامہ، اردو رائٹرس ،گلڈ الہ آباد،۱۹۸۳ء،ص۱۵

۲۲۔انور سدید، اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش، اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد، ۱۹۹۷ء،ص۹،

۲۳۔سید محمد عقیل احمد، اردو افسانے کی نئی تنقید، انجمن تہذیب نو، الہ آباد ۲۰۰۶ء،ص۳۰۳

۲۴۔آٹھویں دہائی کے اردو افسانے کا کردار، پروفیسر عتیق اللہ، مشمولہ مضمون نیا افسانہ، نئے دستخط، مرتبہ نشاط شاہد، معیار پبلی کیشنز ۱۹۸۰ء،ص۳۲۱

☆☆☆

باب چہارم

داستان، ڈارمے اور تمثیل کی تنقید: ایک اجمالی جائزہ

(الف) داستان کی تنقید

اردو فکشن کی تنقید میں داستان کی تنقید بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔اس باب میں ہم داستان کی تنقید کا مختصر جائزہ لیں گے۔اب تک کی دریافت کے مطابق اردو کی پہلی نثری داستان ''سب رس'' ہے جسے ملا وجہی نے ۱۰۴۵ھ میں تصنیف کیا۔انیسویں صدی تک داستان کی تنقید بلکہ اردو تنقید پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔لیکن بیسویں صدی کے آغاز سے ہی داستان کی تنقید پر توجہ عام ہوئی اور اردو کی اہم داستانوں پر تنقیدی، تعارفی اور تبصراتی مضامین شائع ہونے لگے۔

داستان کی تنقید کے ابتدائی نقوش ہمیں ادبی رسائل و جرائد میں مضامین و مقالات کی شکل میں ملتے ہیں۔ عبدالحلیم شرر نے اپنے رسالے ''دلگداز'' میں ''ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ'' کے عنوان سے مضامین لکھے جنھیں بعد میں ''گزشتہ لکھنؤ'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا۔انھوں نے اسی رسالے کے شمارہ فروری ۱۹۱۵ء میں داستان کے فن پر بھی ایک مضمون شائع کیا۔اس مضمون میں داستان کی تنقید کے بنیادی نقوش دیکھے جاسکتے ہیں۔

داستان کی تنقید کے آغاز وارتقا کی تفہیم کے لیے ہمیں اس زمانے کے رسائل وجرائد کو کھنگالنا ہوگا جن میں فن داستان، اس کے اصول وضوابط اور اہم داستانوں پر تنقیدی مضامین شائع ہوئے ہیں۔لیکن اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اس زمانے میں داستانوں کے حوالے سے جو مضامین سپردقلم کیے گئے ہیں ان میں زیادہ تر تحقیقی مباحث شامل ہیں۔محققین نے داستانوں کے اصل متن کی دریافت اور اس کی اشاعت میں پائی جانے والی خامیوں پر تحقیق وتبصرہ کیا ہے۔اس طرح ان میں سے بیشتر مضامین میں تحقیقی مباحث پیش کیے گئے ہیں کہ یہ داستانیں اولین بار کب اور کس سنہ میں شائع کی گئی ہیں؟ ان کے اصل متن کا ماخذ کیا ہے؟ ماخذ مستند اور معتبر ہے کہ نہیں۔تاہم اسی کے ذیل میں کچھ تنقیدی مباحث بھی درآئے ہیں جن کی اہمیت وافادیت داستان کی تنقید کی تاریخ میں اپنی جگہ مسلم ہے۔

اردو کے چند اہم رسائل و جرائد جن میں داستان کی تنقید کے حوالے سے مضامین شائع ہوئے ہیں ان میں نیرنگ خیال، الناظر، دلگداز، معارف، نگار، ادبی دنیا اور معاصر خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ وہ مضامین جن کو اس سلسلے میں اولیت حاصل ہے ان میں سید محمد قادری کا سید حیدر بخش حیدری (اشاعت: اگست ۱۹۲۶ء) اور شیر علی افسوس (اشاعت: نومبر ۱۹۲۷ء) اور غلام محی الدین قادری زور کا فسانہ عجائب اور باغ و بہار (اشاعت: ۱۹۲۸ء) خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ اس کے بعد کے جن ناقدین نے داستان کی تنقید کی ہے ان میں مسعود علی ذوقی، محمد یاسین علی خاں، خواجہ عبدالرؤف عشرت، شاہد احمد دہلوی، محمد تقی خیال اور سید ابوالخیر کشفی کے نام آتے ہیں۔ لیکن ان افراد نے باقاعدہ طور پر داستان کی تنقید پر قابل ذکر مواد نہیں چھوڑا ہے۔

جب ہم عبدالحلیم شرر کے مضمون کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں انھوں نے داستان کے فنی لوازم کا تذکرہ بڑی آب و تاب سے کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے داستان کے فن کے لیے چار چیزوں کو لازم قرار دیا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

> ''داستان کے چار فن قرار پا گئے ہیں۔ رزم، بزم، حسن و عشق اور عیاری۔ ان چاروں فنون میں لکھنؤ کے داستان گویوں ایسے ایسے کمال دکھائے ہیں جن کا اندازہ بغیر دیکھے اور سنے نہیں ہوسکتا۔(۱)

عبدالحلیم شرر نے اردو داستانوں کے لیے جو لوازم قرار دیئے ہیں وہ بجا ہیں اور تقریباً تمام داستانوں میں موجود ہیں۔ ان کی یہ رائے مبنی بر صواب ہے لیکن اس رائے سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ صرف لکھنؤ کے داستان گویوں نے انھیں پورے طور پر برتا ہے اور اس میں نام کمایا بلکہ دبستان دلی کے اہم داستان گویوں نے بھی اسے پورے طور پر برتنے کے ساتھ ایسی داستانیں لکھیں جنھیں اردو ادب کی اہم داستانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ خود 'باغ و بہار' جس کا شمار اردو ادب کے شاہکاروں میں ہوتا ہے، کے خالق میر امن تھے جو دہلی کے رہنے والے تھے۔

بیسویں صدی کے نصف آخر میں داستان کی تنقید میں اہم ناقدین سامنے آتے ہیں۔ ان ناقدین میں کلیم الدین احمد، محمد حسن عسکری، گیان چند جین، وقار عظیم، سید ابوالخیر کشفی، ممتاز حسین، مسعود حسین خاں، نیر مسعود، وحید قریشی، محمود الٰہی، عبدالستار دلوی، رفیع الدین ہاشمی، سلیم اختر، سہیل احمد خاں، سہیل بخاری، رشید حسن خاں اور

حنیف نقوی کے نام پیش پیش ہیں۔ ان میں سے بعض ناقدین نے داستان کے فن اور اس کے اجزائے ترکیبی کو مکمل طور پر موضوع بحث بنایا ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر افراد کی کتابیں تحقیق و تدوین سے تعلق رکھتی ہیں، ان میں تنقیدی مواد بہت کم ہے۔ اس کے باوجود ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ ان کے بعد ہی داستان کی تنقید کی راہ ہموار ہوئی۔

فن داستان گوئی پر سب سے پہلے باقاعدہ طور پر کتاب لکھنے کا اعزا اردو کے اہم ناقد پروفیسر کلیم الدین احمد کو حاصل ہے۔ انھوں نے 'اردو زبان اور فن داستان گوئی' کے عنوان سے ۱۹۴۴ء میں کتاب شائع کی۔ جب یہ کتاب منظر عام پر آئی تو اردو داں طبقے کو مسرت آمیز حیرت ہوئی اور کچھ اطمینان بھی ہوا۔ پہلے پہل یہ کتاب سلسلہ وار رسالہ 'معاصر' میں شائع ہوتی رہی، بعد میں کتابی شکل میں منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب ۲۰۴ رصفحات پر مشتمل ہے۔ یہ داستان کے فن پر نہایت اہم کتاب ہے اسے ہم اردو داستان کے فن کی بوطیقا قرار دے سکتے ہیں۔ کلیم الدین احمد نے اس کتاب میں داستان کی تعریف، داستان کی تکنیک، طلسم ہوشربا، بوستان خیال، مختصر داستانیں اور منظوم داستانوں پر بڑی عمدہ اور عالمانہ گفتگو کی ہے۔ اس کے مطالعے سے ہمیں کلیم الدین احمد کے تنقیدی شعور سے واقفیت ہوتی ہے۔

کلیم الدین احمد کے نزدیک تنقید کا واسطہ ادراک سے ہے تاثرات سے نہیں۔ ان کی نثر میں قطعیت ہے، انھوں نے اپنی بات حوالوں اور مثالوں سے مدلل اور باوزن بنا کر پیش کی ہے۔ وہ اپنی کتاب کا آغاز یوں کرتے ہیں:

''داستان طرازی من جملہ فنون سخن ہے
سچ ہے کہ دل بہلانے کے لیے اچھا فن ہے

''ایک تھا بادشاہ، ہمارا تمہارا خدا بادشاہ، خدا کا رسول بادشاہ، چڑیا لائی مونگ کا دانہ، چڑا لایا چانول کا دانہ، دونوں نے مل کر کھچڑی پکائی۔'' ان یا ان جیسے لفظوں سے ان کہانیوں کی ابتدا ہوتی ہے جنہیں ہم بچپن میں بصد شوق سنتے ہیں اور جن سے ہماری زندگی زیادہ رنگین اور خوشگوار ہو جاتی ہے۔ انھیں

کہانیوں کے انتظار میں ہم دن کی گھڑیاں جلد جلد گزارتے ہیں اور شام کی آمد سے خوش ہوتے ہیں۔''(۲)

یہ سچ ہے کہ داستان گو کی یہ کوشش رہتی ہے کہ جو واقعات بیان کیے جائیں ان کو سن کر لوگ مبہوت ہو جائیں، قصے میں دلکشی کے اضافے کی غرض سے کچھ ایسی گتھیاں پڑ جاتی ہیں اور پھر کچھ ایسے انداز سے سلجھ بھی جاتی ہیں کہ پڑھنے والا ہکّا بکّا رہ جاتا ہے۔ سحر و ساحری، طلسم بندی اور طلسم کشائی و اسراریت کے ساتھ ساتھ جنسی لگاؤ کے واقعات بھی ہماری داستانوں میں کثرت سے موجود ہیں۔ تعلیم، اخلاق اور تہذیب نفس پر بھی زور دیا جاتا ہے۔ غرض داستان ہمارے دل میں ہمدردی، خوف، نفرت، محبت، جنسی حیرت اور استہزا کے جذبات پیدا کرتی ہے۔ داستان اپنے قدیمی رنگ کے ساتھ ساتھ شعوری ادب سے ہٹ کر ایک ایسا فنکارانہ نظام تخلیق کرتی ہے جس میں اتحاد عمل اور اتحاد اثر کی کوئی خاص ضرورت کا لحاظ نہیں ہوتا۔ پروفیسر کلیم الدین احمد نے اس کتاب میں داستان، داستان کی تکنیک اور اردو کی اہم منظوم و منثور داستانوں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مذکورہ اقتباس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک داستان ایک ماورائی کہانی ہے جو دل بہلانے کا ذریعہ ہے یا ایک ایسی خواب آور گولی ہے جس کے ذریعے انسان چند لمحوں کے لیے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر ایک ماورائی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ اسی کتاب میں داستان گوئی کی اہمیت اور اس کی دلچسپی کے متعلق اپنے خیالات و نظریات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''بہرکیف! داستان گوئی ایک فن ہے اور اپنے حدود و نقائص کے باوجود ایک دلچسپ فن ہے اور اس قدر کم قیمت نہیں کہ ہم اسے یک قلم نظر انداز کرسکیں۔ افسوس ہے کہ موجودہ زمانہ میں اس فن کے جاننے اور برتنے والے نہیں ملتے اور اب یہ فن دنیائے ادب میں زندہ فن کی حیثیت نہیں رکھتا ہے اور کوئی دوسری صنف سخن اس کا بدل نہیں ہوسکتی۔''(۳)

کلیم الدین احمد وہ پہلے نقاد ہیں جنھوں نے داستان کی خوبیوں اور خامیوں کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرائی۔ وہ داستان کو اس کی تمام خوبیوں اور خامیوں کے باوجود کم مرتبہ نہیں سمجھتے۔ ان کا ماننا ہے کہ داستانیں نہ خلا

میں پیدا ہوتی ہیں اور نہ ہی خلا میں سانس لیتی ہے بلکہ ان قصے اور کہانیوں سے ہمارا فکر و شعور اور ہماری تہذیب و ثقافت وابستہ ہے۔اس لیے داستانیں کسی بھی قوم کی تہذیبی اور نفسیاتی نشو و نما میں غیر معمولی کردار ادا کرتی ہیں۔ اس کے مطالعے سے ہم اس قوم کے ماضی سے بخوبی واقفیت حاصل کر سکتے ہیں اور ان کی تہذیب و ثقافت سے بھی کلی طور پر آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔داستان کی تکنیک پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''واقعات کی ترتیب و ترقی، ان کے انتخاب و تناسب میں بھی یہی (عارضی اور سطحی حسن و لذت) فوری حسن، یہی معیار پیش نظر ہوتا ہے۔نفس واقعہ سے مطلب نہیں جس میں اکثر تخیل کی بے لگامی کی انتہا ہوتی ہے۔یہاں واقعات کی تنظیم اور ان کے باہمی تعلق سے بحث ہے۔ان واقعات میں بھی جزوی حسن ہوتا ہے جو نظر کو فوراً جذب کر لیتا ہے اور سبحان اللہ اور واہ واہ کی صدا بلند ہو جاتی ہے۔''(۴)

کلیم الدین احمد نے سب سے زیادہ تعریف ''آرائش محفل'' کی ہے اور اسے اس کے خالق حاتم کے بلند انسانی تصور کے باعث لائق تحسین و ستائش قرار دیا ہے۔انھوں نے سب سے کم مرتبہ داستان ''فسانہ عجائب'' کو قرار دیا ہے اور میر امن کی ''باغ و بہار'' کو بھی چند وجوہ کی بنا پر سراہا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ داستان کی فضا اور ماحول چاہے جتنا غیر مانوس اور اجنبی ہی کیوں نہ ہو لیکن اگر اس کے پیرایہ بیان میں سادگی، شگفتگی اور صفائی ہو تو وہ براہ راست لوگوں کو متاثر کر سکتی ہے۔اس کا خالق صرف زبان و بیان کی وجہ سے داد و تحسین وصول کر سکتا ہے۔یہی سادگی اور صفائی انھیں ''فسانہ عجائب'' میں کھٹکتی ہے۔کیوں کہ اس کا انداز انتہائی پر تکلف اور پر تصنع ہے بلکہ بعض اوقات مصنف کا مافی الضمیر الفاظ کے پیچ و خم میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انھوں نے داستان کے اصول و ضوابط کو وضع کرنے میں مغربی مفکرین کے افکار و نظریات سے استفادہ کیا ہے۔وہ ہماری داستانوں کو مغرب کے اصولوں کی کسوٹی پر جانچتے اور پرکھتے ہیں لیکن مغربی انداز تنقید کے علاوہ انھوں نے جن اردو ادیبوں کے افکار سے براہ راست استفادہ کیا ہے ان میں مرزا غالب اور خواجہ امان سرفہرست ہیں۔کہیں کہیں وہ داستانوں کی تنقید میں انتہا پسندی کا شکار ہو گئے ہیں لیکن

چوں کہ انھوں نے پہلی بار باضابطہ طور پر فن دستان گوئی پر اظہار خیال کیا اور ایک مستقل کتاب لکھی اس اعتبار سے داستان کی تنقید میں ان کا نام جلی حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔

اگر تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو داستان کی تنقید میں محمد حسن عسکری کا دیباچہ اور عزیز احمد کا مقدمہ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں جو محمد حسن عسکری کی تالیف ''انتخاب طلسم ہوش ربا'' میں شامل ہیں۔ حسن عسکری اردو زبان وادب کے نامور نقاد، مترجم، افسانہ نگار اور انگریزی ادب کے استاد تھے۔ انہوں نے اپنے تنقیدی مضامین اور افسانوں کے ذریعے جدید مغربی رجحانات کو اردو داں طبقے میں متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو کی داستانوں میں ''طلسم ہوشربا'' سب سے زیادہ مشہور ومقبول ہے۔ یہ ۴۶ رجلدوں پر محیط ''داستان امیر حمزہ'' کا ایک حصہ ہے جو ۹ رجلدوں یعنی تقریباً دس ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ آج کی مصروف زندگی میں اتنی طویل داستان کو شروع سے آخر تک پڑھنا ہر قاری کے بس کی بات نہیں رہی، اس لیے اس کے ایک مختصر مگر نمائندہ انتخاب کی شدید ضرورت بیسویں صدی کے اوائل ہی سے محسوس کی جاتی رہی تھی۔ چنانچہ 'طلسم ہوشربا' کی ایک تلخیص ۱۹۵۰ء میں حسن عسکری نے پیش کی اور اس انتخاب کو اتر پردیش اردو اکادمی نے مارچ ۱۹۸۵ء میں دوبارہ شائع کیا۔

طلسم ہوش ربا کے اس انتخاب میں اگر عزیز احمد کا مقدمہ اور محمد حسن عسکری کا دیباچہ نہ ہوتا تو اس انتخاب کی داستان کی تنقید میں کوئی اہمیت نہ رہ جاتی۔ اگرچہ انتخاب میں پہلے روح کا تعین کرلیا جاتا ہے اور پھر جو زیادہ ہوتا ہے اسے الگ کر دیا جاتا ہے جیسے پتھر سے مجسمہ تراشا جاتا ہے یا لکڑی سے کوئی شکل نکالی جاتی ہے لیکن زبان کے ذریعے بیان ہونے کا معاملہ شاید ایسا نہیں۔ اس میں وہ باتیں بھی آجاتی ہیں جو بظاہر بیان کرنے والے کو بیان کرتے وقت محسوس نہیں ہوتیں۔ اس بات کو جدید تنقید کے ذریعے بھی آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے اور اس بات سے بھی جسے عسکری نے چیزوں اور نثر کے رشتے سے بیان کیا ہے۔

عزیز احمد نے اس کے مقدمے میں بہت سی مفید اور کارآمد باتیں قلمبند کی ہیں۔ اگرچہ انھوں نے باقاعدہ طور پر فن دستان گوئی پر خاص گفتگو نہیں کی ہے تاہم اس میں لکھنؤ کا ماحول اور اس کے نسوانی کرداروں سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ اس کے نسوانی کرداروں کے متعلق لکھتے ہیں:

''......لیکن قصے کی تہ کے نیچے یہ سب اس زمانے کے لکھنؤ کی عورتیں ہیں جن

کی جھلک ہمیں جرأت کی غزل، شوق کی مثنوی اور سرشار کے فسانہ آزاد میں بھی نظر آتی ہے۔ ان میں سبھی طرح کی عورتیں ہیں، بیگمات جو زہر عشق اور دوسری مثنویوں کی عورتوں کی طرح چھپ کے عاشقی کرتی ہیں۔ رسوائی سے ڈرتی ہیں لیکن عشق بھرپور، بدمست جوانی کے عشق سے باز نہیں آتیں۔ چوک کی رنڈیاں جن کی بات چیت نرت میں شہد پن ہے۔''(۵)

عزیز احمد نے اگرچہ داستان کی تنقید کے حوالے سے کوئی باقاعدہ کتاب نہیں لکھی لیکن ان کا یہ مختصر سا مقدمہ بھی اس سلسلے میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے اس مقدمے میں طلسم ہوشربا پر اختصار کے ساتھ تنقید کی ہے اور اس بات سے سبھی واقف ہیں کہ مقدمے میں اس سے زیادہ کی گنجائش بھی نہیں ہوتی۔ اس مختصر سی تحریر میں بھی انھوں نے تنقید کا حق ادا کر دیا ہے۔ محمد حسن عسکری اپنے دیباچے میں پہلے یہ بتاتے ہیں کہ رجب علی بیگ سرور کے یہاں نثر چیزوں کو تصورات میں بدل دیتی ہے اور میر امن کی نثر میں چیزیں ایک دوسرے سے الگ اور اپنی روشنی سے منور دکھائی دیتی ہیں۔ پھر یہ کہتے ہیں کہ طلسم ہوشربا کی نثر چیزوں کو تصورات میں نہیں بدلنا چاہتی۔ اس نثر کو شاید چیزوں کی روح سے وہ ہم آہنگی حاصل نہیں۔ حسن عسکری نے اس کتاب کے انتخاب میں جو باتیں پیش نظر رکھی ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ اس کتاب میں حتیٰ الامکان ماورائی باتوں سے گریز کیا جائے اور ان حصوں کو شامل کیا جائے جن کا تعلق سماجی اور معاشرتی زندگی سے ہے۔

۲۔ ہر انتخاب اپنی جگہ مکمل قصہ ہو۔

۳۔ طلسمِ ہوشربا میں جو مختلف اسالیب ہیں ان کے تمام نمونوں کی نمائندگی موجود ہو۔

۴۔ زیادہ تر ایسے حصے اخذ کیے گئے ہیں جن کی نثر سیدھی سادی ہے۔ البتہ گنجلک نثر بھی ہے لیکن اسے کاٹ چھانٹ کر مختصر کر دیا ہے۔

۵۔ طلسم ہوشربا کو میں نے ایک عام ادب پڑھنے والے یا ایک ایسے قاری کی طرح پڑھا ہے جس نے افسانے لکھے اور مختلف اقسام کی نثر نگاری اور اس کی ضرورتوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔

مذکورہ بالا باتوں سے ان کے اس انتخاب کے طریقۂ کار کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ وہ سب سے پہلے کسی بھی فن پارے کا مطالعہ کلی طور پر کرتے ہیں۔ اس کے بعد طرز معاشرت، اسلوب اور زبان و بیان سے بحث کرتے ہیں۔ انھوں نے طلسم ہوشربا کو ان تینوں کسوٹیوں پر جانچنے اور پرکھنے کے بعد اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

''اردو افسانہ نویسی پر جو مضامین یا کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں یہ بات دہرائی گئی ہے کہ پہلے تو ہمارے یہاں صرف جادو اور طلسم کے قصے لکھے جاتے تھے۔ لکھنے والوں کو اپنی زندگی سے تخلیقی دلچسپی نہیں تھی۔ صرف خیالی باتوں میں پڑے رہتے تھے۔ البتہ جب غدر کا سانحہ پیش آیا تو لوگوں کی آنکھیں کھلیں۔ دوسری طرف انگریزی ناولوں کا اثر پڑنا شروع ہوا اور ان محرکات کے زیر اثر ہمارے لکھنے والوں نے اپنے زمانے کی معاشرتی زندگی کو افسانوں کا موضوع بنایا۔ یہ مفروضات ہماری تنقید میں اس طرح قائم ہو چکے ہیں کہ نہ تو کسی کو ثبوت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور نہ دلیل کی۔۔۔ طلسم ہوش ربا کے اس انتخاب پر ایک نظر ڈالنے یا محض ورق الٹنے سے ہی آپ پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اردو افسانے کی نشو و نما کا مذکورہ بالا تصور حقیقت سے کتنی دور ہے...... طلم ہوش ربا پڑھنے کے بعد تو ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ہمارے لکھنے والے اس کے بعد زندگی سے اتنی وسیع دلچسپی لے بھی سکے یا نہیں۔''(۶)

اس اقتباس میں انھوں نے اردو فکشن کی ابتدا اور ارتقا کے اس تصور خام پر کاری ضرب لگائی ہے جس سے اتفاق کیا جا سکتا ہے۔ آج تک ہمارے یہاں ناولوں اور افسانوں کو مغرب سے مستعار سمجھا جاتا ہے جب کہ ایسا نہیں ہے۔ اسی بات کو محمد حسن عسکری نے مذکورہ بالا اقتباس میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ ہمارے قدیم ادبی سرمایوں میں عوامی دلچسپی اور معاشرتی زندگی کی کامیاب جھلکیاں موجود ہیں۔ محمد حسن عسکری نے اگرچہ داستان کے فن پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی لیکن اس انتخاب کے مقدمے میں جو باتیں

زیر بحث آئی ہیں ان سے داستان سے متعلق ان کے تنقیدی نظریات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد داستان کی تنقید میں جو اہم نام آتا ہے وہ گیان چند جین کا ہے۔انھوں نے ’’اردو کی نثری داستانیں‘‘ کے عنوان سے کتاب لکھ کر نہ صرف داستان کی تنقید میں اضافہ کیا ہے بلکہ داستان کے فن، تکنیک اور اجزائے ترکیبی کے حوالے سے عمدہ بحث کی ہے۔ یہ کتاب داستان کی تنقید پر ایک اہم کتاب قرار دی جاسکتی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے تحقیقی مباحث کو زیادہ اہمیت دی ہے البتہ متوازن تنقید بھی شامل ہے۔ چوں کہ گیان چند جین تحقیقی مزاج رکھتے تھے اس لیے انھوں نے اس کتاب میں تحقیقی مباحث کو اولیت دی ہے، اس کے باوجود ان کے یہاں گہرا تنقیدی شعور بھی کارفرما ہے جو ان کے مطالعے اور دائرہ کار کی وسعت اور کشادگی پر دال ہے۔

اردو کی نثری داستانیں دراصل پروفیسر گیان چند کی پی ایچ ڈی کا تھیسس ہے جسے بعد میں انھوں نے ترمیم و اضافہ کے ساتھ شائع کیا۔کتاب گیارہ ابواب میں تقسیم کی گئی ہے۔ اس میں اردو کی کئی ایسی نثری داستانوں کے نام بھی شامل ہیں جن کے نام سے اکثر لوگ واقف نہیں ہوتے۔’اردو کی نثری داستانیں‘ کے مطالعہ سے ہمیں داستان کے فن اور بعض اہم داستانوں کی تنقید پر قابل قدر مواد فراہم ہو جاتا ہے۔اس لیے کہ اس میں ان تمام داستانوں کا توضیحی وتشریحی تذکرہ ہے جو داستان گوئی کی تاریخ میں اہمیت کی حامل ہیں۔ان کا خیال ہے کہ لفظ رومانس سے داستان کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ چنانچہ وہ ایک عمدہ داستان کی خوبیوں کہ طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’فوق الفطرت کی تحیر خیزی، حسن وعشق کی رنگینی، مہمات کی پیچیدگی، لطف بیان، انھیں عناصر سے داستان عبارت ہے۔ایک دل کو اٹکا لینے والی کیفیت اور اس کے بعد فرحت و آسودگی کا احساس داستان اور داستان گو کا تحفہ ہے......داستان کا مصنف واعظ اور ناصح نہیں ہوتا۔اس میں زہد کی خشونت اور خشکی نہیں پائی جاتی۔‘‘(۷)

مذکورہ اقتباس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جین صاحب انتہائی فہم و احتیاط سے کام لیتے ہیں اور ہر فقرہ

ناپ تول کر لکھتے ہیں۔ چوں کہ داستان کا ادب زیادہ تر درباروں، امرا اور رؤسا کی سرپرستی میں پھلا پھولا، اس لیے ایک داستان گو وہی کچھ بیان کرتا ہے جو ان کو پسند ہو۔ اس لیے زیادہ تر داستانوں میں بلند طبقے کے افراد کے حسن و عشق، جنگ و جدال اور دوسرے واقعات درج کیے گئے ہیں۔

انھوں نے داستانوں میں حسن و عشق اور تحیر خیزی کو ایک اہم عنصر قرار دیا ہے۔ اس طرح وہ داستان کے فن اور داستانوں پر بڑی نپی تلی گفتگو کرتے ہیں۔ البتہ ان سے کہیں کہیں بعض معمولی غلطیاں بھی ہوگئی ہیں مثلاً اردو کی نثری داستانیں کے صفحہ ۵۹۷ پر 'طلسم ہوشربا' کے سلسلے میں انہوں نے الفاظ کے انتخاب میں کہیں کہیں احتیاط سے کام نہیں لیا ہے۔ کہیں کہیں مشاہدے کی کمزوری کا بھی ثبوت دیتے ہیں۔ لیکن اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان کی تنقید میں اعتدال و توازن موجود ہے۔ البتہ ان کے خیالات سے بعض ناقدین کے نظریات مختلف ہیں جن میں محمد حسن عسکری، ڈاکٹر راہی معصوم رضا اور ممتاز حسین کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ داستانوں میں طلسمی اور جادوئی فضا ایک لازمی امر ہے۔ گیان چند جین ایک طرف یہ کہتے ہیں کہ ان داستانوں کی فضا خالص ہندوستانی ہے لیکن دوسری طرف یہ بھی کہتے ہیں:

> ''۔۔۔ اگر چہ ہندوؤں کے خلاف صریحاً کچھ نہیں لکھا گیا ہے لیکن ساحروں کو ہر طرح سے ملعون و مکروہ پیش کرنے کے بعد انھیں ہندو اور برہمن قرار دینا ہندوؤں پر پھٹکار بھیجنے کے مترادف ہے۔'' (۸)

آگے اس بات کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ:

> ''......ان سب باتوں کے باوجود ساحروں کی شخصیت، ان کے نام ہندوستانی نہیں۔ ان کی بول چال، رہن سہن، مکانوں کی آرائش، طرز بود و ماند، انداز فکر سب کا ڈھنگ اسلامی ہے۔ بڑے ساحروں کا تو حلیہ بھی ہندو وضع کا نہیں۔ جادوگرنیاں ہندوستان کی مسلمان بیگموں کی طرح ہیں۔ (۹)

ایک طرف تو وہ ساحروں اور جادوگروں کی صورت میں ہندوؤں کا چہرہ دیکھتے ہیں اور انھیں ملعون و مکروہ قرار دینے پر ہندوؤں پر پھٹکار سمجھتے ہیں تو دوسری طرف اس بات کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ ان کے حلیہ سے

اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہندوستانی نہیں ہیں۔ ساتھ ہی ان کے رہن سہن اور طرز بود و باش سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کا رنگ ڈھنگ اسلامی ہے۔ نیز جادوگرنیاں بھی ہندوستان کی مسلمان بیگموں کی طرح ہیں۔ اس کتاب کے بغور مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کہیں کہیں متضاد بیانی کا بھی شکار ہوگئے ہیں اور کہیں کہیں جذبات کی رو میں بہہ گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے راہی معصوم رضا نے کہا ہے کہ ''یہ کتاب تحقیقی اور تنقیدی دونوں اعتبار سے کمزور ہے۔'' اس کے باوجود یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے مجموعی طور پر داستان کے فن اور داستان کی عملی تنقید پر اچھا مواد پیش کیا ہے۔

اس کے بعد داستان کی تنقید کی ایک اہم کڑی پروفیسر وقار عظیم ہیں۔ انھوں نے ہماری داستانیں کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جو داستان کی تنقید کی ایک اہم کڑی تصور کی جاتی ہے۔ ہماری داستانیں وقار صاحب کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن کا تعلق داستانوں سے ہے۔ ہماری داستانیں ان کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں ان کے پندرہ مضامین شامل ہیں۔ وہ اردو کے مشہور ادیب، مترجم، محقق اور نقاد کی حیثیت سے معروف ہیں۔ وہ اس کتاب کے پیش لفظ میں رقمطراز ہیں:

> ''ہماری داستانیں میرے ان مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین کا مجموعہ ہے جو اردو نثر کی سب سے عجیب و غریب اور بعض حیثیتوں سے زیادہ دل کش اور سب سے اہم صنف کے مطالعے کے بعد میں مختلف وقتوں میں لکھتا رہا ہوں۔ نثر کی اس صنف کو سب سے عجیب و غریب اور دل کش کہتے وقت مجھے یقین ہے کہ جن صاحبان نے داستانوں کا مطالعہ کیا ہے وہ انھیں عجیب و غریب کہنے میں میرے ہمنوا ہوں گے۔''(۱۰)

وہ آگے رقمطراز ہیں:

> ''اردو کی داستانوں کا مجموعی حیثیت سے اپنی نثر کی سب سے اہم صنف سمجھنے کا میرے پاس وہی جواز ہے جو غزل کو شاعری کی سب سے اہم صنف سمجھنے کا۔ جس طرح غزل ہمارے مشرقی مزاج اور اس مزاج کے اکثر نازک اور پیچیدہ

پہلوؤں کا عکس ہے اسی طرح داستانیں ہماری تہذیبی زندگی اس کے بے شمار گوشوں کی مصور و ترجمان ہیں۔جس طرح غزل کے حرف حرف میں ہمارے ساز دل کی ہر جھنکار اور اس شیشہ کی ہر کھنک سنائی دیتی ہے، اسی طرح داستان کی ہر سطر میں تقریباً ڈیڑھ سو برس کی معاشرت، تہذیب اور انداز فکر و تخیل کا رنگ صاف جھلکتا اور چھلکتا نظر آتا ہے۔''(۱۱)

مذکورہ اقتباس سے وقار عظیم کے داستان کے سلسلے میں تنقیدی نظریات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔وہ داستانوں کو ہماری زندگی اور تہذیب دونوں کا ترجمان سمجھتے ہیں۔اس کتاب میں انھوں نے باغ و بہار، رانی کیتکی کی کہانی، داستان امیر حمزہ، آرائش محفل، بیتال پچیسی، نورتن، فسانہ عجائب، شر رعشق، شگوفہ محبت، گل وصنوبر اور الف لیلہ جیسی اہم داستانوں کا تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔انھوں نے اس بات کی وضاحت بھی کی ہے کہ جو ناقدین داستان کے پلاٹ میں طوالت اور مافوق الفطرت عناصر کے باعث اس کی جرح و تنقیص کرتے ہیں اور اسے داستان کا عیب قرار دیتے ہیں وہ اس نکتے سے واقف نہیں ہیں کہ ہر صنف کی اپنی بنیادی خصوصیت ہے جس کے باعث اسے ادب میں وقار اور مرتبہ حاصل ہے۔مافوق الفطری عناصر اور طوالت داستان کی خوبیوں میں سے ہے اور یہ اس کے فن کے عین مطابق بھی ہے۔کیوں کہ اس کے بغیر داستان داستان نہیں رہ جائے گی۔ان کا ماننا ہے کہ تخیل کی بلند پروازی اور جدت طرازی یعنی تخیلی اور حیرت و استعجاب والی دنیا پر داستان کے فن کی بنیاد قائم ہے۔انھوں نے بعض باتیں وہی دہرائی ہیں جو گیان چند جین نے کہی ہیں تاہم بعض نئے نکتوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔کہیں کہیں انھوں نے تقابلی طرز تنقید سے بھی کام لیا ہے۔سرور کی فسانہ عجائب کی خوبیوں کی طرف اشارہ کیا ہے تو ان کی کتاب شگوفہ محبت کی خامیوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔

اس کتاب کے بغور مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں فاضل مصنف نے فن داستان کے ہر پہلو سے بحث کی ہے اور پھر انہیں اصولوں پر اردو کی متعدد داستانوں کو جانچا اور پرکھا ہے۔کتاب کی عبارت صاف، سادہ اور بیجا تکلفات سے جہاں پاک ہے وہیں پیچیدہ باتوں کو سلجھا کر بیان کیا گیا ہے اور مشکل خیالات آسان الفاظ میں ادا کیے گئے ہیں۔انداز استدلالی ہے لیکن کہیں کہیں خیالات میں تضاد بھی موجود ہے۔

تاریخی ترتیب کے اعتبار سے اس کے بعد ایک اہم نام ممتاز حسین کا ہے جنھوں نے میر امن کی باغ و بہار کی ترتیب دی اور اس سے قبل ایک جامع مقدمہ لکھا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اردو کے اکثر محققین و ناقدین نے باغ و بہار کی مقبولیت کے پیش نظر اس کی ترتیب و تدوین کا کام انجام دیا ہے جن میں سب سے پہلا نام مولوی عبدالحق کا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے باغ و بہار کو مرتب کیا اور ۱۹۳۲ء میں شائع کیا۔ اس کے بعد وقار عظیم، ابوالخیر کشفی، ممتاز حسین، وحید قریشی، سلیم اختر اور رشید حسن خاں نے اس کی ترتیب و تدوین کا کام انجام دیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے زیادہ تر تحقیقی مباحث کا تذکرہ کیا ہے اور اصل متن کو حتیٰ الامکان پیش کرنے کی سعی و کوشش کی ہے۔ وقار عظیم نے بھی داستان کے حوالے سے بعض اہم نکات ذکر کیے ہیں۔ ممتاز حسین نے اپنے مقدمے میں سب سے پہلے روحانی سفر کا تذکرہ کیا ہے۔ کیوں کہ روحانی سفر ایک ایسا سفر ہے جس میں شکست کی بہت کم گنجائش موجود ہے۔ انھوں نے باغ و بہار کے پلاٹ، کردار اور زبان پر اچھی تنقیدی بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''قصوں کا المیہ ساز، درویشوں کی مایوسی، اور پھر تائید غیبی پر بھروسہ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ یہ داستان ایک بیمار قوم کو سنائی گئی تھی۔ اس میں جذبہ عشق، اقرار خودی اور ناز فرمائی کے بالمقابل انکار خودی اور عجز و نیاز کی طرف زیادہ مائل ہے۔'' (۱۲)

نظریاتی شدت پسندی سے گریز اور خود احتسابی کا عمل ممتاز حسین کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کی فکر اور نظر ہر طرح کی عصبیت اور جانب داری سے قطعی پاک اور بالاتر تھی۔ ممتاز حسین مشرقی اور مغربی ادب پر یکساں گہری نظر رکھتے تھے۔ وہ بیک وقت نظریے اور جمالیات کی بات کرتے تھے اور اپنے خیالات کو تاریخی واقعات اور ٹھوس دلائل کی مدد سے مضبوط کرتے تھے۔ ان کے مضامین ان کی ہمہ گیری اور علمی وسعت کے آئینہ دار ہیں۔

تدوین متن کے اصول الہامی نہیں ہیں اور نہ ہی ان میں اضافہ یا ترمیم بدعت سیئہ ہے۔ تدوین میں عموماً کتابیات کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن اتنی کتابوں کے حوالے دیئے گئے ہیں اور یہ ادعا بھی ہے کہ یہ کتاب مدرسین اور طالب علموں کے لیے ہے اور اس میں تقریباً نصف سے زائد حوالے ایسے ہیں جن سے اردو کے عام طالب علم اور مدرسین واقف نہیں ہیں۔ اس لیے کتابیات ہوتی تو زیادہ بہتر ہوتا۔ فاضل مرتب نے ماخذ کی بحث بہت سرسری

کی۔انھوں نے متصوفانہ پہلو کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا۔ بے شک ان کے اوپر یہ واجب نہیں تھا کہ وہ یہ بحث کریں لیکن ماخذ کی بحث اگر ہوتی تو یہ بہت بڑا استحباب ہوتا ہے۔

موصوف نے جہاں میر امن کی خوبیوں کا تذکرہ کیا ہے وہیں ان کی زبان کی بعض خامیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میر امن کو جذبات نگاری میں کمال حاصل نہیں تھا۔انھوں نے اس مقدمے میں باغ و بہار پر نئے زاویۂ نگاہ سے بحث کی ہے۔ان کی اس تنقید میں جانب داری کے بجائے انداز استدلالی ہے۔ اس کتاب کی تفہیم و ترسیل میں انھوں نے جو اسلوب اور انداز اختیار کیا ہے وہ قابل دید ہے۔انھوں نے اس مقدمے میں باغ و بہار کو نئے مفاہیم بخشنے کی سعی و کوشش کی ہے۔

وحید قریشی اور سلیم اختر نے بھی اس کی تفہیم میں نیا اسلوب اختیار کیا ہے۔ان دونوں ناقدین نے باغ و بہار کے کرداروں کا جو تجزیہ پیش کیا ہے وہ اپنے آپ میں مکمل بھی ہے اور نئی تنقید کے لیے راہ کشا بھی ہے۔ وحید قریشی نئی تنقید کا ایک اہم نام ہے۔ وہ ایک خوش مزاج اور بے حد سنجیدہ ناقد تھے۔ مطالعے میں ان کے انہماک، تحقیقی جستجو میں ان کی ژرف نگاہی اور تنقیدی تجزیوں میں ان کی سنجیدگی کا اندازہ ان کے مقدمے سے لگایا جا سکتا ہے۔ مسائل کے ساتھ صورت حال کا تبدیل ہونا فطری بات ہے۔ وہ ایک کھلا ذہن اور غیر متعصب نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ وہ اس بات سے واقف تھے کہ تنقید کوئی میکانکی عمل نہیں ہے اور نہ میکانکی طریقہ کار کو ادبی تفہیم یا ادبی مطالعہ کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

سلیم اختر نے بھی باغ و بہار کی تنقید میں بڑی دیدہ ریزی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔انھوں نے نہ میر امن کی تعریف کی ہے نہ ہی تنقیص، بلکہ ان کی باغ و بہار پر اچھی اور متوازن تنقید کا نمونہ پیش کیا ہے جو تنقید کے روایتی انداز سے قدرے مختلف ہے۔

''داستان سے افسانے تک'' وقار عظیم کی دوسری کتاب ہے۔ یہ کتاب ان کے ان مضامین کا انتخاب ہے جو مختلف اوقات میں سپرد قلم کیے گئے تھے۔اس میں دو مضامین داستان سے متعلق ہیں جن میں پہلا مضمون ''داستان سے افسانے تک'' اور دوسرا مضمون ''داستانی عہد کی مختصر کہانیاں'' ہے۔ دوسرے مضمون میں وہ داستانی عہد سے متعلق لکھتے ہیں:

''داستانی عہد سے میری مراد اردو نثر کا وہ دور ہے جس میں داستان نثر کی دوسری اصناف پر اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ باقی اصناف اس کی آب وتاب کے آگے بالکل ماند دکھائی دیتی ہیں۔ داستان کے اس عہد زرین کا آغاز فورٹ ولیم کے قیام سے ہوتا ہے۔'' (۱۳)

اس کے بعد کا ایک اہم نام پروفیسر نیر مسعود کا ہے جنھوں نے ''رجب علی بیگ سرور حیات اور کارنامے'' کے عنوان سے ایک کتاب لکھی۔ یہ کتاب خاتمہ کے علاوہ نو ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ دراصل نیر مسعود کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر الہ آباد یونیورسٹی نے ان کو اردو میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی۔ اگرچہ یہ کتاب داستان کی تنقید پر جامع کتاب نہیں ہے لیکن اس میں جزوی طور پر داستان کے فن پر بہت سی کارآمد باتیں زیر بحث آئی ہیں۔

کتاب کے باب اول میں نیر مسعود نے رجب علی بیگ سرور کے عہد کی سیاسی، سماجی اور ادبی صورت حال کے ساتھ سرور سے قبل شمالی ہند میں اردو نثر کے آغاز وارتقا اور اس عہد میں نثر میں لکھی گئی فضلی کی ''کربل کتھا''، عطا حسین تحسین کی ''نوطرز مرصع''، مہر چند مہر کھتری کی ''نو آئین ہند''، شاہ حسین حقیقت کی ''جذبہ عشق''، حکیم محمد بخش مہجور کی ''گلشن نو بہار اور نورتن''، سید انشاء اللہ خاں انشا کی ''سلک گہر اور رانی کیتکی کی کہانی''، جیسی اہم اردو کی داستانوں کا جائزہ لیا ہے۔ نیر مسعود نے اپنی اس تحقیقی کتاب میں سرور کے حالات زندگی، ان کے عہد کی ادبی، سیاسی اور معاشرتی کشمکش، سرور کی ادبی زندگی کے نشیب وفراز، ان کے نثری اور شعری سرمایے کا تنقیدی جائزہ، ان کے مدفن، شاگرد، اولاد اور ان کے قلمی آثار وغیرہ پر نہایت محققانہ اور عالمانہ بحث کی ہے۔ نیر مسعود کی ادبی زندگی اور علمی کارنامے مختلف النوع ہیں۔ ایک طرف تنقیدی و تحقیقی مضامین ہیں تو دوسری طرف عالمانہ تحریریں۔ ایک طرف ان کی سوانحی تصانیف ہیں تو دوسری طرف مختلف زبانوں کی مختلف تحریروں کے اردو تراجم۔ علاوہ بریں انھوں نے بہت سے خاکے بھی سپرد قلم کیے ہیں۔ اودھ بالخصوص لکھنؤ نیر مسعود کا خاص موضوع رہا ہے۔ لکھنؤ کی تہذیب وثقافت کی جھلکیاں ان کی تحریروں میں جابجا دیکھنے کو ملتی ہیں۔ نیر مسعود کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ہم ان کی تنقیدی بصیرت کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں:

''فسانہ عجائب کا اختصار اس لحاظ سے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ بعد میں جو

داستانیں اس سے متاثر ہو کر لکھی گئیں ان میں بھی طوالت سے پرہیز کیا گیا اور اس طرح اردو ناول کے لیے راہ ہموار ہوئی۔عزیز احمد اسی اختصار کی وجہ سے فسانہ عجائب کو ناول سے بہت قریب مانتے ہیں۔''(۱۴)

اپنی کتاب میں انھوں نے نہ صرف فسانہ عجائب کا تنقیدی تجزیہ پیش کیا ہے بلکہ ان اعتراضات پر تنقید بھی کی ہے جو وقتاً فوقتاً اس پر وارد ہوتے رہے ہیں۔مثال کے طور پر فسانہ عجائب کے کرداروں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس کے کردار انفرادی امتیازات سے عاری اور انسانی جذبات و احساسات سے بے گانہ ہیں......مطلب یہ ہوا کہ مہر نگار اور انجمن آرا، ماہ طلعت اور چڑی مار کی بیوی، جان عالم اور پیر مرد جوگی اور وزیر زادہ غرض فسانہ عجائب کے جتنے بھی کردار ہیں یہ سب اپنی خصوصیات کے اعتبار سے یکساں ہیں......لیکن ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔''(۱۵)

نیر مسعود نے بڑی ایمانداری سے فسانہ عجائب کا تجزیہ کیا ہے ساتھ ہی اس پر وارد ہونے والے اعتراضات کا بھی ازالہ کیا ہے جو ناقدین کی طرف سے وارد ہوتے رہے ہیں۔ان کے بعد ایک اہم نقاد رفیع الدین ہاشمی ہیں جنھوں نے سرور اور فسانہ عجائب کے نام سے ایک کتاب لکھی اور ۱۹۷۵ء میں شائع کی۔اس کے بعد داستانی ادب پر کئی اہم ناقدین نے قلم اٹھایا ان ناقدین میں سہیل بخاری، سہیل احمد خاں اور سلیم اختر وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔رفیع الدین ہاشمی نے اپنی کتاب میں زیادہ تر مواد نیر مسعود کی کتاب سے فراہم کیا ہے۔اس کے باوجود اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔یہ داستان ابھی تک اردو والوں کی توجہ سے محروم تھی۔ہندوستان میں نیر مسعود نے قابل قدر مواد فراہم کیا ہے لیکن پاکستان میں اب تک یہ میدان خالی تھا۔اس کا تنقیدی مطالعہ پاکستان کے بالغ نظر نقاد رفیع الدین ہاشمی نے اپنی کتاب ''سرور اور فسانہ عجائب'' میں پیش کیا۔

موصوف نے جس محنت اور لگن سے یہ کام کیا ہے، وہ قابلِ داد ہے۔انہوں نے اردو کی داستانوں میں نہ صرف ''فسانہ عجائب'' کا مقام متعین کیا ہے بلکہ سرور کی محنت کو بھی سراہا ہے، اور اسی کے ساتھ تصنیف اور مصنف

کے متعلق بعض تحقیق طلب مسائل سے بھی تعرض کیا ہے۔ یہ بات نہایت طمانیت بخش ہے کہ جہاں انہوں نے دوسروں کے خیالات پیش کیے ہیں وہاں آخر میں اپنی بے لاگ رائے بھی دے دی ہے۔ چنانچہ بعض مقامات پر مصنف سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن ان کے خلوص اور محنت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ اس کتاب میں سرور اور 'فسانہ عجائب' کے تقریباً تمام ممکن پہلوؤں پر استدلالی گفتگو کی گئی ہے۔

داستان کے تنقیدی سرمائے کا ایک اہم نام راہی معصوم رضا کا ہے۔ انھوں نے داستان کے تنقیدی سرمائے میں ''طلسم ہوش ربا: ایک مطالعہ'' لکھ کر قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ وہ سائنٹفک فکر اور ترقی پسند نظریات رکھنے والے ناقد تھے۔ وہ ایک کھلا ذہن اور غیر متعصب نقطہ نظر رکھتے تھے۔ انھوں نے مارکس کا بھی گہرائی سے مطالعہ کیا اور سیاست، تہذیب اور تاریخ میں تبدیلی کے عمل کو بھی اچھی طرح سمجھا تھا۔ وہ اس بات سے واقف تھے کہ تنقید کوئی میکانکی عمل نہیں ہے اور نہ میکانکی طریقہ کار کو ادبی تفہیم یا ادبی مطالعہ کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ وہ مارکس کے نظریات کو غلط نہیں قرار دیتے بلکہ ان کا اعتراض ان لوگوں پر ہے جنھوں نے مارکسزم کو میکانکی طور پر استعمال کیا یا اس فلسفہ کی غلط تعبیر کی۔

انھوں نے یہ کتاب لکھ کر یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ طلسم ہوش ربا میں جو فضا اور ماحول پیش کیا گیا ہے اس کا تعلق خالص ہندوستان سے ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ تین بنیادی چیزوں کو سامنے رکھ کر کیا ہے، اور وہ تینوں چیزیں طلسم ہوش ربا، ہندوستان اور زندگی ہیں۔ کتاب کے مطالعے سے ہمیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اس کے ماحول کو ایک جیتے جاگتے ہندوستان کا ماحول قرار دیا ہے۔ داستان میں موجود پہاڑوں، جنگلوں، صحراؤں، دریاؤں، آب و ہوا، درختوں، پھول پتوں، چرندوں، پرندوں، حیوانوں اور انسانوں کی ساخت اور رنگ وروپ اور عورتوں کے سراپا سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی فضا کا تعلق ہندوستان کے ایک ایسے علاقے سے ہے جو اودھ کے قریب یا خود اودھ اور لکھنؤ ہے۔ پھر وہ یہاں کے صبح و شام، رسم و رواج، رہن سہن اور بود و باش کے طرز سے بحث کرتے ہیں۔

اس کتاب میں انھوں نے سید حسن عسکری اور عزیز احمد کے خیالات کی تردید بھی بڑے سخت الفاظ میں کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان ناقدین نے اس کی طلسمی فضا کو لکھنوی قرار دیا ہے لیکن وہ اسے ہندوستانی نہیں کہتے۔ اس

کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان افراد کے سوچنے کا طریقہ مختلف ہے جسے ہم کسی بھی اعتبار سے صحتمند نہیں قرار دے سکتے۔ ان کے مطابق تہذیب کوئی واجد علی شاہ کی کنیز نہیں ہے جو ان کے ساتھ مٹیا برج چلی جائے۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنے قول کی تائید میں قرۃ العین حیدر کا ایک اقتباس بھی دیا ہے:

> ''معاشروں کی بنیادیں مذاہب پر نہیں ہوتیں بلکہ علاقائی ضرورتوں پر ہوتی ہیں۔ گیان چند نے اس پر دھیان نہیں دیا تو انھیں طلسم کے ساحر بھی ہندو نظر آئے۔ انھیں شکایت ہے کہ بڑے ساحروں کا حلیہ بھی ہندوانہ نہیں ہے۔ اس کے معنی یہی تو نکالے جاسکتے ہیں کہ جو چیز ہندو وضع کی نہ ہو وہ ہندوستانی نہیں ہے۔ کیوں کہ رہن سہن اور اس کی تمام دوسری چیزوں کو لکھنوی تسلیم کرنے کے بعد انھوں نے یہ فریاد کی ہے کہ باوجود ان تمام باتوں کے ساحروں کی روح ہندوستانی نہیں ہے۔''(۱۶)

اس کتاب میں انھوں نے جس تنقیدی بصیرت کا ثبوت پیش کیا ہے وہ قابل مطالعہ ہونے کے ساتھ لائق تقلید بھی ہے۔ راہی نے اس کتاب میں جو انفرادی مطالعہ پیش کیا وہ اہم ہے۔ مگر بعض مقامات پر ان مباحث میں بھی وہ افراط وتفریط کا شکار ہو گئے ہیں۔ اس افراط وتفریط کے باوجود انھوں نے پہلی بار داستان کی روایتی تنقید سے ہٹ کر ایک جدا اور منفرد طرز کی تنقید کا نمونہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے مارکسی نظریات کی بنیاد پر اس کا مطالعہ کیا اور سائنٹفک طریقہ تنقید کی کسوٹی پر اسے جانچا اور پرکھا ہے۔

اس کے بعد کے ناقدین میں رشید حسن خاں، سہیل بخاری، آغا سہیل، آرزو چودھری، حنیف نقوی، پروفیسر ارتضیٰ کریم، عابد رضا بیدار، قمر الہدیٰ فریدی اور ابن کنول وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان ناقدین ومحققین نے داستان کے فن، اسلوب، زبان وبیان اور فضا وغیرہ سے متعلق قابل قدر مواد فراہم کیا ہے۔

ہمارے دور کا المیہ یہ بھی ہے کہ کلاسیکی متون خصوصاً داستانیں اب دستیاب نہیں ہیں۔ ہمارے یہاں چند ہی ایسے لوگ ہیں جنھوں نے داستانوں کا مطالعہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ داستانوں سے متعلق زیادہ تر گفتگو اور تحریریں بہت زیادہ بامعنی نہیں ہوتیں۔ لہٰذا سب سے اہم کام یہ ہے کہ داستانیں شائع کی جائیں اور لائبریریوں

میں فراہم کرائی جائیں اوراس پر یونیورسٹیوں میں تحقیق وتنقید کی فضا ہموار کی جائے۔کسی بھی قوم کی پہچان اس کا کلاسیکی ادب ہوتا ہے۔داستان کوقدیم نقطہ نظر کے بجائے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے پڑھا جائے۔کہانی محض خیالی اور ہوائی باتیں نہیں ہوتیں بلکہ کہانی زندگی کی علامت ہیں۔جس دن کہانی کی موت ہوجائے گی اس دن زندگی کا بھی خاتمہ ہوجائے گا۔یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں ناول اورافسانے کے جتنے بڑے نام ہیں ان سب نے اظہار و بیان کی تمام قوتیں داستانوں سے حاصل کی ہیں۔ ہماری داستانیں الفاظ، زبان و بیان، اسلوب اور محاورہ وضرب الامثال ہی نہیں بلکہ نثری بیانیہ کے تمام تر روشن امکانات اپنے اندر رکھتی ہیں۔

☆☆☆

(ب) ڈرامے کی تنقید

اردو فکشن کی تنقید میں ڈارامے کی تنقید بھی اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے قابل توجہ ہے۔ ڈرامے کے آغاز وارتقا اوراس کے پس منظر پر غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو ڈراما کسی روایت کے تسلسل کے طور پر نہیں بلکہ اپنے مخصوص حالات اور اسباب وعوامل کے تحت وجود میں آیا۔ اس کا آغاز انیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے ہوتا ہے۔ اردو کے تقریباً تمام محققین و ناقدین مسعود حسن رضوی ادیب کے اس خیال سے متفق ہیں کہ نواب واجد علی شاہ اردو کے پہلے ڈراما نگار ہیں اوران کا رہس ''رادھا کنھیّا کا قصہ'' اردو ڈرامے کا نقشِ اول۔

یہ ڈراما واجد علی شاہ کی ولی عہدی کے زمانے میں 'قیصر باغ' میں ۱۸۴۳ء میں بڑی شان سے کھیلا گیا۔ واجد علی شاہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ فنِ موسیقی، رقص وسرود اور آرٹ کے بڑے دلدادہ اور مدّاح تھے۔ ''رادھا کنھیّا کا قصہ'' کے علاوہ واجد علی شاہ کے دوسرے رہس بھی بڑی آن بان سے شاہی اسٹیج پر دکھائے گئے۔ کچھ ہی عرصے بعد ۱۸۵۳ء میں سید آغا حسن امانت لکھنوی کا ''اندر سبھا'' عوامی اسٹیج پر پیش کیا جارہا تھا۔ گو تاریخی لحاظ سے واجد علی شاہ کے رہس کو امانت کے اندر سبھا پر تقدم حاصل ہے لیکن بے پناہ شہرت، ہر دلعزیزی اور قبولِ عام کی سند 'اندر سبھا' کے حصے میں آئی۔ اس کے بعد سے لے کر اب تک اردو میں بے شمار ڈرامے لکھے گئے اور اسٹیج پر پیش کیے گئے جن میں امتیاز علی تاج اور آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے خصوصی اہمیت کے حامل قرار پائے۔

ڈرامے صرف ادبی کارنامے ہی نہیں ہوتے بلکہ اس کو کسی بھی قوم کے تہذیبی عناصر کے اظہار کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر بدقسمتی یہ رہی ہے کہ اردو ڈرامے کو ابتدا سے ہی مغربی ڈرامے کے فنی معیار پر جانچا اور پرکھا جانے لگا اور اس لحاظ سے اس میں کوئی کمی پائی گئی تو اسے اردو ڈرامے کے نقائص پر محمول کیا گیا۔ اسی لیے اردو ڈرامے کے اکثر نقاد اس کی روح، اس کے معیار اور اقدار کو پہچاننے میں ناکام رہے اور اس پر طرح طرح کے الزامات عائد کرتے رہے۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا کسی دور، کسی علاقے اور کسی ادب کے مخصوص مزاج کو سمجھے بغیر کوئی فیصلہ کسی صنف پر صادر کیا جاسکتا ہے۔ اردو ڈرامے کے مزاج کو دیکھا جائے تو اتنی بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ یہ محض

مانگے کا اجالا نہیں اور نہ ہی مغرب کی کورانہ تقلید ہے بلکہ اس کی جڑیں اس متاع گم شدہ سے جا ملتی ہیں جو سنسکرت ڈرامے کے زوال کے بعد یہاں لوک ناٹک کی شکل میں ابھرتی ہیں۔

انیسویں صدی میں ڈرامے کی تنقید کے کچھ نمونے ہمیں ڈراموں کے دیباچوں وغیرہ میں مل جاتے ہیں۔ لیکن ان میں بھی زیادہ تر زبان و بیان سے بحث کی گئی ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ابتدا میں اردو ڈرامے پر تنقید نہ تو فنی نقطہ نظر سے تھی اور نہ ہی تکنیک کے اعتبار سے، بلکہ اکثر ناقدین اس کا اخلاقی پہلو سامنے لانے کی کوشش کرتے اور اسے ایک فن کی حیثیت سے قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ ابراہیم یوسف نے سچ لکھا ہے کہ ''اس کے باعث عرصے تک ڈراما فن شریف ہونے کے لیے ترستا رہا۔'' (۱۷) جب امانت لکھنوی نے اندر سبھا لکھا تو بدنامی سے بچنے کے لیے اس کی غزلوں میں امانت تخلص اختیار کرنے سے گریز کیا۔ کیوں کہ انھیں یہ اپنے شایان شان نہیں معلوم ہوا۔ خود ناصر لکھنوی اپنے تذکرے 'خوش معرکہ زیبا' میں لکھتے ہیں:

> ''اندر سبھا خوب چمکی اور مشہور خلائق ہوئی۔ جیسے کہ میر حسن کی مثنوی سے ہزار ہا عورتیں فاحشہ ہوگئیں ویسے ہی اس مثنوی اندر سبھا سے ہزار ہا مرد لوطی اور مغلم ہوگئے۔'' (۱۸)

صرف یہی نہیں بلکہ مولوی نذیر احمد نے بھی توبۃ النصوح میں اسے سوختنی اور دریدنی کتابوں میں شمار کیا ہے۔ عبدالحلیم شرر نے سب سے پہلے ہندوستانی مذاق کے قومی تھیٹر کی ضرورت محسوس کی مگر پارسی تھیٹر اس طرح ذہنوں پر چھا گیا کہ اردو ڈراما مغربی زلفوں کا اسیر ہوتا چلا گیا، اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اردو ڈرامے کے لیے مغربی تنقید کے اصول قبول کر لیے گئے اور خالص ہندوستانی ڈرامے اندر سبھا کو بھی مغربی تنقید کے اصولوں پر ہی پرکھا جانے لگا۔

اس میں شبہہ نہیں کہ مذکورہ کچھ اہم ڈرامہ نگاروں کی کوششوں سے اردو ڈرامے کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ مگر فکر و خیال کی پستی، سطحی رومانیت اور حسن و عشق کے فرضی قصوں کی وجہ سے اپنے لیے ادبی دنیا میں کوئی سنجیدہ مقام حاصل کرنے میں ڈراما ناکام رہا۔ اردو ڈرامے کو نئے افقوں سے روشناس کرانے والے آغا حشر کاشمیری ہیں جنھوں نے اپنی فنکارانہ صلاحیت اور تخلیقی بصیرت سے اردو ڈرامے کے معیار کو کافی بلند کیا اور سطحی

رومانیت کی جگہ ملک کے معاشرتی مسائل کو اپنے ڈراموں میں پیش کیا۔حشر نے پارسی کمپنیوں اور خود اپنی تھیریٹکل کمپنی کے لیے بہت سے ڈرامے لکھے جن میں ''اسیر حرص''،''شہید وفا''،'' یہودی کی لڑکی''، ''خواب ہستی''اور''رستم وسہراب'' قابل ذکر ہیں۔

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے شروع میں ڈرامے کی تنقید میں ایک زبردست انقلاب آیا۔اردو ڈراما نگاروں نے مافوق الفطری عناصر اور ماورائی دنیا کی پیش کش کے بجائے اسے زندگی کی حقیقتوں سے روشناس کرایا۔اس میں مافوق الفطری عناصر کے بجائے حقیقی زندگی کی الجھنوں، پریشانیوں اور سماجی و معاشرتی مسائل پیش کیے جانے لگے۔اس طرح اردو ڈراما حقیقت نگاری سے بہت قریب ہوگیا۔انسانی زندگی اور اس کے مسائل کا ترجمان ہونے کی وجہ سے ڈرامے کی تنقید کا بھی رخ بدل گیا۔اب اس کی خوبیاں اور خامیاں نفس مضمون کے پیش نظر بیان کی جانے لگیں۔اس میں خارجی عناصر کے ساتھ ساتھ داخلی عناصر پر توجہ دی جانے لگی اور اس کے تمثیلی پہلو پر بھی زور دیا جانے لگا۔

ہمیں سب سے پہلے ڈرامے کی تنقید کے ابتدائی نقوش مولانا محمد حسین آزاد کے ڈرامے اکبر کے دیباچے میں دکھائی دیتے ہیں۔اس دیباچے کو طاہر نبیرہ آزاد نے ۲۲ نومبر ۱۹۲۲ء کو کتاب کے شروع میں شامل کر کے شائع کیا۔وہ بھی ڈرامے کو مغربی معیار پر ہی پرکھتے ہیں۔انھیں اس بات کی شکایت ہے کہ اردو ڈراموں کے پلاٹ گتھے ہوئے نہیں ہوتے اور نہ ہی اس میں تراش خراش سے کام لیا جاتا ہے جو حقیقت نگاری کے ذریعے مغربی ڈرامے میں پیدا کی جاتی ہے۔کہانی اور پلاٹ یہاں بھی ہوتا ہے اور ناظرین کو کہانی کے کسی انجام تک پہنچنے کا کسی قدر انتظار بھی رہتا ہے لیکن یہاں کے ڈراما نگاروں کا مقصد اتنا منزل پر پہنچنا نہیں ہوتا جتنا راہ کے منظرنامے سے نئی کیفیات پیدا کرنا۔(۱۹)

ابتدا میں اردو کے معتبر محققین و ناقدین نے ڈرامے کو نہ تو فن شریف سمجھا اور نہ ہی اردو ڈراما نگاروں کو کوئی اہمیت دی جس کی وجہ سے ڈرامے کی تنقید بیسویں صدی کے نصف اول تک ناقدین کی توجہ سے محروم رہی۔ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جب ڈراموں میں عصری، سماجی، معاشرتی اور سیاسی مسائل پیش کیے جانے لگے تو ناقدین نے اس فن شریف کی طرف توجہ مبذول کی۔بیسویں صدی کے نصف آخر خصوصاً آزادی کے بعد ڈراموں کی تنقید

پر لکھا جانے لگا۔اس دوران جن افراد نے ڈرامے کی تنقید پر لکھا ہے ان میں عبدالعلیم نامی، بادشاہ حسین،صفدر آہ، احتشام حسین، فصیح احمد صدیقی، قمر رئیس، عطیہ نشاط، اخلاق اثر،محمد شاہد حسین، وقار عظیم،محمد تاتارخان،محمد قاسم،محمد منصور انصاری، شہناز صبیح اور ڈاکٹر فرحانہ وغیر کے نام قابل ذکر ہیں جنھوں نے ڈرامے کے فن، اسلوب اور زبان وبیان سے بحث کی ہے۔ہم ان میں سے چند اہم ناقدین کی تنقیدی کاوشوں کا تنقیدی جائزہ پیش کررہے ہیں۔

مسعود حسن رضوی ادیب ایک معتبر محقق ہیں انھوں نے نہ صرف یہ کہ متنی تنقید کے اصولوں کو بروئے کار لاتے ہوئے امانت لکھنوی کے اندر سبھا امانت کا بنیادی ومعتبر متن مع شرح اندر سبھا تیار کردیا بلکہ اس پر دوسو صفحات کا مبسوط مقدمہ لکھ کر تمام تفصیلات بھی پیش کردیں۔ یہ کتاب ''لکھنؤ کا عوامی اسٹیج'' کے نام سے شائع ہوئی۔ان کا دوسرا کارنامہ ''لکھنؤ کا شاہی اسٹیج'' ہے جو بنیادی طور پر ''رادھا کنھیا کا قصہ'' کا مقدمہ ہے۔اس میں انھوں نے واجد علی شاہ کی تمام ڈرامائی ونیم ڈرامائی کوششوں کی تفصیلات پیش کردی ہیں۔مسعود حسن رضوی ادیب اپنی تحقیق کی بنیاد مفروضات پر نہیں رکھتے بلکہ ہر بات کے لیے کوئی نہ کوئی معتبر حوالہ، کوئی ثبوت، کوئی قابل قبول منطقی جواز ضرور پیش کرتے ہیں۔

مسعود حسن رضوی ادیب نے اپنی تحقیق کی رو سے یہ نظریہ پیش کیا کہ واجد علی شاہ کا ''رادھا کنھیا کا قصہ'' اردو کا پہلا ڈراما ہے، گو کہ موصوف اردو کے بڑے محقق ہیں پھر بھی یہاں ان کو تھوڑا سہو ہوا۔ واجد علی شاہ ۱۸۴۲ء میں ولی عہد ہوئے۔اس وقت انھوں نے رادھا کنھیا کی زندگی پر منحصر ایک رہس ترتیب دیا جو مکمل ڈرامانہیں ہے۔ اس میں صرف رادھا اور کنھیا کی پرستش کی رسم ادا کی جاتی ہے۔معزول ہوکر واجد علی شاہ ۱۸۵۷ء میں مٹیا برج کلکتہ گئے تو وہاں انھوں نے ''رادھا کنھیا کا قصہ'' کے نام سے ایک ڈراما تصنیف کیا جو مکمل ڈراما ہے۔ دونوں کا بنیادی فرق اول الذکر کو ڈرامے کی فہرست سے خارج کرتا ہے اور موخر الذکر کو ڈرامے کی فہرست میں داخل کرتا ہے۔ بہرصورت مسعود حسن رضوی ادیب نے اس میں زیادہ تر تحقیقی مباحث پیش کیے ہیں تاہم کہیں کہیں تنقید کے عمدہ نمونے بھی پیش کیے ہیں جو ان کی تنقیدی بصیرت کے آئینہ دار ہیں۔

چار جلدوں پر مشتمل عبدالعلیم نامی کی کتاب ''اردو تھیٹر'' پارسی اسٹیج کے بارے میں معلومات کا خزانہ ہے، لیکن تحقیقی نقطہ نظر سے اس میں بہت سی خامیاں ہیں۔ نامی نے اس کتاب میں بہت سی باتیں بغیر کسی حوالے

اور بغیر ثبوت کے لکھ دی گئی ہیں۔عبد العلیم نامی اس کتاب میں ''گوپی چند جلندھر'' کو اردو کا پہلا ڈراما بتاتے ہیں۔اپنے اس قول کے ثبوت میں انھوں نے اس کھیل کی پیش کش کے اشتہار کی عبارت نقل کی ہے۔یہ اشتہار ۲۵/۲۶ ر نومبر ۱۸۵۳ء کو ''ٹیلی گراف'' میں شائع ہوا تھا،جس میں ڈرامے کے پیش کیے جانے کی ۲۶ ر نومبر ۱۸۵۳ء لکھا ہوا ہے۔نامی نے اردو ڈرامے کی تنقید میں غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔انھوں نے اردو ڈراموں کی ببلیوگرافی بھی تیار کی اور اردو تھیٹر کے حوالے سے قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔وہ اپنی کتاب اردو تھیٹر جلد اول کے مقدمے میں رقمطراز ہیں:

''میں نے اپنا مقالہ بنیادی اصول پر لکھنے کی کوشش کی ہے اور اس میں تبصرہ اور ذاتی رائے سے احتراز کیا ہے۔اس مقالہ کو بنیادی اصول پر لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ نوجوان محققین کے لیے نئی نئی شاہراہیں پیدا کی جائیں اور جو ادوار قائم کیے گئے ہیں ان پر نہ صرف مزید ریسرچ کی جائے بلکہ ان کی جزوی خصوصیات پر بھی مقالے لکھے جائیں تاکہ ڈرامائی ادب اور اردو تھیٹر اپنے اصلی اور تاریخی رنگ میں آئندہ نسلوں تک پہنچے۔''(۲۰)

وہ آگے لکھتے ہیں:

''اردو اسٹیج پر صرف دو قسم کے ڈرامے دکھلائے جاتے رہے ہیں۔المیہ اور طربیہ۔کبھی چپ ناٹک بھی دکھلائے جاتے تھے لیکن وہ اردو داں طبقے میں مقبول نہیں ہوئے۔اردو اسٹیج پر منظوم ڈراموں نے کافی شہرت پائی۔کیوں کہ حکمراں اور سرمایہ دار طبقہ کا مزاج ہی عاشقانہ ہوتا ہے۔مالکان تھیٹر بھی ان کی تیاری پر بے حساب روپیہ صرف کرتے تھے۔''(۲۱)

انھوں نے اپنی کتاب میں ہندوستانی تھیٹر،ہندوستانی اسٹیج کا آغاز،انگریزوں کے تمدنی اثرات، انگریزوں کے سیاسی اثرات،انگریزی تھیٹر کی ابتدا،انگریزی،مرہٹی،گجراتی اور اردو ڈرامے،اردو تھیٹر کا آغاز، ڈرامے کے اقسام اور اہم اردو ڈراموں پر بحث کی ہے۔کتاب بڑی اہم ہے اس میں انھوں نے دوسرے محققین و

ناقدین کے خیالات ونظریات کے ابراز کے بعد بے لاگ اپنی رائے پیش کی ہے۔

ڈاکٹر فصیح احمد صدیقی نے اردو کے یک بابی ڈرامے کی تاریخ تقریباً پندرہ سو صفحات میں مرتب کی ہے۔ یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر صدیقی نے ڈرامے کی تنقید وتحقیق پر جو خیالات پیش کیے ہیں یا اردو ڈراموں پر جو تبصرہ کیا ہے ان سے اختلاف کی گنجائش تو ہے مگر ان کے اس کام کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ ہزاروں یک بابی ڈرامے جو رسالوں کے اوراق میں گم تھے اور جن میں سے بعض دیمکوں کی نذر ہو رہے تھے، انھیں تلاش کر کے یک جا کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ انھوں نے یہ کام بڑی جانفشانی سے کر کے اردو ڈرامے پر احسان کیا ہے۔ وہ اردو کے یک بابی ڈرامے کی سیریز (ا) کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''اردو زبان میں طویل ڈرامے کی عموماً اور یک بابی ڈرامے کی خصوصاً کبھی بھی کلی پذیرائی اور حوصلہ افزائی نہیں ہوئی، ڈرامے کی جانب یہ غیر معمولی بے التفاتی بہت سے منفی عوامل کا ثمرہ ہے......حقیقتاً ان عوامل نے اہل اردو میں بعض ایسی غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں جن کا ازالہ اشد ضروری ہے۔'' (۲۲)

ڈرامے کی تنقید پر عشرت رحمانی کی دو کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔ ''اردو ڈرامے کی تاریخ وتنقید'' اور ''اردو ڈراما کا ارتقا''۔ دوسری کتاب کو پہلی کتاب کا ہی دوسرا ایڈیشن قرار دیا جا سکتا ہے جس میں معمولی تبدیلی کے بعد دو نئے باب شامل کر دیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے ڈرامے کے فن، تکنیک اور اجزائے ترکیبی کے ساتھ اردو ڈرامے کی تاریخ پر جامع بحث کی ہے۔ کتاب کے آخر میں بعض اہم ڈراموں کے انتخابات بھی پیش کیے گئے ہیں۔ وہ اس کتاب کے شروع میں ہی 'فریاد کی لے' کے عنوان سے اردو ڈراما نگاری اور اس کی تنقید پر ان الفاظ میں ماتم کرتے ہیں:

> ''آج اردو ڈراما کا تذکرہ کرتے ہوئے صرف ماضی کی داستان اور قدیم اسٹیج وتھیٹر کی کہانیاں دہرائی جاتی ہیں کیوں کہ اس کا کوئی متعین حال ہے اور نہ مستقبل کی خوش آئند توقع! دنیا میں کہیں بھی ایسی عجیب وغریب حالت فن ڈراما کی دیکھنے میں نہیں آتی۔ جو ہمارے یہاں ہے۔'' (۲۳)

عشرت رحمانی کی اس کتاب میں بعض مقامات پر مضامین کی تکرار بھی ملتی ہے اور بعض مقامات پر بہت اجمال سے بھی کام لیا گیا ہے۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جہاں کہیں تکرار دکھائی دیتی ہے وہ گزشتہ سے پیوستہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ دونوں کتابیں اردو ڈرامے کی تاریخ مرتب کرنے کی سنجیدہ کوشش ہیں۔

محمد اسلم قریشی کی کتاب ''ڈرامے کا تاریخی وتنقیدی پس منظر'' جو مجلس ترقی ادب، لاہور سے ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی تحقیقی نقطہ نظر سے بہت وقیع ہے، اس میں مغربی اور مشرقی دونوں ڈراموں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس میں ہر بات کے لیے مستند حوالے موجود ہیں۔ کتاب کے مطالعے سے اسلم قریشی کے مطالعے کی وسعت اور تنقیدی شعور وبصیرت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے ڈرامے کی تنقیدی تاریخ پیش کی ہے اور ڈرامے کے منظر اور پس منظر پر استدلالی بحث کی ہے۔ اس کتاب کی اہمیت اس وجہ سے اور بڑھ جاتی ہے کہ اس میں انھوں نے تاریخ کے ذیل میں صحتمند تنقید سے بھی بھرپور کام لیا ہے۔ بعض مقامات پر انھوں نے بعض ڈراموں کی خوبیوں کا جی کھول کر تذکرہ کیا ہے لیکن اس بات کا بھی خیال کیا ہے کہ جہاں کہیں ان ڈراموں میں خامیاں اور کمیاں درآئی ہیں ان سے صرف نظر بھی نہیں کیا ہے۔

پروفیسر سید حسن کی کتاب ''بہار کا اردو اسٹیج اور اردو ڈراما'' پہلی بار مئی ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں مصنف نے بہار کے اردو ڈرامے اور تھیٹر کی تاریخ بہت کامیابی کے ساتھ پیش کی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے محمود میاں رونق، الف خاں حباب، حسینی میاں ظریف اور سید مہدی حسن احسن لکھنوی کی ڈراما نگاری پر مختلف وقتوں میں لکھے اپنے مضامین بھی شامل کر دیے ہیں۔ ان کی شمولیت سے کتاب کی اہمیت دوچند ہوگئی ہے۔

ابراہیم یوسف نے ''اردو کے اہم ڈراما نگار'' کے نام سے تین جلدوں میں ایک کتاب تصنیف کی۔ ان کی دوسری تصنیف ''اندر سبھا اور اندر سبھائیں'' ہے جس میں انھوں نے چار اندر سبھاؤں کی ترتیب دی ہے۔ اس کے مقدمے میں ان سب کا موازنہ بھی کیا ہے۔ تحقیقی نقطہ نظر سے ان کا کام اس لیے اہم ہے کہ انھوں نے حوالے کے لیے بنیادی ماخذ کا استعمال کیا ہے اور کوئی بات بغیر حوالے کے نہیں کہی ہے۔

اس دور کے ڈراموں پر تنقید لکھنے والوں میں احتشام حسین، مسیح الزماں اور محمد حسن کے نام قابل ذکر ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ڈرامے میں بھی عصری مسائل پیش کیے جانے لگے۔ سماجی، معاشرتی اور

سیاسی مسائل اردو ڈرامے کا موضوع بنے۔ترقی پسند ناقدین نے بھی اردو ڈرامے میں تفریحی عناصر کی جگہ سماجی مسائل اور فکر کی گہرائیوں کی طرف توجہ کی اور انھیں سماجی نقطہ نظر سے جانچا اور پرکھا۔لیکن ان ناقدین کے یہاں صحتمند تنقید کا فقدان ہے۔دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان ناقدین نے ڈرامے کے کسی ایک پہلو کو لیا ہے اور اسی پر سارا زور صرف کرکے اس ڈرامے کے متعلق اپنی رائے پیش کردی ہے۔جیسا کہ عبدالعلیم نامی اندرسبھاؤں کو ڈرامانہیں مانتے اور پارسی تھیٹر کے ڈراموں کے ایسے مداح ہیں کہ ان میں پائی جانے والی خامیاں اور کمیاں بھی انھیں خوبیاں نظر آتی ہیں۔

صفدر آہ کے نزدیک پارسی تھیٹر ہندوستانی روح،قومی کلچر اور آرٹ سے عاری نظر آتا ہے۔وہ مغرب سے اس قدر متاثر ہیں کہ اسے خالص انگریزوں کا مرہون منت قرار دیتے ہیں۔کہا جا سکتا ہے کہ ان کے ادبی اور تنقیدی کارناموں نے ڈرامے کی تنقید کو ایک نئی ثروت مندی عطا کردی۔انہوں نے ہماری ادبی جولانیوں کی سطح کو بلندی،فکری افق کو وسعت اور علمی دلچسپیوں کو آفاقیت عطا کی۔ان کا قلم کم وبیش چالیس برس رواں دواں رہا۔ان کی تنقیدی بصیرت ان کی تمام تحریروں میں جھلکتی ہے اور جب انھوں نے ڈراموں کی تنقید شروع کی تو اس میں بھی تخلیقی ذہانت اور سرگرمی کی چمک پیدا کردی۔

انہوں نے مشرقی ومغربی ڈراموں کو ہمیشہ اس کے فکری وتہذیبی تناظر میں دیکھا۔کسی تہذیب کے سفر کی ہر کروٹ کو وہ اس کے ادب میں دیکھتے تھے۔کسی نے صحیح لکھا ہے کہ علامہ اقبال کے بعد تاریخ،تہذیب اور عالمی ادب کے مسائل اور ان کی پیچیدگیوں کو صفدر آہ سے زیادہ کسی نے نہیں سمجھا۔کسی قوم کی تہذیبی شناخت ادب میں کس طرح منعکس ہوتی ہے اور ادب کو پرکھنے اور جانچنے کے تمام آلے (Tools) تہذیب سے کس طرح فراہم ہوتے ہیں یہ راز صفدر آہ نے بتایا۔اردو ڈراموں کے تنقیدی مباحث میں اس بات کو اتنے مدلل انداز سے پیش کیا کہ بالآخر اہل ادب ودانش کو ان کی تنقیدی بصیرت تسلیم کرنا پڑی۔

احتشام حسین نے بھی ڈراموں کی تنقید میں حصہ لیا ہے۔ان کی تنقید سائنٹفک ہے۔یہ پہلے نقاد ہیں جنھوں نے مارکسی نظریات پر سائنٹفک تنقید کی بنیاد استوار کی۔سائنٹفک تنقید سے مراد یہ ہے کہ جس طرح سائنس کسی چیز کے تجزیہ کے وقت اس کے ہر پہلو کو سامنے رکھتی ہے،اسی طرح سائنٹفک تنقید بھی ادب کے مطالعہ کے

وقت اس کے ہر پہلو کو مدنظر رکھتی ہے، نیز تنقید کی بنیاد سماجی، نفسیاتی، جمالیاتی، تاثراتی، مادی وجدلیاتی حقیقتوں پر رکھی گئی ہے۔ یہی سبب ہے کہ احتشام حسین ڈراموں کے مطالعے کے لیے ہر قسم کے علم سے مدد لینا ضروری سمجھتے ہیں مثلاً تاریخ، نفسیات، سیاسیات، عمرانیات اور سائنس وغیرہ اور وہ ادب کو سماجی، تاریخی، تہذیبی، معاشی، اخلاقی اور معاشرتی، قدروں کا آئینہ سمجھ کر اس کا تجزیہ کرتے ہیں، ادب کی غایت ان کے یہاں اجتماعی اور سماجی ہے، جو کہ زندگی کو فلاح و بہبود، حسن و مسرت اور دلکشی اور شادمانی عطا کرنے کے لیے ہے۔ وہ اپنے ایک مضمون 'جدید اردو ڈراما اور اس کے بعض مسائل' مطبوعہ آج کل میں لکھتے ہیں:

''اردو کے یہ ڈرامے (قدیم ڈرامے) فکر وفن دونوں کی بلندی سے محروم تھے۔۔۔ پارسی تھیٹر کمپنیوں کے ڈراما نگار اپنا مواد عصری زندگی کی کشاکش سے حاصل نہیں کرتے تھے۔'' (۲۴)

بادشاہ حسین نے بھی اردو ڈراموں کی تنقید میں قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ وہ ادب کو صرف مقصد کا آلہ کار نہیں سمجھتے بلکہ اس کو فنی معیار پر بھی جانچتے اور پرکھتے ہیں اور اسے سماجی نقطہ نظر سے بھی دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک معیاری ادب وہ ہے جو سماجی نقطہ نظر سے مفید اور عوام کی امنگوں کی ترجمانی کرنے کے ساتھ فنی معیار پر بھی پورا اترتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ڈراموں کے حوالے سے جو کچھ بھی تحریر کیا ہے اس میں مذکورہ بالا باتوں کا خاص خیال رکھا ہے۔ وہ اپنی کتاب ''اردو میں ڈراما نگاری'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''بعض متاخرین ڈرامائی اثر کے سمجھنے اور واقعات کو ڈرامائی رنگ میں پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ اس لیے اردو کے بہت سے ڈرامے ایسے ہیں جنھیں ڈراما کہتے ہوئے تکلف ہوتا ہے۔'' (۲۵)

ان کے بعد اردو ڈراما نگاری پر لکھنے والوں میں عطیہ نشاط، قمر اعظم ہاشمی، نثار احمد فاروقی، ظہور الدین، ابراہیم یوسف، محمد حسن اور شمیم حنفی وغیرہ کے نام اہم ہیں جنھوں نے ڈراموں کے حوالے سے متوازن اور سلجھی ہوئی گفتگو کی ہے۔ ان افراد نے ڈرامے کے فن اور اس کی تاریخ نیز ڈراموں کی عملی تنقید کے بھی اچھے نمونے پیش کیے ہیں۔ ڈرامے کی تنقید پر آج بھی رسالوں میں مضامین دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ لیکن جس قدر افسانے اور ناول

کی تنقید لکھی جا رہی ہے، ڈرامے کی تنقید اس سے محروم ہے۔ کیوں کہ اب آہستہ آہستہ ڈراموں سے دلچسپی بھی کم ہوتی جا رہی ہے۔ جب لوگ ڈراموں کو دلچسپی سے پڑھیں گے ہی نہیں تو اس پر لکھنے تو اور بھی مشکل ہے۔ بہر صورت ڈرامے کی تنقید کا مستقبل بہت تابناک نہیں ہے۔

☆☆☆

(ج) تمثیل کی تنقید

اردو فکشن کی تنقید میں تمثیل کی تنقید بھی اہمیت کی حامل ہے۔ تمثیل سے ایسا اندازِ تحریر مراد ہے جس میں تشبیہات واستعارات سے کام لیا جاتا ہے اور موضوع پر براہ راست بحث کرنے کے بجائے اسے تخیلی اور تصوراتی کرداروں کے ذریعہ بیان کیا جاتا ہے۔ اس کا تعلق روزمرہ کے مسائل اور انسان کے عقائد و تجربات سے ہوتا ہے۔ عموماً اسے کسی خاص روحانی یا اخلاقی مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جانسن کے بقول ''تمثیل سے مراد ایک ایسا انداز بیان ہے جس میں اکثر غیر ذی روح اور غیر ذی عقل اشیا کو ذی روح بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔'' اس کے ذریعہ انسان کے اخلاق وعادات اور جذبات کے تزکیے و اصلاحات مقصود ہوتی ہیں۔

بہ الفاظ دیگر تمثیل نگاری اس فن کا نام ہے جس کے ذریعہ کسی عشقیہ، اخلاقی، سیاسی یا مذہبی حکایت یا واقعۂ تاریخی سے تعلق رکھنے والے افراد کے کردار، طرز کلام، بود و باش، ماحول اور لباس وغیرہ کی ہو بہو نقل اتاری جاتی ہے۔ تمثیل نگار اپنے اس فرض کو نبھانے کی پوری پوری کوشش کرتا ہے کہ اس کے افراد کے کارناموں اور ان پر گزرنے والے حالات و واقعات کو اصل وضع قطع، رنگ ڈھنگ اور خو بو میں پیش کرے۔ گویا تمثیل کے لیے ضروری ہے کہ اسے ہر اعتبار سے حقیقت اور فطرت کے ساتھ مکمل مطابقت ہو۔ ارسطو نے کہا ہے کہ انسان فطری طور پر محاکات یعنی تمثیل، نقل، شبیہ، مشابہت یا تقلید پسند کرنے والا واقع ہوا ہے۔ اسی لیے جب بندر انسان کے افعال کی نقل کرتا ہے یا بچہ بڑوں کی نقل اتارتا ہے یا طوطا انسانی آوازوں کی پیروی کرتا ہے تو ہم سب کو یک گونہ لطف محسوس ہوتا ہے اور یہی لطف ہے جو ہمارے جذبات پر ایک گہرا اور رنگین سا نقش چھوڑ جاتا ہے۔

اگرچہ اردو میں تمثیل نگاری کی روایت بڑی قدیم ہے لیکن جب ہم ان تمثیلوں کی تنقید کے حوالے نظر کرتے ہیں تو گنتی کی کتابیں، چند مقالات، مقدمے اور تبصرے کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا۔ ڈاکٹر منظر اعظمی نے البتہ اس فن پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب میں منظر اعظمی نے تمثیل کے فن اور بعض تمثیلی کتابوں پر تحقیقی و تنقیدی بحث کی ہے۔ اس کتاب کو ہم تمثیل کی تنقید کے حوالے سے بنیادی کتاب قرار دے سکتے ہیں جو باضابطہ طور پر کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اپنی کتاب اردو فکشن کی تنقید میں تمثیل کی تنقید پر اب تک جو

مضامین، مقالات، اور کتابیں دستیاب ہو سکے ہیں انھیں تاریخی ترتیب کے لحاظ اس طرح پیش کیا ہے:

خطبات گارساں دتاسی، ۱۸۵۴/۵۸ء

محمد حسین آزاد، ۱۸۸۰ء، نیرنگ خیال

عبدالحق، ۱۹۳۲/۲۵ء، رسالہ اردو، شمارہ اپریل

محمود شیرانی، ۱۹۳۴ء، اورینٹل کالج میگزین، شمارہ نومبر

عزیز احمد، ۱۹۵۰ء، رسالہ اردو، شمارہ اپریل

گیان چند جین، ۱۹۵۴/۶۴ء، اردو کی نثری داستانیں

سلام سندیلوی، ۱۹۶۰ء، نیا دور، شمارہ جون

حامد چھپروی، ۱۹۶۳ء، شاعر

جمیل جالبی، ۱۹۷۷ء، تاریخ ادب اردو

منظر اعظمی، ۱۹۷۷ء، اردو میں تمثیل نگاری

جعفر رضا، ۱۹۷۷ء، نیرنگ خیال (ترتیب)

غلام رسول مکرانی، ۱۹۸۸ء، اردو ادب میں تمثیل نگاری

مذکورہ فہرست میں منظر اعظمی اور غلام رسول مکرانی کی تصنیفات کے علاوہ باقی تمام مقالات و مضامین ہیں جو اردو تمثیل کے کسی نہ کسی نہج پر قلمبند کیے گئے ہیں۔ اردو کے اکثر ناقدین نے تمثیل کی تنقید سے گریز کیا ہے اور اس کی افہام و تفہیم کی سعی نہیں کی ہے۔ ان میں سے اکثر ناقدین نے تمثیل کی تنقید پر مغربی افکار و نظریات اور وہاں کے اصول و ضوابط پر اردو تمثیلوں کو جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ بعض افراد تو اس قدر مغرب سے مرعوب ہو گئے کہ اسے انگریزی سے مستعار صنف ادب قرار دے دیا۔ اب آیئے مذکورہ تنقیدی سرمایے پر ایک تنقیدی نظر ڈالیں اور ان کے خالقین کی تنقیدی صلاحیتوں سے متعلق کوئی رائے قائم کریں۔

یوں تو ۱۹۱۳ء سے ہی رسالہ ''اردو'' کے ذریعے گارساں دتاسی کے خطبات کی اشاعت شروع ہو گئی تھی لیکن یہ پہلی بار یہ خطوط کتابی شکل میں ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئے۔ مقالات کی اشاعت ۱۹۴۳ء میں عمل میں آئی۔

گارساں دتاسی (۱۷۹۴ـ۱۸۷۸ء) فرانسیسی دانشوروں میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس نے اس زمانے میں ہندوستانی ادب پر خصوصی توجہ صرف کی، جب ایسی سرگرمیاں خود ہندوستان میں بھی موجود نہیں تھیں۔اس زمانے میں اردو زبان سے متعلق ایسے جامع اور معلوماتی وتحقیقاتی خطبات دیے جو آج بھی ہماری زبان کا ایک اہم ترین حصہ تصور کیے جاتے ہیں۔یہ خطبات جو فرانسیسی زبان میں دیئے گئے تھے ۱۹۱۳ء سے ہی رسالہ ’اردو‘ میں شائع ہوتے رہے۔پروفیسر ثریا حسین کی کتاب کے پیش لفظ میں محمد رضا انصاری رقمطراز ہیں:

> ’’پروفیسر دتاسی کی ہندوستانی زبان کی تاریخ ایک ایسی شمع ثابت ہوئی جس سے ہندوستانی مصنفین نے اپنے اپنے چراغ روشن کیے۔اردو شعرا کا وہ تذکرہ جسے کریم الدین نے ۱۸۴۷ء میں طبقات شعرائے ہند کے نام سے مرتب اور مشتہر کیا، حقیقی معنوں میں تذکرہ اس لیے قرار پایا کہ اس نے پروفیسر دتاسی کی دکھائی ہوئی راہ پر چل کر بلکہ بڑی حد تک اس کی تاریخ سے اخذ کر کے اسے تقریظ یا تنقیص کی پرانی ڈگر سے ہٹا کر تاریخ کا مرتبہ دیا۔‘‘(۲۶)

دتاسی فرانس میں رہ کر اور ہندوستان کا سفر کیے بغیر اس زمانے میں جب ابلاغ وترسیل کے ذرائع اتنے وسیع نہیں تھے، بڑی محنت ومشقت اور ذوق وشوق کے ساتھ اردو زبان وادب کی تحقیق وتنقید میں مصروف رہا۔اس کے خطبات اور مقالات نے اس کم عمر زبان کو بہت جلد فرانس اور دوسرے مغربی ممالک میں روشناس کرایا۔اس نے اپنے خطبات میں جہاں اردو زبان وادب کے دوسرے گوشوں پر روشنی ڈالی ہے وہیں اردو کی ایک تمثیل کا ذکر کرتے ہوئے اسے انگریزی کی مشہور تمثیل ’پلگرامس پراگرس‘ سے مشابہ قرار دیا ہے۔وہ اپنے ایک خطبے میں کہتا ہے:

> ’’الہ آباد کے اخبار ’امین الاخبار‘ کے مدیر نے جن کا نام عزیز الدین خان ہے Pilgrim's Progress کے طور پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ’’جواہر اصل‘‘ رکھا ہے۔اس کی عبارت میں نثر اور نظم دونوں ملی ہوئی ہیں۔‘‘(۲۷)

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ عزیز الدین کی جس کتاب کا تذکرہ گارساں دتاسی نے کیا ہے اس کا اصل نام 'جواہر عقل' ہے۔ یہاں اس سے تسامح ہوگیا ہے۔ اسی خطبے میں وہ آگے چل کر رقمطراز ہے:

> ''اسی قسم کی ایک کتاب کریم الدین نے لکھی ہے جس کا نام 'تکریم ظہوری' رکھا ہے۔ یہ 'تشریح ظہوری' کے بعد لکھی گئی ہے جس کی نسبت میں پہلے ذکر کر چکا ہوں۔ ان دونوں میں نثر دوم ظہوری کی تشریح کی گئی ہے۔ (۲۸)

اس نے اپنے خطبات میں صرف ایک جگہ لفظ تمثیل کا استعمال کیا ہے، لیکن اس کی وضاحت نہیں کی ہے۔ اس کے بعد محمد حسین آزاد نے تمثیلی نوعیت کی کتابیں اور مقالات لکھے۔ آزاد نے تمثیل کے پردے میں مذہب و اخلاق، علم و فن اور شعر و ادب کے نکات بڑی پرکاری اور چابک دستی سے پیش کیے۔ انہوں نے مجرد خیالات کو متشکل اور مجسم کر کے پیش کیا ہے۔ ان کو انسانی خصوصیات سے آراستہ کر کے دکھایا ہے۔ مثلاً آرام، مشقت، حرص، قناعت، سچ، جھوٹ، امید، یاس، بڑھاپا اور بچپن وغیرہ کو انسانی پردے میں پیش کیا ہے۔ نیرنگ خیال میں شامل مولانا کا دیباچہ تمثیل کی تنقید میں خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ اگرچہ انھوں نے بھی اس قسم کی کتابوں کا کوئی جواز پیش نہیں کیا ہے اور نہ ہی پوری کتاب میں ایک بھی مقام پر لفظ تمثیل کا استعمال کیا ہے، لیکن اس سلسلے میں جو اشارات کیے ہیں وہ تمثیل کی تنقید کے لیے رہنما کا کام کر سکتے ہیں۔

نیرنگ خیال میں جتنے مضامین شامل ہیں وہ دراصل انگریزی سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔ ان میں سے چھ مضمون جانسن کے ہیں، تین ایڈیسن کے اور بقیہ دوسرے انگریزی ادیبوں کے۔ لیکن ان ترجموں میں آزاد نے اپنی ذہانت اور سحر بیانی سے اتنا ردو بدل کر دیا ہے کہ ان کا درجہ ترجمے سے بڑھ کر تخلیق کا ہوگیا ہے۔ دنیا کی مختلف زبانوں کے قدیم ادب میں تمثیل بہت مقبول رہی ہے۔ آزاد نے یہ مضامین ۱۸۷۵ء میں لکھنا شروع کیے تھے۔ ان میں سے بعض انجمن مفید عام، قصور (ضلع لاہور) کے ماہانہ پرچے ''رسالہ'' میں ۱۸۷۵ء سے لے کر ۱۸۷۷ء تک کے متفرق شماروں میں شائع ہوئے تھے۔ ان کا مجموعہ حصہ اول کی شکل میں ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا۔ جیسا کہ اس کے سرِ ورق پر حصہ اول کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کا ارادہ حصہ دوم بھی مرتب کرنے کا تھا لیکن زندگی نے مہلت نہیں دی۔ اس کتاب کے جو ایڈیشن مولانا محمد حسین آزاد کی زندگی میں شائع ہوئے، ان میں یہ التزام کیا گیا تھا کہ

جہاں صفات کسی شخص یا کردار کی حیثیت سے مراد ہیں، وہ الفاظ جلی لکھے گئے تھے، تاکہ جہاں وہ اپنے لغوی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں، ان سے امتیاز ہو جائے۔ وہ ان مضامین کی بابت خود لکھتے ہیں:

''زبان انگریزی میں نظم کا طور تو کچھ اور ہی ہے، مگر نثر میں بھی خیالی داستانیں یا اکثر مضامین خاص خاص مقاصد پر لکھے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی وسعت خیال اور پرواز فکر اور تازگی مضامین اور طرز بیان کا انداز قابل دیکھنے کے ہے۔''(۲۹)

پھر آگے بھی وہ لکھتے ہیں:

''میں نے انگریزی انشا پردازوں کے خیالات سے اکثر چراغ روشن کیا ہے۔ بڑی بڑی کتابیں ان مطالب پر مشتمل ہیں جنہیں یہاں (اِسسے) اب مضمون کہتے ہیں۔ ان میں انواع واقسام کی غرضیں ملحوظ ہیں۔ مگر بہت سے مضامین ایسے ہیں۔ جن کی روشنی ابھی ہمارے دل ودماغ تک نہیں پہنچی۔ بعض مضامین وہ ہیں جن میں انسان کے قوائے عقلی یا حواس یا اخلاق کو لیا ہے۔ انھیں انسان یا فرشتہ یا دیو یا پری تصور کیا ہے، اور ان کے معاملات اور ترقی وتنزلی کو سرگزشت کے طور پر بیان کیا ہے۔ ان میں شگفتگی طبع کے علاوہ یہ غرض رکھی ہے کہ پڑھنے والے کو کسی صفت پسندیدہ پر رغبت اور کسی خلق بد سے نفرت ہو، یا کسی حصول مطلب کے رستے میں جو نشیب وفراز آتے ہیں ان سے واقف ہو۔ اگرچہ اس میں طرز بیان کا طور وہ نہیں جو ہم اردو فارسی میں پڑھتے ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اگر کوئی فصیح اردو پر قادر ہو، تو انھیں پڑھے اور ان کے رنگ سے اپنے کلام کے چہرہ حال کو ایسے خط وخال سے آراستہ کرے کہ خاص وعام کی نظروں میں کھب جائے۔''(۳۰)

مذکورہ بالا دونوں اقتباسات سے جو نیرنگ خیال کے دیباچے سے اخذ کیے گئے ہیں پورے طور پر نہ تو تمثیل کی تعریف سمجھ میں آتی ہے اور نہ ہی اس کے فن سے متعلق کوئی معتبر رائے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ جس طرح

انگریزی میں اسسے لکھے جاتے ہیں اسی قسم کے مضامین اردو میں لکھے جائیں تو اس سے اردو زبان کو بڑا فائدہ ہوگا۔اس طرح اس کے ذریعہ اردو میں انشا پردازی کو فروغ مل سکتا ہے۔اس ہلکے سے اشارے کے علاوہ پورا دیباچہ پڑھ جایئے تمثیل کے فن تعلق سے کوئی بات بھی آپ کو نہیں ملے گی۔

دیباچے کے علاوہ نیرنگ خیال کے صرف ایک مضمون بہ عنوان اردو اور انگریزی انشاپردازی پر کچھ خیالات میں اس کی طرف ہلکا سا اشارہ کیا گیا ہے۔اس مضمون میں وہ متھالیجی یا علم الاصنام کو وہ تمثیل نگاری کے مترادف قرار دیتے ہیں۔اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ بذات خود تمثیل سے چنداں واقف نہیں تھےاور اگر تھے بھی تو اس پر بحث ومباحثے کو ضروری نہیں سمجھتے تھے۔جب کہ گیان چند جین نے بغیر کسی مستند حوالے کے ان کو فن تمثیل کا سب سے پہلا ناقد قرار دیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''اردو میں کئی صدیوں تک تمثیل نگاری ہوتی رہی،لیکن انیسویں صدی کے آخر میں محمد حسین آزاد نے اردو والوں کو اس کا درک دیا۔اس کی تکنیک بتائی،اس کا نام سمجھایا۔''(۳۱)

جین صاحب نے نہ جانے کہاں سے یہ باتیں لکھی ہیں۔راقمہ کو تلاش بسیار کے باوجود آزاد کی کوئی ایسی تحریر نہیں ملی جس میں ان خیالات کا اظہار کیا گیا ہو۔بہرصورت محمد حسین آزاد نے جو فن تمثیل پر اشارات کیے ہیں وہ قابل توجہ ہیں اور ان کی تاریخی اہمیت سے کسی کو انکار ممکن نہیں ہے۔

اس کے بعد ہماری نظر مولوی عبدالحق کے مقدمہ سب رس پر جاتی ہے۔جو سب رس کے متن کے ساتھ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔اردو میں بلند پایہ محقق اور نقاد کا منصب مولوی صاحب کو ان کے مقدمات ہی کی بدولت ملا ہے اور مقدمات ہی نے انہیں اردو تحقیق وتنقید کی تاریخ میں زندۂ جاوید بنایا ہے۔انھوں نے سب سے پہلے اسے مضمون کی صورت میں رسالہ 'اردو' کے شمارہ اپریل ۱۹۲۵ء میں شائع کیا تھا۔ان کا یہ مقدمہ تحقیقی ہے تاہم تنقیدی مباحث بھی در آئے ہیں۔اردو میں ادبی تحقیق وتنقید کا اعلیٰ معیار بھی اول اول مولوی صاحب کے مقدمات سے نمودار رہا ہے۔ان کے مقدمات سے عملاً پہلی بار اس بات کا اظہار ہوا کہ بے جا کوہ کنی یا خواہ مخواہ بال کی کھال نکالنے کو تحقیق نہیں قرار دیتے۔تحقیق کا اصل کام اہم حقائق کی نشان دہی اور ادب اور ادیب کی رہنمائی ہے۔اس

رہنمائی کا ادبی ذوق وشعور اور تنقیدی شعور سے گہرا رشتہ ہے، اگر اس رشتے سے محقق بے نیاز ہو جائے تو پھر اس کی تحریر میں ادبیت نہیں رہتی۔

مولوی عبدالحق کسی کتاب کو مرتب کرنے سے پہلے عموماً اس کا تعارف رسالہ ''اردو'' میں کراتے تھے۔ ملا وجہی کی ''سب رس'' پر بھی انہوں نے اکتوبر ۱۹۲۴ء میں ایک مضمون بعنوان ''اردو نثر کی ایک قدیم کتاب: سب رس'' لکھا جس میں کتاب کی قدامت کا ذکر انہوں نے ان الفاظ میں کیا ہے: ''اب تک اردو نثر کی پہلی کتاب فضلی سے منسوب کی جاتی تھی اور اس کی کربل کتھا اردو نثر کی پہلی کتاب سمجھی جاتی تھی لیکن حال ہی میں معلوم ہوا کہ فضلی سے کہیں پہلے نثر میں بہت سی کتابیں لکھی گئی تھیں مگر پردہ اخفا میں تھیں۔ تحقیق وجستجو نے اب انہیں گمنامی سے نکالا ہے۔ انہی میں ایک قابل قدر کتاب ''سب رس'' ہے۔''

مولوی عبدالحق کی تحقیق ہے کہ ملا وجہی سے قبل بھی یورپ اور برصغیر کے بعض مصنفین وشعرا نے اس قصے کا فارسی، ترکی اور انگریزی وغیرہ میں ترجمہ کیا ہے۔ البتہ ملا وجہی کو اردو میں یہ قصہ تمثیل کرنے کی اولیت حاصل ہے اور ماخوذ ہونے کے باوجود وجہی نے اسے طبع زاد کے قریب تر کر دیا ہے۔ یہ قصہ تمثیلی انداز سے پند ونصائح کا مرقع بھی ہے اور حسن وعشق کی داستان بھی ہے۔ وہ مقدمے میں یہ بھی لکھتے ہیں:

> ''سب رس میں قصے کا خاتمہ مگھم بلکہ مبہم ہو کے رہ جاتا ہے۔ دستور عشاق میں فتاحی خضر کی زبان سے تمام اسرار کی حقیقت کھولتا ہے اور بتاتا ہے کہ ''تو'' کیا ہے۔ رزق، توبہ اور زہد کون ہیں۔ نظر، ہمت، رقیب، قامت، زلف، وفا اور غیر سے کیا مطلب ہے۔ گلشن، رخسار اور شہر دیدار کیا ہیں اور عقل وعشق کی کیا حقیقت ہے۔ غرض تمام تمثیل پر سے جو ہم پڑھتے آئے ہیں، آخر میں مجاز کا پردہ اٹھا دیتا ہے اور حقیقت کا جلوہ دکھا دیتا ہے۔ جن چیزوں کو ہم قصہ سمجھتے تھے وہ معارف کے رنگ میں نظر آنے لگتی ہیں اور اس ترکیب سے داستان کے تمام اسرار حل ہو جاتے ہیں۔'' (۳۲)

وہ اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آب حیات جس پر قصے کی بنیاد ہے اور جس کی آرزو میں تمام فتنے وفساد برپا ہوتے ہیں اور طرح طرح کی آفتیں نازل ہوتی ہیں، وہ سب سب رس میں آخر تک مکھم سا رہتا ہے اور تمثیل کسی قدر ناقص اور تشنہ رہ جاتی ہے۔ دستورعشاق میں خضر نے اس گتھی کو بھی سلجھایا ہے اور تمثیل کی تکمیل بھی کردی ہے۔''(۳۳)

اس اقتباس میں جو چیز سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ تمثیل کی تکمیل اوراس کے معیاری ہونے کے متعلق عبدالحق کی رائے ہے۔انھوں نے سب رس کے اسلوب کی تنقید بھی کی ہے اوراس تمثیل میں درآئی خامیوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔مولانا نے سب رس کو زبان و بیان کے ساتھ تاریخی، تہذیبی اور معاشرتی پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے اوراس بات کا اقرار بھی کیا ہے کہ اس میں اس دور کی جیتی جاگتی تصویر دکھائی دیتی ہے۔

اردو زبان وادب کے عظیم محققین میں پروفیسر حافظ محمود شیرانی کا نام ہمیشہ عزت واحترام کے ساتھ لیا جائے گا۔شیرانی صاحب اگر چہ محققین کی فہرست میں ہیں لیکن ان کی ہر تحقیق میں تنقیدی شعور اور بصیرت پنہاں ہے۔اردو زبان وادب کے حوالے سے ان کی تحقیقات یقیناً ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔حافظ محمود شیرانی نے بابائے اردو مولوی عبدالحق کے اس مقدمے پر اورینٹل کالج میگزین کے نومبر ۱۹۳۴ء کے شمارے میں ایک تبصرہ شائع کیا تھا۔وہ چوں کہ ماہر لسانیات کے زمرے میں بھی شمار کیے جاتے ہیں اس لیے انھوں نے اس مضمون میں زیادہ تر لسانیات کے نقطۂ نظر سے بحث کی ہے۔ان کا یہ مضمون اگر چہ تحقیقی نقطہ نظر سے قلم بند کیا گیا ہے تاہم ان کی تنقیدی بصیرت کے پیش نظر اس کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔شیرانی نے اس مقالے میں تمثیل نگاری کی بنیادی اوصاف کا تذکرہ کیا ہے۔اس اعتبار سے ان کا یہ مضمون تمثیل کی تنقید میں خاصی اہمیت کا حامل ہوگیا ہے۔

تمثیل کی تنقید کے باب میں عزیز احمد کا نام بھی خصوصی اہمیت کا حامل رہا ہے۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے سب رس کے حوالے سے ایک قابل ذکر مضمون شائع کرایا جس کا عنوان ''سب رس: ماخذ اور مماثلات'' ہے۔یہ مضمون رسالہ اردو کے جنوری۔اپریل ۱۹۵۰ء کے شمارے میں شائع ہوا۔اس میں انھوں نے زیادہ تر سب رس کے حوالے سے گفتگو کی ہے لیکن ضمنی طور پر تمثیل کی تعریف اور اس کی خصوصیات اور فنی لوازم پر بھی بحث کی

ہے۔ وہ اپنے مضمون میں ایک جگہ رقمطراز ہیں:

''بیانیہ ادب کی ایک قسم وہ ہوتی ہے جس میں حکایات یا بیان بہ وقت واحد دو سطحوں پر حرکت کرتا ہے۔ بیان کے ایک حقیقی معنی ہوتے ہیں اور ایک مجازی۔ حقیقی معنی کے مختلف پہلوؤں کو مجازی اجسام دے دیئے جاتے ہیں اور ان اجسام کے تعلق، حرکت یا تصادم سے حقیقی معنی پیدا ہوتے ہیں۔ اس قسم کے بیانیہ ادب کو مثالیہ (تمثیل) کہتے ہیں۔'' (۳۴)

عزیز احمد ایک اچھے تنقید نگار تھے۔ چنانچہ بحیثیت نقاد انہوں نے کافی شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ ان کا تنقیدی شعور بہت گہرا اور متوازن تھا۔ اس مضمون میں انہوں نے تمثیل کے قصہ کی دوہری سطح کی بات کی ہے لیکن تمثیل کا اصل مقصد اخلاقیات کی تعلیم یا تزکیہ کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ اس میں انھوں نے سب رس کا گہرائی و گیرائی سے مطالعہ پیش کرنے کے ساتھ بے لاگ تبصرہ بھی کیا ہے۔ البتہ مذکورہ رائے تمثیل کی جامع اور مکمل تعریف نہیں قرار دی جاسکتی، کیوں کہ تمثیل میں داستان و حکایت کے اس انداز سے بحث کی جاتی ہے جس میں مجرد انسانی صفات یا مظاہر فطرت کی تجسیم کردی جاتی ہے۔ اس میں استعارہ کو انسانی پیکر اور تشبیہ کو حسّی روپ میں ڈھال دیا جاتا ہے۔ مثلاً معصومیت خوب صورت پری اور نفرت بدصورت دیو کے روپ میں دکھائے جائیں تو اسے علامت نگاری کا ایک انداز بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ اس کا مقصد اخلاقی نکات کا دلچسپ انداز اور دلنشیں اسلوب میں بیان تھا۔ تاکہ پڑھنے والا خوبصورت اسلوب کی شکر میں لپٹی نصیحت کی کڑوی گولی خوشی خوشی ہضم کرے۔ اس مضمون میں انھوں نے قصے کے تجسس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جس میں آب حیات کی سعی و جستجو قاری کو قصے کا جزو بنا دیتی ہے۔ انھوں نے اس میں موجودہ دور میں تمثیل کے زوال اور اس کے اسباب پر بھی عالمانہ گفتگو کی ہے۔

اب اردو داستانوں کے اہم نقاد پروفیسر گیان چند جین کے تمثیل کے سلسلے میں خیالات ونظریات کا جائزہ لیا جائے گا۔ تمثیل کے حوالے سے انھوں نے اپنی کتاب ''اردو کی نثری داستانیں'' میں ''سب رس'' پر جو تاثرات پیش کیے ہیں ان سے قطع نظر انھوں نے اپنا ایک مضمون بہ عنوان ''اردو میں تمثیل نگاری'' کے عنوان سے لکھا ہے۔

اس میں انھوں نے تمثیل کی تعریف، اس کی خصوصیات، تکنیک اور اردو میں تمثیل نگاری کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے تمثیل کو نہ صنف ادب قرار دیا ہے اور نہ ہی اسلوب۔ ان کا ماننا ہے کہ یہ پر تکلف اور پر تصنع اسلوب میں بھی پائی جاتی ہے اور سادہ سلیس اسلوب میں بھی۔ مثال کے طور پر سب رس اور گلزار سرور کی مسجع ومقفّٰی اسلوب میں بھی تمثیل موجود ہے اور عبدالحلیم شرر اور راشدالخیری کی سادہ اور سلیس تحریروں میں بھی۔ اس لیے اسے اسلوب قرار نہیں دیا جاسکتا کیوں کہ اسلوب کا تعلق ہیئت سے ہے، جب کہ تمثیل کا تعلق خالص معنوی ہے۔ ان کے مطابق یہ ایک تکنیک اور صنعت ہوسکتی ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے گیان چند جین کے اس نظریے کی تردید کی ہے۔ وہ اپنی کتاب ''اردو فکشن کی تنقید'' میں لکھتے ہیں:

''......تمثیل کے اپنے اجزائے ترکیبی ہیں۔ مثلاً:

۱۔ اس میں معنی ومفہوم کی دو سطح ہوتی ہے۔ ایک حقیقی اور ایک مجازی۔

۲۔ اس میں عموماً اخلاقی، حکیمانہ یا مذہبی نوعیت کی کہانی بیان ہوتی ہے۔

۳۔ اس میں مرئی کو غیر مرئی اور غیر مرئی کو مرئی بنا کر سامنے لایا جاتا ہے۔

۴۔ یہاں کردار، جذبات، اوصاف یا مجرد تصوارت تجسیم ہوتے ہیں۔

تمثیل کو جو چیز صنف بناتی ہے وہ ہے اس کے معنی میں دو یا دو سے زیادہ سطح کا ہونا......اس لیے یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ تمثیل صنعت، اسلوب یا ٹکنیک نہیں، ایک صنف ہے۔ راقم کے نزدیک تمثیل ایک صنف ادب بھی ہے اور اسلوب بھی۔'' (۳۵)

تمثیل کے حوالے سے بعض مباحث میں گیان چند جین سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ لیکن مجموعی طور پر اپنے مضمون اور کتاب اردو کی نثری داستانیں میں وہ ایک معتدل اور متوازن نقاد کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ اس کتاب میں جین صاحب اپنے ذاتی تجربوں کی روشنی میں داستان کی افہام وتفہیم کا راستہ کھولتے ہیں۔ ان کی تحقیقی وتنقیدی کوتاہیوں کی گرفت کی گئی ہے، اور یہ سلسلہ ان کی زندگی سے ہی شروع ہوگیا تھا لیکن ان کے تحقیقی اور تنقیدی امتیازات اپنی جگہ مسلم ہیں، جن سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔

سلام سندیلوی کا مضمون جو جون ۱۹۶۰ء میں ''نیا دور'' میں شائع ہوا اور خود ان کے مجموعہ مضامین ادبی اشارے میں بھی شامل ہے، اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ لیکن سلام سندیلوی نے اس میں فن تمثیل کے حوالے سے کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا ہے۔ اس لیے اس مضمون سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔ حامد چھپروی کا ایک مضمون ''سب رس پر'' شاعر کے شمارے بابت مئی ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا۔ اگرچہ حامد چھپروی تحقیق و تنقید کی دنیا میں بہت معروف و مقبول نہیں ہیں لیکن انھوں نے اس مضمون میں سب رس پر بڑی سنجیدہ اور عالمانہ گفتگو کی ہے۔ صرف اسی وجہ سے ان کا ذکر تمثیل کی تنقید میں نہ صرف قابل ذکر ہے بلکہ لازم بھی ہے۔ وہ سب رس کے متعلق اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''عصر جدید میں فرائڈ اور اس کے شاگردوں کو بڑی اہمیت دی جارہی ہے لیکن سب رس کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ ہمارے قدیم فن کاران فلسفیوں سے ناواقف تھے۔ ایک متوازن شخصیت کی تعمیر کب اور کیسے ہوتی ہے؟ انسان کو کیا ہونا چاہیے؟ دل اور دماغ کا کیا مقام ہے؟ دونوں میں کس طرح توازن پیدا کیا جاسکتا ہے اور کس کا کیا کام ہے؟ ان سب کو وجہی نے بیان کیا ہے......اگرچہ وجہی دور قدیم کے ادبی دھندلکوں کا نمائندہ ہے لیکن اس کا شعورفن کافی بالیدہ ہے۔'' (۳۶)

یہاں یہ بات بتانے کی ضرورت نہیں کہ تخلیقی شعور کے برعکس تنقیدی شعور خالص علمیاتی جذب و انجذاب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ تخلیقی جذبہ ودیعتی نوعیت کا ہوتا ہے جب کہ تخلیقی جذبے کی ٹھوس صورت تخلیق کا مطالعہ، اس کی تعبیرات و تشریحات اور تجزیات و تفہیمات خالص علمی بصیرت و بصارت کے امتزاج سے معرضِ ظہور میں آتی ہیں۔ ادبی تنقید کا یہی علمی پہلو اُس کا عملی پہلو بن جاتا ہے۔ تنقیدی دورانیے میں جب نقاد اپنے علومِ دیزہ سے منطقیت اور استدلال کی ایک ایسی مباحثی دنیا خلق کرے جہاں لفظ و معنی کے مابین کوئی حدِ فاصل موجود نہ ہو۔ حامد چھپروی نے مذکورہ اقتباس میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ لیکن ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے کم از کم نئے انداز سے سوچا اور کچھ نئے سوالات تو اٹھائے۔ پھر ان سوالات کے

مدلل جوابات بھی دیے۔

اس کے بعد ایک اہم ناقد اور تاریخ ادب اردو کے خالق جمیل جالبی کا ذکر ضروری ہے جنھوں نے اپنی کتاب میں سب رس پر تنقید کرتے ہوئے بہت سی مفید اور کارآمد باتیں ذکر کی ہیں۔انھوں نے سب رس بحیثیت تمثیل موضوع بحث بنانے سے قبل خود تمثیل کے حوالے سے مختلف ناقدین کی آرا کو پیش نظر رکھا ہے۔تمثیل کے حوالے سے انھوں نے بڑی مفید اور کارآمد باتیں قلم بند کی ہیں۔اس کے بعد وہ سب رس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''خالص اور بے میل تمثیل کی حیثیت سے سب رس ایک منفرد اور بے مثال تصنیف ہے لیکن قصے کی حیثیت سے اس میں کئی خامیاں نمایاں ہیں۔سب رس میں قصہ بنیادی حیثیت ضرور رکھتا ہے لیکن جس طرح اسے پیش کیا گیا ہے اس میں پند و موعظت نے اتنا غلبہ حاصل کرلیا ہے کہ قصہ ذیلی حیثیت اختیار کرلیتا ہے۔اگر عشق کا ذکر آ گیا تو وجہی صفحے کے صفحے اس کی تشریح میں لکھتا چلا جاتا ہے۔اگر مانگنے کی بات آ گئی تو اس موضوع پر وجہی جو کچھ لکھ سکتا ہے لکھ دیتا ہے۔غرض وہ فنی توازن جو قصے اور پند و نصائح کے درمیان ہونا چاہیے تھا، سب رس میں مفقود ہے۔اس لیے فنی اعتبار سے قصے کا کوئی مرکز باقی نہیں رہتا۔''(۳۷)

مذکورہ اقتباس میں ایک طرف وہ سب رس کے بے مثل اور قابل قدر تمثیلی کارنامہ ہونے کی حمایت کرتے ہیں تو دوسری طرف اس کے قصے کی خامیوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ان کو اس بات کی بھی شکایت ہے کہ بعض مقامات پر مصنف نے غیر ضروری چیزوں کی تفصیل پیش کرنے میں اصل قصے سے غفلت برتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ سب رس کو ایک داستان کی حیثیت سے ایسی کامیاب داستان نہیں قرار دیتے جس میں داستان کے اجزائے ترکیبی کو پورے طور پر برتا گیا ہو۔اس لیے اسے ایک ایسی داستان مانتے ہیں جس میں فنی توازن اور اعتدال مفقود ہے۔پھر وہ آگے لکھتے ہیں:

''قصہ تمثیل ہے اور اس کے سارے کردار بھی تمثیلی ہیں لیکن بہت سے ناموں کے کام مبہم ہو کر بے معنی ہو جاتے ہیں پھر یہ بات بھی غیر واضح بلکہ مبہم ہے کہ حسن کی انگوٹھی، خوشبوئی، وصال کے پیچھے، حسن کی ہم زاد غیر اور اس کی ساحرہ بہن سے کیا مراد لی جائے؟ وجہی ان سب باتوں کو واضح کر سکتا تھا۔ کیوں کہ وہ ہر جگہ طویل بیانات اور پند و موعظت کے دفتر کھول دیتا ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمثیل کے مخصوص ربط کا اسے پورا شعور نہیں ہے۔ اسی بے ربطی کی وجہ سے سب رس کا ڈھانچا اس اونچی حویلی کی طرح ہو گیا ہے جس میں ہوا اور روشنی کا خیال نہ رکھا گیا ہو اور جس کے دالانوں، کمروں اور صحن میں تناسب کو اہمیت نہ دی گئی ہو۔'' (۳۸)

مذکورہ عبارت سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جمیل جالبی صحتمند ادب کے حامی ہیں اور اسے معاشرہ اور تہذیب و ثقافت کا ترجمان سمجھتے ہیں۔ لیکن چوں کہ سب رس کا لسانی دائرہ کافی وسیع ہے۔ اس میں شمالی ہند کی زبانوں برج بھاشا، گوالیاری، راجستھانی اور دوسری زبانوں کے محاورے، ضرب الامثال اور اثرات بھی موجود ہیں۔ وجہی نے شمالی ہند اور جنوبی ہند کی زبانوں کی خلیج مٹانے کی کوشش کی ہے۔ سب رس میں جا بجا اس زمانے کی معاشرت اور تہذیبی و تمدنی زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اس زمانے کے طرز بود و باش، خوراک، لباس، وضع قطع، ظروف، زیورات، حکومت و حکمت، تجارت و معیشت غرض کہ ہر پہلو سے اس زمانے کی معاشرتی زندگی کے آثار کی تصویر نظر آتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف ایک زندہ معاشرے کا ایک نکتہ داں ادیب ہے جس نے اپنے عہد کی معاشرتی زندگی کو بڑی گہری نظر سے دیکھا ہے اور اس کے خد و خال کو بڑی چابک دستی سے احاطہ تحریر میں لایا ہے۔ جمیل جالبی چوں کہ ادب کی تاریخ لکھ رہے تھے، اس لیے اس کتاب کے تمام پہلوؤں کا احاطہ اور اس کا تفصیلی جائزہ موضوع کے ساتھ ناانصافی تھی۔ اس کے باوجود انھوں نے سب رس کے تمثیلی پہلو پر جو بحث کی ہے وہ قابل لحاظ ہے۔ اس میں ہر جگہ ان کا تنقیدی شعور کارفرما نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر منظر اعظمی کی کتاب اردو میں تمثیل نگاری اس سلسلے کی ایک اہم اور سود مند کوشش ہے جس میں فن

تمثیل پر بھر پور بحث کی گئی ہے۔اس کے بعد تقریباً تمام تمثیلی تصنیفات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔اسے ہم تمثیل کی تنقید میں ایک بیش بہا اضافہ قرار دے سکتے ہیں۔اگر چہ ہمیں منظر اعظمی کی تمام باتوں سے اتفاق نہیں ہے جو انھوں نے کتاب میں پیش کی ہیں تاہم اس سلسلے کی ایک مستقل کتاب ہونے کی وجہ سے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔منظر اعظمی کتاب کے پیش لفظ میں رقم طراز ہیں:

''مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اردو میں اس موضوع پر کوئی جامع کتاب دستیاب نہیں۔میری معلومات کی حد تک چند مضامین، چند مقدمے اور چند ضمنی بیانات کے سوا تمثیل نگاری کے موضوع پر نہ تو کسی صاحب علم نے شرح وبسط کے ساتھ کچھ لکھا ہے اور نہ اردو تمثیلی تخلیقات کا جائزہ ہی لیا ہے۔''(۳۹)

پھر وہ آگے لکھتے ہیں:

''اردو میں تمثیل نگاری کے ضمن میں اردو کی بہت سی تخلیقات پر تمثیل کے نقطہ نظر سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔اگر چہ ان پر دوسرے پہلوؤں سے اہل علم پہلے ہی داد تحقیق دے چکے ہیں۔بہت سے ایسے پہلوؤں پر بھی اظہار خیال کیا ہے جو بظاہر موضوع سے متعلق نہیں معلوم ہوتے لیکن محض اس خیال سے کہ اس موضوع سے متعلق جو چھوٹی بڑی ہر چیز یک جائے تو اچھا ہی ہے۔ایک بدعت سیئہ کا مرتکب ہوا ہوں۔''(۴۰)

کتاب کے بغور مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے تمثیل کے سلسلے میں ارود کے اہم نقادوں جیسے گیان چند جین، سلام سندیلوی، مسیح الزماں اور محمود الٰہی وغیرہ کے خیالات سے استفادہ بھی کیا ہے۔بلکہ بعض جگہوں پر انھیں کی ہمنوائی بھی کی ہے جس کی وجہ سے بعض اوقات نتائج تسامحات اور تضادات کا بھی شکار ہو گئے ہیں۔اس کے باوجود انھوں نے اس کتاب کے ذریعہ تمثیل اور تمثیل کی تنقید کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔یہ کتاب تمثیل کی تنقید پر غور وفکر کی دعوت دیتی ہے۔انھوں نے اپنے دلکش اسلوب نگارش سے ان سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کی ہے جو تمثیل کے حوالے سے اکثر قارئین کے اذہان میں آتے ہیں۔ایک اہم بات یہ

ہے کہ انھوں نے اس کتاب میں صرف نظریاتی ادب نہیں لکھا بلکہ کچھ تمثیلوں کی عملی تنقید بھی پیش کی ہے۔اس اعتبار سے وہ اہمیت کے حامل ہیں کہ انھوں نے تمثیل کی تنقید پر مستقل کتاب لکھی اور اس میں نظری اور عملی تنقید دونوں کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔

وہ اس کتاب میں نذیر احمد کے ناولوں کو خالص تمثیل کے زمرے میں شامل نہیں کرتے۔ بلکہ یہاں اپنی تنقیدی بصیرت اور شعور سے کام لے کر استدلالی مباحث پیش کیے ہیں۔اس سلسلے میں انھوں نے بعض ناقدین کے نظریات سے اختلاف بھی کیا ہے اور اپنے خاص نقطہ نظر کے تحت ان تمثیلات کا مطالعہ پیش کیا ہے۔اس لحاظ سے بھی یہ کتاب خاصی اہمیت رکھتی ہے۔

گارساں دتاسی نے اپنے خطبات میں جس کتاب جوہر عقل کے تمثیلی ہونے کی طرف اشارہ کیا تھا منظر اعظمی اسے مکمل تمثیل قرار دیتے ہیں جب کہ خط تقدیر کو تمثیلی ناول کہتے ہیں۔اس کی بنیادی وجہ فکشن کے ناقدین کے نظریات ہیں جو اس کتاب کو اولین ناول سمجھتے ہیں۔منظر اعظمی بھی انھیں کے اقوال کو پیش نظر رکھتے ہوئے غفلت کا شکار ہو گئے ہیں اور اسے تمثیلی ناول کہہ بیٹھے۔جوہر عقل میں نہ تو معنی کی دو سطحیں ہیں نہ ہی تمثیل کی دوسری خصوصیات۔اس کے مصنف نے جو بھی انداز اپنایا ہے وہ لاشعوری عمل ہے جس کا انھیں بھی اندازہ نہیں تھا۔تاہم اس کے تمثیلی قصہ ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔اپنی بعض خامیوں کے باوجود منظر اعظمی کی کتاب تمثیل کی تنقید میں قابل قدر اضافہ ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے پہلی بار تمثیل کے متعلق اتنا مواد یکجا کیا ہے۔تمثیلوں کی تحقیق اور ان پر تنقید، مغربی اور مشرقی تمثیلات کی تفریق اور اس کی تاریخ کا مختصر تذکرہ اس کتاب کی اہمیت کو دوچنداں کر دیتا ہے۔

۱۹۸۸ء میں غلام رسول مکرانی نے اسی موضوع پر کتاب شائع کی۔لیکن اس کتاب کی ادبی حلقے میں خاطر خواہ پذیرائی نہ ہوسکی۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اولیت کا سہرا منظر اعظمی کے سر چلا گیا۔غلام رسول مکرانی خود اپنی کتاب کے پیش لفظ میں رقمطراز ہیں:

> ''جن دنوں میں اپنے مقالہ کی تکمیل میں منہمک تھا اسی عرصے میں اس موضوع پر ڈاکٹر منظر اعظمی کا تحقیقی مقالہ بہ عنوان اردو میں تمثیل نگاری زیور طبع سے

آراستہ ہو کر منظر عام پر آ گیا......ڈاکٹر منظر اعظمی کی کاوشات قابل ستائش ہیں
کہ انھوں نے نہ صرف اپنا کام تیزی کے ساتھ ختم کر لیا بلکہ اپنے مقالہ کو جلد طبع
بھی کرا لیا۔''(۴۱)

غلام رسول مکرانی نے ''اردو میں تمثیل نگاری'' پر ۱۹۸۸ء میں تحقیقی مقالہ لکھا۔ یہ مقالہ تمثیل کے بعض نئے پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔مختلف ابواب میں موضوع کو سمیٹا گیا ہے۔مثال کے طور پر تمثیل: لفظ و اصطلاح، تمثیل علم بیان کی رو سے، تمثیل مغرب سے مشرق تک، اردو میں تمثیل نگاری کا آغاز و ارتقا، شمالی ہند میں تمثیل نگاری، دور جدید میں تمثیل نگاری وغیرہ۔ غلام رسول مکرانی نے اردو ادب کی اولین تمثیل ''شکار نامہ'' (خواجہ بندہ نواز گیسو دراز) سے لے کر دوسری مستند تمثیل ''سب رس'' (ملا وجہی) تک کا احاطہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ تقریباً ڈھائی سو سال کا عرصہ گزرا لیکن انتہائی حیرت کا مقام ہے کہ اتنے طویل عرصے کے دوران کوئی بھرپور تمثیلی تخلیق دریافت نہیں ہو سکی۔ حالاں کہ اس عرصے میں دکن میں بہمنی، عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتوں کے کئی عہد گزرے۔ طویل درمیانی عرصے میں تمثیل کا کوئی مکمل نمونہ تو نہیں ملتا مگر تمثیل نگاری کی روایت ارتقا پذیر ہوتی رہی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس عرصے میں نظم و نثر دونوں میں تصوف کے بعض ایسے رسائل نظر آتے ہیں جن میں جزوی طور پر تمثیلی عناصر موجود ہیں۔

اس کتاب میں مکرانی نے علم بیان کی رو سے تمثیل کی افہام و تفہیم کی اچھی کوشش کی ہے۔لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ گزشتہ ناقدین کی طرح وہ بھی اس کے اجزائے ترکیبی مقرر نہ کر سکے اور نہ ہی اس پر شرح و بسط کے ساتھ روشنی ڈالی۔ تاہم یہ کتاب تمثیل کی تنقید کی آخری کوشش ہے۔ اس کے بعد سے اب تک اس سلسلے میں کوئی بھرپور اور قابل ذکر کارنامہ منظر عام پر نہیں آ سکا ہے۔ البتہ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج بھی رسائل و جرائد میں تمثیلوں کی افہام و تفہیم کے سلسلے میں مقالات شائع ہوتے رہے ہیں۔لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ صنف تمثیل کا نئے سرے سے مطالعہ کیا جائے اور اس کے اجزائے ترکیبی مقرر کیے جائیں تا کہ ان کی روشنی میں ہم تمثیلات کا جائزہ لیں اور ان کے مقام و مرتبے کو ادب میں بہ آسانی معین و مقرر کر سکیں۔

تمثیل کی تنقید کے مستقبل سے ہم مطمئن نہیں ہیں بلکہ اس کے مستقبل کے تئیں مایوسی دکھائی دیتی ہے۔ یہ

نا امیدی آخر کیوں ہے؟ دراصل زمانے کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں وہ برق کی رفتار سے سائنس اور ٹکنالوجی سے قریب ہوتا جا رہا ہے۔ انسان کی زندگی اس مشین کی طرح ہوگئی ہے جس سے مسلسل کام لیا جا رہا ہو۔ ہمیں فرصت کے چند لمحات بھی میسر نہیں آتے، اس صورت حال سے گزرتا ہوا انسان سکون کے ایک ایک پل کے لیے ترس جاتا ہے۔ کہانی، قصے اور تمثیل کے لیے جو وقت درکار ہے اس کے پاس وہ وقت نہیں۔ دوسری اہم بات کہ ہماری نئی نسل کے بچے ان کہانیوں سے نہ واقف ہیں اور نہ ہی انہیں ایسی کہانیوں میں کوئی دلچسپی ہے کیوں کہ اس کی جگہ ٹیلی ویژن پر کارٹون اور سیریل نے ہمارے گھروں میں جگہ بنالی ہے۔ اب نہ ماں باپ کے پاس وقت رہا اور نہ ہی بچوں کو ان کہانیوں میں کوئی دلچسپی رہی، نئی نسل کے بچوں نے ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ کو اپنی دنیا بنالیا ہے۔ اس کی وجہ کہیں نہ کہیں ہمارے معاشرے کی بدلتی تصویر ہے۔ اس لیے ہمارے ناقدین کو باذوق قارئین کو توجہ مبذول کرانا ہوگا تا کہ وہ اپنا قیمتی وقت نکال کے ان تمثیلوں کے مطالعے میں مصروف ہوں اور اس پر نئے طرز کی تنقید کی بنیاد ڈالیں۔

☆☆☆

حوالہ جات وحواشی:

(۱) رسالہ دل گداز، عبدالحلیم شرر، فروری ۱۹۱۵ء، ص ۲۴

(۲) فن داستان گوئی، ادارہ فروغ اردو، امین آباد، لکھنؤ، ۱۹۷۲ء، ص ۷

(۳) ایضاً، ص ۲۳

(۴) ایضاً، ص ۱۹

(۵) انتخاب طلسم ہوش ربا، محمد حسن عسکری، مقدمہ، ص ۹

(۶) ایضاً، ص ۴۲

(۷) اردو کی نثری داستانیں، ص ۴۵

(۸) ایضاً، ص ۳۷۵

(۹) ایضاً، ص ۲۷۵

(۱۰) ہماری داستانیں، وقار عظیم، ص ۵

(۱۱) ایضاً، ص ۵

(۱۲) باغ و بہار، مرتبہ ممتاز حسین، ص ۴۵

(۱۳) داستان سے افسانے تک وقار عظیم، ص ۸۲

(۱۴) رجب علی بیگ سرور: حیات اور کارنامے، شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد، ۱۹۶۷ء، ص ۱۷۳

(۱۵) ایضاً، ص ۳۱۲

(۱۶) طلسم ہوش ربا، راہی معصوم رضا، ص ۴۷۱

(۱۷) ابراہیم یوسف 'اندر سبھا اور اندر سبھائیں'، لکھنؤ، ۱۹۸۰ء، ص ۵۱

(۱۸) شمیم انہونوی (مرتب) 'تذکرہ خوش معرکہ زیبا'، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، ص ۹۳-۱۹۲

(۱۹) ڈراما اکبر، محمد حسین آزاد، دیباچہ از نبیرہ آزاد، ص ۴-۸

(۲۰) اردو تھیٹر، عبدالعلیم نامی، ص ۷۱

(۲۱) اردو تھیٹر، ص ۳۰

(۲۲) اردو کا پہلا یک بابی ڈراما (تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی جائزہ)، پروفیسر فصیح احمد صدیقی، علومی بک ڈپو، محمد علی روڈ بمبئی، ۱۹۷۲ء، ص ۱۰

(۲۳) اردو ڈرامے کی تاریخ و تنقید، عشرت رحمانی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۸۷ء، ص ۷

(۲۴) احتشام حسین: 'جدید اردو ڈراما اور اس کے بعض مسائل'، آج کل ڈراما نمبر، دہلی، جنوری ۱۹۵۹ء، ص ۳۶

(۲۵) سید بادشاہ حسین: 'اردو میں ڈراما نگاری'، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص ۶۔۹

(۲۶) گارساں دتاسی: اردو خدمات، علمی کارنامے، ثریا حسین، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۴ء، ص ۱۱۔۱۲

(۲۷) خطبات گارساں دتاسی، اشاعت: ۱۸۵۸ء، ص ۴۷۹

(۲۸) مقالات گارساں دتاسی، حصہ دوم، انجمن ترقی اردو، دہلی، ۱۹۴۳ء، ص ۷۰

(۲۹) نیرنگ خیال (حصہ اول)، مولوی محمد حسین آزاد، آزاد بک ڈپو، کوچہ چیلان، دہلی، سنہ ندارد، ص ۹

(۳۰) ایضاً، ص ۹۔۱۰

(۳۱) تحریریں، گیان چند جین، ص ۲۶۹

(۳۲) سب رس، مولوی عبدالحق، ص ۱۱

(۳۳) ایضاً، ص ۱۱

(۳۴) سب رس کے ماخذ اور مماثلات، مطبوعہ رسالہ اردو، جنوری۔اپریل ۱۹۵۰ء، ص ۱۳

(۳۵) اردو فکشن کی تنقید، ارتضیٰ کریم، ص ۹۶۔۹۷

(۳۶) ایضاً، ص ۱۰۲۔۱۰۳

(۳۷) تاریخ ادب اردو، جمیل جالبی، جلد اول، ص ۴۵۶

(۳۸) ایضاً، ص ۴۵۷

(۳۹) اردو میں تمثیل نگاری، منظر اعظمی، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، ۱۹۷۷ء، ص ۱۱

(۴۰)　ایضاً،ص۱۴۔۱۵

(۴۱)　اردو ادب میں تمثیل نگاری، غلام رسول مکرانی، ص۶

☆☆☆

باب پنجم

اردو فکشن کے چند اہم ناقدین کا خصوصی مطالعہ

اردو فکشن کی تنقید کو بحیثیت مجموعی علمی اور ادبی حلقوں میں مرکزیت حاصل رہی ہے۔خصوصاً ۲۰ ویں صدی کے ربع آخر سے لے کر اب تک یعنی ۲۱ ویں صدی کی دوسری دہائی تک فکشن کے ساتھ ساتھ فکشن تنقید کی خوب دھوم مچی ہے۔ بلکہ ۲۱ ویں صدی کے بارے میں یہ کہا جائے کہ فکشن کی صدی ہے۔جب اردو فکشن اپنے ارتقائی مراحل میں تھا تو فکشن پاروں کا دائرہ اخلاقی، مذہبی و معاشرتی اصلاح سے متعلق موضوعات تک محدود تھا،لیکن رفتہ رفتہ سماجی معاشی اور سیاسی و تہذیبی مسائل کی تصویرکشی نے اردو ناولوں اور افسانوں میں بنیادی رجحان کی حیثیت حاصل کرلی۔

اردو فکشن کا سفر داستان سے شروع ہوا۔داستان کی شعریات میں بنیادی مقدمات میں تخیل کی فراوانی کو بڑا دخل ہے یوں اس کی کائنات کی تعمیر و تشکیل میں فوق الفطری عناصر کا عمل دخل بھی رہتا ہے۔انیسویں صدی میں ہندوستانی معاشرے میں ۱۸۵۷ء کے بعد وہ حالات پیدا ہوگئے تھے جو ناول کی پیدائش کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔یعنی ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ میں ہندوستانیوں کی شکست ہوئی جس کے نتیجے میں زندگی کو دوسرے زاویے سے دیکھا جانے لگا۔انسان اور سماج کے درمیان توازن ختم ہو چکا تھا۔قدیم سماجی اور تمدنی نمونے تیزی سے ختم ہورہے تھے۔ پڑھنے والوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا، پرانے جاگیردارانہ نظام کے اثرات ختم ہورہے تھے۔متوسط طبقہ سماجی اور سیاسی اعتبار حاصل کر رہا تھا اور پورا معاشرہ جمہوریت کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔اصلاح معاشرہ کا جذبہ پڑھے لکھے لوگوں میں عام ہوگیا تھا۔تعلیم کے فروغ اور اصلاح کے لئے ہی نذیر احمد نے اردو میں ناول نگاری شروع کی بلکہ حالؔی، شرؔر اور رسؔوا تک ہر ایک کی ناول نگاری اس جدید ذہنیت کا ثبوت پیش کرتی ہے، جس نے ناول کو اظہار خیال کے لئے سب سے اچھا آلہ بنایا اور حقیقت پسندی کا تقاضا کیا۔اس طرح دنیائے فکشن میں جب نئی صبح کا آغاز ہوا تو داستان کی کوکھ سے ناول اور افسانے کا جنم ہوا۔اس دور میں اردو میں جو ناول منصۂ شہود پر آئے وہ زندگی کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ حقیقت اور مقصدیت کے عام رجحان کو فروغ حاصل ہوا۔اردو ناول کے ساتھ اردو افسانوں کو بھی وسعت ملی۔اس لحاظ سے یہ دونوں اصناف داستان کے تسلسل کا حصہ ہیں،لیکن مقصدیت میں یہ دونوں داستان سے مختلف ہیں۔ناول اور افسانے کو ادبی فن پارہ سمجھتے ہوئے بھی

زندگی کا آئینہ متصور کیا جانے لگا۔

اس طرح ۲۱ ویں صدی کی پہلی دہائی تک فکشن نے جو سفر طے کیا اس میں وہ زندگی کی حقیقت کی ترجمانی سے مشروط ہے۔ اس دوران فکشن کی تنقید مجموعی طور پر انہی خطوط پر گامزن رہی، لیکن بیسویں صدی کے ربع آخر میں ثقافتی سطح پر مابعد جدیدیت کے ظہور میں آنے سے جہاں تخلیقی سطح پر موضوعات کی بوقلمونیت اور رنگارنگی ادب کا شناخت نامہ بن گئے اور بیانیہ اسلوب کی آمد نے ایک بار پھر ادب کے قارئین کو متاثر کیا اور تنقیدی اصول کی راہیں مواد اور ہیئت دونوں کے اعتبار سے ہموار ہوئیں۔ ان دونوں کا آپس میں جان وتن کا سا رشتہ ہے۔ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا، لیکن فن پارے کے فہم وادراک اور اس کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کے لئے نقاد انہیں الگ الگ کر کے دیکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔

ان تمام عناصر پر نقاد حضرات کی گہری نگاہ رہتی ہے۔ فن پارے میں جو تجربہ پیش کیا گیا ہے اور اس کے موضوعات کے تحت جو بات کہی گئی ہے وہ معمولی اور فرسودہ ہے یا تازہ ار فکر انگیز! فن کار کے پیش کش کا انداز پر اثر ہے یا نہیں۔ ادب پارے کی ترسیل کس حد تک ہوئی ہے۔ جس طرح مصور اپنے تجربے کو رنگوں کے ذریعے پیش کرتا ہے اسی طرح شاعر یا ادیب اپنے خیالات و جذبات کو لفظوں کے ذریعہ پیش کرتا ہے۔ لفظ ہی اس کا میڈیم یعنی ذریعہ اظہار ہوتے ہیں۔ شعروادب محض لفظوں کا کھیل نہیں، لیکن ادب پارہ الفاظ اور ان کی موزوں ترتیب سے ہی وجود میں آیا ہے اس لئے یہی ادبی تنقید کی خصوصی توجہ کا مرکز رہتے ہیں۔

ادبی تنقید کے کئی ایسے دبستان ہیں جو ادب کو کسی خاص نظریے کی روشنی میں جانچتے ہیں۔ کوئی یہ دیکھتا ہے کہ اس سے کسی خاص نظریے مثلاً اشتراکیت کا پرچار ہوتا ہے یا نہیں، کوئی یہ سوال کرتا ہے کہ اس سے مذہب یا اخلاق کی تعلیم ملتی ہے کہ نہیں، کسی کو ادب سے عہد و ماحول کی عکاسی کی توقع ہوتی ہے۔ بعض علمائے ادب نے شاعر کو ان چیزوں سے دور رہنے کا مشورہ دیا ہے، مگر اصل بات یہ ہے کہ شعروادب میں نظریے کا ہونا یا نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ادبی تنقید یہ دیکھتی ہے کہ ادب واقعی ادب ہے بھی کہ نہیں۔

ادبی تنقید اس محنت اور کاوش کو بھی نظر میں رکھتی ہے جو کسی فن پارے پر صرف ہوئی ہے۔ فن کار کی محنت سے ہم اکثر بے خبر ہوتے ہیں اور نہیں جانتے کہ اس کی تخلیق کتنی تراش خراش کے بعد ہم تک پہنچی ہے۔ مسودے نہ

مل جاتے تو کون جان سکتا تھا کہ جس طرح ولیم بلیک کے سادہ سی شاعری اور شکسپیر کے ڈراموں کی نوک پلک کتنی بار سنواری گئی ہے اور اقبال نے ایک ایک مصرعے کو چالیس چالیس بار بدلا ہے۔اسی سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ادب الہام نہیں، شعوری کوشش اور فن کار کی محنت پیہم کا ثمرہ ہوتا ہے۔

ادبی تنقید کے لیے تعصبی اور غیر جانب داری بہت ضروری ہے۔نقاد منصف مزاج نہ ہو تو وہ تنقید کا حق ادا نہیں کر سکتا۔تنقید کا حق صحیح معنی میں اسی کو ہے جس کا مطالعہ وسیع اور نظر گہری ہو۔کلیم الدین احمد کے الفاظ میں نقاد کو جس ساز و سامان کی ضرورت ہے وہ علم کے مختلف شعبوں کے بہترین خیالات سے آگہی ہے۔ یہ نہیں کہ وہ ہر فن مولا ہو، وہ سارے علوم میں مہارت رکھتا ہو۔ یہ ناممکن سی بات ہے، لیکن یہ تو اس کے بس کی بات ہے کہ وہ بہترین خیالات، تازہ ترین اور فرحت بخش تصورات سے واقفیت بہم پہنچائے۔

اردو فکشن کے اہم ناقدین کا مطالعہ پیش کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ ناقدین حضرات نے تنقید، تنقید کے اصول اور ادبی فن پارے کو تنقیدی دبستان کے کس زمرے اور نظریات سے پرکھنے اور جانچنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ان کی تصنیفات سے ہمیں بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔اردو فکشن کے اہم ناقدین کے مطالعہ کے سلسلے میں میں نے بالترتیب اردو نقادوں کی تاریخ پیدائش، ان کی تعلیم، ملازمت، ادبی سفر اور چند کتابوں کا اجمالی جائزہ اور ان کی تنقید سے ادب و زندگی پر جو اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ان سبھی عوامل پر گفتگو کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔

☆☆☆

کلیم الدین احمد

اردو زبان وادب کے مشہور نقاد پروفیسر کلیم الدین احمد کی پیدائش ۱۵ستمبر ۱۹۰۸ءعظیم آباد کے خواجہ کلاں، پٹنہ سیٹی میں ایک ممتاز خاندان میں ہوئی۔کلیم الدین احمد کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی۔ان کے والدعظیم الدین احمد ایک ذی علم حیثیت کے مالک تھے۔جن کے اثرات ان پر دوررس رہے ہیں۔انہوں نے ہی ان کی تعلیم میں ذاتی دلچسپی لی۔ویسے ان کا خانوادہ ذی علم اور روشن دماغ تھا۔ان کے والدعظیم الدین احمد اپنے وقت کے ذی وقار شاعر بھی تھے۔ان کی تعلیم بھی برطانیہ میں ہوئی اور پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو و فارسی کے صدر بھی رہے تھے اور یونیورسٹی میں ان کا ایک خاص مقام تھا۔ان کے دادا شاہ واعظ الدین احمد بھی ذی علم شخص تھےان کی دادی کے والد حکیم عبدالحمید پریشاں عظیم آباد کے ایک منفرد شاعر سمجھے جاتے تھے۔

گھریلو تعلیم کے بعد ان کا داخلہ ۱۹۲۱ء میں محمڈن اینگلو عربک اسکول، پٹنہ سیٹی میں ہوا۔ابتدا ہی سے کلیم الدین احمد بہت کم سخن رہے تھے اور ان کی دلچسپی صرف مطالعے سے رہی۔۱۹۲۴ء میں انہوں نے میٹرک پاس کیا، لیکن سکنڈ ڈیویژن آیا۔اس کے بعد انہوں نے ۱۹۲۶ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان بھی سکنڈ ڈویژن ہی سے پاس کیا۔ ۱۹۲۸ء میں بی اے میں انگریزی آنرس لیا اور امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ایم اے کے آخری سال میں تھے کہ انہیں اعلیٰ ڈگری کے حصول کے لئے لندن جانے کا سرکاری وظیفہ مل گیا۔لہٰذا ۱۹۳۰ء میں وہ لندن کے لئے روانہ ہوگئے اور ٹرائی پوس کی ڈگری کے حصول کے بعد ۱۹۳۳ء میں واپس آئے۔پھر وہ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ انگریزی سے وابستہ ہوگئے۔

لندن جانے سے پہلے کلیم الدین احمد کی شادی صفیہ بیگم سے ہوچکی تھی، مگر وہ زیادہ دنوں تک ساتھ نہ دے سکیں اور ان کا انتقال ہوگیا۔اس کے بعد کلیم الدین احمد نے ۱۹۳۷ء میں اپنی بڑی سالی زہرہ بیگم سے شادی

کر لی۔ کچھ دنوں بعد والد کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا، مگر انہوں نے اپنے کام میں غفلت نہیں برتی اور تحقیق وتنقید کی افہام وتفہیم میں مصروف کار رہے۔ ۱۹۳۹ء میں انہوں نے اپنے والد عظیم الدین احمد کا شعری مجموعہ 'گل نغمہ' شائع کیا۔ ۱۹۴۰ء میں ان کی کتاب 'اردو شاعری پر ایک نظر' اور ۱۹۴۲ء میں 'اردو تنقید پر ایک نظر' شائع ہوئی۔ ۱۹۴۴ء میں ''اردو زبان اور فن داستان گوئی'' منظر عام پر آئی۔ ۱۹۴۷ء میں وہ بہار سرکار میں ڈپٹی ڈی پی آئی ہو گئے۔

۱۹۷۸ء میں ''سائیکو انالائسس اینڈ لٹریری کریٹی سزم'' شائع کی۔ ۱۹۵۲ء میں پٹنہ کالج، پٹنہ کے پرنسپل ہو گئے اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس بھی ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں ''سخن ہائے گفتنی'' کی اشاعت ہوئی۔ ۱۹۵۸ء میں ڈی پی آئی ہو گئے۔ ۱۹۵۹ء میں ''دو تذکرے'' (تذکرہ شورش اور تذکرہ عشقی) کی جلد اول شائع ہوئی۔ ۱۹۶۸ء میں (دیوان جہان) اور ۱۹۶۳ء میں ''عملی تنقید''۔ ۱۹۶۳ء میں ''دو تذکرے'' حصہ دوم چھپی۔ ''۴۲ نظمیں'' ۱۹۶۵ء میں ''۲۵ نظمیں'' ۱۹۶۶ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئیں۔ ۱۴ ستمبر ۱۹۶۷ء میں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

۱۹۶۷ء میں بہار اسکول اگزامینشن بورڈ میں چیرمین ہوئے۔ ۱۹۷۳ء میں واجد علی شاہ کے خطوط بیگمات کے نام ''تاریخ نور'' کے نام سے اشاعت پزیر ہوئی۔ ۱۹۷۳ء میں ''غالب ایوارڈ'' ملا۔ جنوری ۱۹۷۵ء میں خود نوشت ''اپنی تلاش میں'' جلد اول شائع ہوئی۔ اس کے بعد دوسری جلد بھی۔ ۱۹۷۵ء میں ''کلیات شاد'' ترتیب دے کر شائع کروائی۔ ۱۹۷۶ء میں ''میری تنقید: ایک باز دید'' سامنے آئی۔ ۱۹۷۹ء میں ''اقبال: ایک مطالعہ'' شائع ہوئی۔ ۱۹۸۰ء میں بہار اردو اکادمی کے نائب صدر ہوئے۔ ۱۹۸۱ء میں حکومت ہند نے ''پدم شری'' کا خطاب دیا۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۸۳ء کو بعارضہ قلب ہوا اور خواجہ کلاں، پٹنہ سیٹی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

کلیم الدین احمد زندگی بھر ادبی طور پر فعال رہے ان کی کم گوئی اور مجلسی زندگی سے بیزاری انہیں تعلیم وتعلم کی طرف مبذول کئے رہی اور تصنیف وتالیف کے لئے زیادہ سے زیادہ موقع فراہم ہوتا رہا۔ لہٰذا یہ اردو ادب کے ایک ایسے نقاد ہیں جو اپنے وقت میں ہی نہیں بلکہ آج تک مسلسل تذکرے تجزیے اور مباحثے میں رہے ہیں۔ ان پر کتابیں تصنیف ہوتی رہی ہیں۔ پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کے مقالے بھی لکھے جاتے رہے ہیں۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ عظیم آباد کی تاریخ میں جو مرکزیت شاد عظیم آبادی کے بعد کسی کی رہی ہے تو وہ کلیم الدین احمد ہی ہیں۔

کلیم الدین احمد کی اکثر کتابیں نزاعی رہی ہیں۔ ''اردو شاعری پر ایک نظر'' کے سرسری مطالعے سے بھی

اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے کئی اہم شاعروں کو نہ صرف رد کردیا ہے بلکہ ایک آدھ ایسے شاعر بھی جنہیں اعلیٰ ترین منصب عطا کیا ہے۔ سامنے کی مثال نظیر اکبرآبادی کی ہے جنہیں وہ اردو شاعری کا تنہا ستارہ باور کرتے ہیں۔ وہاب اشرفی نے ان کی تنقیدی روش کو زیر بحث لاتے ہوئے لکھا تھا کہ کلیم الدین احمد صاحب ''ورڈس آف دی پیچ'' کے مطالعے کی باتیں دہراتے رہے ہیں۔

کلیم الدین احمد کی تنقیدی بصیرت کا منبع انگریزی اخبارات اور رسالے لیوس کی ٹرینگ، ایلیٹ کا ''کرائٹیرین'' سہ ماہی رسالہ ''اسکروٹنی'' (لیوس کی ادارت میں نکلتا تھا) رہا ہے۔ کلیم الدین احمد کی شخصیت اور ذہن ودماغ پر براہِ راست لیوس اور انگریزی رسالوں کے اثرات مرتب ہوئے۔ اسی لئے کلیم الدین احمد کو مغرب زدہ کہا جاتا ہے اور اسی زاویہ نظر سے پروفیسر موصوف نے اردو ادب کی تنقید بڑے حوصلے کے ساتھ کیا۔ دراصل مغرب کے سارے اصول ونظریات سے انہیں دلچسپی نہیں رہی ہے بلکہ جو محدود دائرہ ہے بقول وہاب اشرفی جسے کیمبرج اسکول آف کریٹی سزم کہتے ہیں وہی ان کا دائرہ عمل ہے۔ اسی دائرہ عمل کے تحت انہوں نے غزل کو نیم وحشی صنف سخن کہا تو اردو تنقید کو معشوق کی موہوم کمر، نظم گوئی کی روش پر یلغار کی، اردو کے اہم شعرا اور ناقدین کی گردن مارنی چاہی، تنقید میں حالی جیسے نقاد کے ذہن کو سطحی بتایا۔ اقبال کی شاعری کو رد کرنا چاہا، انیس کی مرثیہ گوئی کی دھجیاں اڑائیں، حسن عسکری جیسے ذی علم نقاد کی تکذیب کی۔ غرض کہ وہ تمام ادبی صورتیں جو اردو میں محترم سمجھی جاتی تھیں انہیں کسی نہ کسی طریقے سے زد میں لانے کی کوشش کی۔ نظیر اکبرآبادی ایک شاعر تھے جنہیں اب تک رد کیا جاتا تھا انہیں وہ عظمت عطا کی جو روایتی تنقید کے بالکل خلاف تھی، داستانوں کی عظمت کا احساس دلایا اور اس کے فن پر بصیرت افروز نظر ڈالی۔ غرض ایسی وہ تمام صورتیں اپنائیں جو انہیں لازماً منفرد کرتی تھیں۔

پروفیسر کلیم الدین احمد انگریزی کے استاد تھے۔ انگریزی ادب کے ساتھ ساتھ اردو شعر وادب کی تنقید پر ان کی گہری نگاہ رہی ہے۔ اردو شاعری پر ایک نظر، اردو تنقید پر ایک نظر، سخن ہائے گفتنی، عملی تنقید، اقبال ایک مطالعہ، میری تنقید ایک باز دید اور ادبی تنقید کے اصول وغیرہ ان کی اہم کتابیں ہیں۔ فکشن کی تنقید پر ان کی باضابطہ کتاب کا نام ''اردو زبان اور فن داستان گوئی'' ہے۔ اس کتاب میں پروفیسر کلیم الدین احمد نے داستان، داستان کی ٹیکنیک پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے داستان طلسم ہوشربا، بوستان خیال، مختصر داستانیں اور منظوم داستانوں کا

مطالعہ ومحاسبہ پیش کیا ہے۔ یہ پروفیسر موصوف کی عمدہ تنقیدی تجربات ومشاہدات کا نمونہ ہے۔ داستان کی ٹیکنیک پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''داستان گوئی ایک فن ہے اور اپنے حدود ونقائص کے باوجود ایک دلچسپ فن ہے اور اس قدر کم قیمت نہیں کہ ہم اسے یک قلم نظر انداز کرسکیں۔ افسوس ہے کہ موجودہ زمانہ میں اس فن کے جاننے اور برتنے والے نہیں ملتے اور اب یہ فن دنیائے ادب میں زندہ فن کی حیثیت نہیں رکھتا ہے اور کوئی دوسری صنف سخن اس کا بدل نہیں ہوسکتی۔ اگر ہم کالرج کے الفاظ پر عمل کریں تو داستانوں سے کافی لطف حاصل کرسکتے ہیں۔ اگر ہم اپنی بے اعتقادی کو بہ رضا رغبت معرضِ التوا میں ڈال دیں۔ اگر ہم تخیل کی اس موہوم پیداوار کا عارضی طور پر اعتبار کرلیں تو ہمارے لئے ایک دلچسپ دنیا کا دروازہ کھل جائے گا اور اس دنیا کی سیر محض تضیع اوقات نہ ہوگی۔ بلکہ ہمارے تخیل، ہمارے دماغ، ہماری روح کو تازگی اور فرحت بخشے گی۔''(۱)

پروفیسر کلیم الدین احمد اردو داستان، ناول اور افسانے پر الگ الگ کتاب لکھنے کا خیال رکھتے تھے۔ لیکن کئی مشکلات درپیش رہیں۔ بہرحال مجبوری چاہے جو بھی ہو انہوں نے اردو فکشن کی صرف ایک اہم کلاسیکی صنف ''فن داستان گوئی'' پر قلم فرسائی کی ہے۔ صنف ناول اور صنف افسانہ پر باضابطہ کتاب نہ لکھ سکے۔ اس کے بارے میں وہ بتاتے ہیں:

''خیال تھا کہ اس کتاب کے تین حصے ہوں، لیکن صرف پہلا حصہ لکھا جاسکا۔ دوسرے حصے کا موضوع ناول اور تیسرے کا مختصر افسانہ ہوتا۔ 'فن داستان گوئی' بالاقساط 'معاصر' میں شائع ہوتی رہی، لیکن باقی دو حصے مکمل نہ ہوسکے۔''(۲)

کلیم الدین احمد فکشن کی تنقید خصوصاً داستان کی تنقید میں سخت گیر نظر آتے ہیں۔ لیکن بادی النظر میں یہ سخت گیری مغربی اصول پر بے جا اصرار اور بعض چونکا دینے والے بیانات پر مبنی ہونے کی وجہ سے تاثر قائم کرتی ہے۔ اس

میں کوئی شک نہیں کہ وہ سخت گیر نقاد ہیں اور اپنی تنقید میں مغربی اصول وضوابط کو ہی مثالی نمونہ قرار دیتے ہیں۔ تاہم اردو کے معیاری ادب پاروں کا وہ گہرا شعور رکھتے تھے۔ داستان کی تنقید کے حوالے سے جو انھوں نے کام کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ البتہ ان کی بعض باتوں سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ کیونکہ انگریزی کے جن اصول وضوابط کو انھوں نے اردو فن پاروں کے ناپنے اور تولنے کے لیے نمونہ عمل قرار دیا ہے وہ اردو کے مزاج و ماحول سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ تاہم انھوں نے داستان کی تنقید کے حوالے سے جو اصول وضع کیے ہیں وہ قابل ستائش ہیں۔

☆☆☆

وقار عظیم

وقار عظیم کا پورا نام سید وقار عظیم تھا۔ آپ کی پیدائش ۱۹۱۰ء میں الہ آباد میں ہوئی۔ الہ آباد میں ہی ان کے والد محکمہ پولس میں تھے۔ شاعری ان کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ عرش تخلص کرتے تھے اور یزدانی میرٹھی کے شاگرد تھے۔ ان کا نانیہال میرٹھ میں تھا۔ جب ان کے والد کانپور منتقل ہوئے تو خاندان کے دوسرے افراد بھی وہیں چلے گئے۔ یہیں وقار عظیم کی ابتدائی تعلیم ہوئی۔ والدہ نے ان کی تعلیم میں بڑی دلچسپی لی۔ اردو، فارسی اور دینیات کی تعلیم خود ان کی والدہ نے دی اور ہندی کی تعلیم کے لیے ایک پنڈت گھر پر آتے تھے۔

ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۱۹ء میں اناؤ میں انہوں نے گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخلہ لیا اور یہیں سے مڈل اسکول پاس کیا۔ اسی زمانہ میں مطالعہ سے رغبت بڑھی اور خوب پڑھتے اور لکھتے تھے۔ وہیں سے ایک اخبار ''آفتاب'' نکلتا تھا اس میں ان کا پہلا مضمون شائع ہوا۔ پھر انہوں نے گورنمنٹ جوبلی کالج میں داخلہ لیا۔ تب وہ افسانے بھی لکھنے لگے۔

۱۹۳۳ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے بی اے پاس کیا۔ الہ آباد سے ۱۹۳۴ء میں اردو میں ایم اے کی سند لی۔ جہاں ان کے استاد سید اعجاز حسین نے بڑی مدد کی۔ یہیں ان کی ملاقات پروفیسر ایس سی بیگ اور فراق گورکھپوری سے بھی ہوئی۔ یہ دونوں انگریزی کے استاد تھے۔ وقار عظیم نے ان سے رابطہ قائم کیا اور بہت کچھ اکتساب کیا۔ الہ آباد ہی کے دوران ان کی مشہور کتاب ''ہمارے افسانے'' اور ''افسانہ نگاری'' زیور طبع سے آراستہ ہوئیں۔ پھر وہ علی گڑھ آ گئے اور بی ٹی کا امتحان پاس کیا، چوں کہ ان کے مالی حالات بہت خراب تھے اس لئے ملازمت کرنا ضروری سمجھا اور اردو جامعہ اسکول، دہلی میں استاد ہو گئے۔ اب بھی ان کے حالات درست نہیں ہوئے تھے۔ وہ دوسری ملازمت کی تلاش میں تھے ہی کہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی اعانت سے پولی ٹیکنیک میں ملازم ہو گئے۔ پھر وہ

۱۹۴۶ء میں ''آج کل'' کے ایڈیٹر ہوئے، لیکن تقسیم ہند کے باعث کراچی چلے گئے۔ وہاں ''ماہ نو'' کی ادارت سنبھالی۔ ۱۹۵۰ء میں اورینٹل کالج (پنجاب یونیورسیٹی) میں اردو کے لکچرر ہوئے۔ یہاں وہ ترقی کر کے ریڈر، پروفیسر اور کالج کے پرنسپل بھی ہوئے اور اسی عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

چوں کہ زندگی مسلسل تگ و دو میں گزری اس لئے صحت بھی کبھی اچھی نہیں رہی۔ انہیں دمہ کا عارضہ اور گردوں میں بھی پیچیدگی پیدا ہوگئی تھی۔ انہی حالات میں ۱۷رنومبر ۱۹۷۶ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ وہ لاہور کے قبرستان میانی صاحب میں مدفن کیے گئے۔

سید وقار عظیم کی اہمیت اس لئے ہے کہ انہوں نے افسانے، ناول اور داستان پر کچھ بنیادی کام کئے ہیں۔ ''ہمارے افسانے''، ''افسانہ نگاری''، ''داستان سے افسانے تک'' اور ''ہماری داستانیں'' ان کی مشہور تصانیف ہیں، جن سے طلبا اور ادبا استفادہ کرتے رہے ہیں۔ فکشن کے نئے تیور نے توجیہات کو اس طرح لبیک کہا ہے کہ سید وقار عظیم کی کتابیں آوٹ آف ڈیٹ معلوم ہوتی ہیں، لیکن یہ سچ ہے کہ آج بھی طالب علموں کی ایک کثیر تعداد ان کی کتابوں سے استفادہ کرتی ہے گاہے گاہے قابل نقاد حضرات بھی ان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ بعض اب بھی یہ مانتے ہیں کہ افسانے کے سلسلے میں ان کا کام اتنا وسیع ہے کہ شاید ہی کوئی اور نقاد ان کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔ وقار عظیم نے متعلقہ اصناف کے خدوخال اور ارکان سے بحث کی ہے اور ایک طرح سے ان کے لئے ایک سائنسی اصول وضع کیا ہے۔

وقار عظیم نے عرصہ تک افسانہ کو اپنی فکر اور تنقیدی و تخلیقی ذہن کا محور بنایا۔ افسانے پر ان کی تین کتابیں ''فن افسانہ نگاری''، ''ہمارے افسانے'' اور ''نیا افسانہ'' لکھنے کے بعد وقار عظیم نے اردو ڈرامے کے دو قابل قدر مطالعے اور ''ہماری داستانوں'' کے جائزے پیش کئے ہیں۔ افسانوی ادب کے اس وسیع مطالعے کی بنا پر وقار عظیم نے داستان، ناول اور افسانہ کے رشتہ، ربط باہمی، ارتقاء اور فنی اختلاف وحدود کو جس طرح سمجھا اور سمجھایا ہے اس کی نظیر ہماری تنقید میں نہیں ملتی۔ ان کی کتاب ''داستان سے افسانے تک'' اردو فکشن کی تنقید کی اہم کتابوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے سبھی مضامین خالص داستان، ناول اور خصوصاً افسانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ نئے افسانے کی ابتداء، ارتقاء اور عروج کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ شاید اسی لئے اس کے بیشتر مضامین افسانے کے

فن، اسلوب، روایت اور جدت سے تعلق رکھتے ہیں۔

پروفیسر وقار عظیم نے کتاب ''داستان سے افسانے تک'' میں ایک مضمون ''افسانہ نگاروں کی نئی پود'' کے نام سے لکھا ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے تقسیم کے بعد کے افسانہ نگاروں کا مطالعہ موضوع، مواد اور ہیئت کے اعتبار سے کرتے ہوئے پرانے یعنی تقسیم ملک کے پہلے اور اس کے بعد کے لکھنے والوں کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ اس تعلق سے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

> ''نئی پود کے افسانہ نگاروں میں تفصیل پسندی یہ رجحان بہت کم ہوا ہے۔ انہوں نے تفصیل اور ایجاز کو شیر و شکر کیا ہے اور اس اسلوب کو اختیار کرنے میں ان کا میلان تفصیلی سے زیادہ اختصار کی طرف رہا ہے۔ چونکہ اکثر لکھنے والے تفصیل سے زیادہ اختصار کے اس امتزاج سے فضا پیدا کرنے کا کام لیتے ہیں اس لئے ادبی حسن اور فنی کشش کے پیش نظر انہوں نے ایمائیت و اشاریت کو اپنا رہنما بنایا ہے، انہوں نے اپنے افسانوں میں کسی نہ کسی مقصد کی ترجمانی یا تاثر کی مصوری کرتے وقت ایمائیت و اشاریت سے کام لینے کے علاوہ جن وسائل سے کام لیا ہے ان میں ادبی اور شاعرانہ رجحان غالب ہے۔ اس ادبی اور شاعرانہ رجحان کا اظہار کبھی تضاد کی صورت میں ہوتا ہے اور کبھی طنز کی شکل میں۔ لفظی و معنوی اور طنز کے صرف میں شخصی اور ذاتی میلانات کو جو دخل ہے اس سے قطع نظر یہ دونوں رجحان نئے لکھنے والوں میں مشترک ہیں۔'' (۳)

ان کی دوسری سب سے اہم کتاب ''ہماری داستانیں'' ہے۔ اس کتاب میں پروفیسر موصوف نے تقریباً سبھی داستانوں کا بالاستعاب مطالعہ پیش کیا ہے۔ ان داستانوں میں باغ و بہار، رانی کیتکی کی کہانی، داستان امیر حمزہ، آرائش محفل، بیتال پچیسی، مہجور کی نورتن، فسانۂ عجائب، شرارِ عشق، شگوفہ محبت، گل وصنوبر اور سرشار کی الف لیلہ وغیرہ کو اپنے مطالعہ کا حصہ بنایا ہے۔ ان داستانوں میں کچھ معروف ومقبول ہیں تو چند غیر معروف داستانیں بھی ہیں۔ وقار عظیم کا محبوب مشغلہ کتابیں پڑھنا اور لکھنا تھا۔ داستانیں بھی خوب پڑھی ہیں بقول وقار عظیم:

''داستانوں میں زندگی اور ادب کے جو بیش بہا جواہر جمع ہیں انہیں ایک ایک کر کے اہل نظر کی خدمت میں پیش کرنے کو میں نے اپنا محبوب مشغلہ بنایا ہے۔''(۴)

پروفیسر موصوف نے داستانوں کے عمدہ تجزیے کیے ہیں۔ان کے ذہن وخیال میں داستانوں کی امتیازی خصوصیات تھیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے داستانوں کے اوصاف کو ظاہر کیا ہے۔ان کے مطالعے اور محاسبے کا یہی باعث ہے۔وہ خود ہی ہماری داستانیں کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''مختلف داستانوں کے متعلق کچھ لکھتے وقت لکھنے والے نے کیا باتیں پیش نظر رکھی تھیں۔اس سوال کا میرے پاس ایک جواب ہے اردو کی ہر مشہور داستان کا مطالعہ کرنے کے بعد جب میں نے اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا اور اس کے اجزاء کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی تو مجھے ہر داستان میں کوئی ایسی بات نظر آتی ہے جو صرف اس داستان کا امتیاز ہے اور اسی امتیاز کی بدولت اسے ایک منفرد حیثیت ملی ہے۔ میں نے اسی امتیازی خصوصیت کو اپنے مضامین کا موضوع بنایا ہے۔مثلاً باغ و بہار کا امتیاز قصہ گوئی اور لطف بیان کی خصوصیتوں کے علاوہ اس کا وہ متوازن اور سنبھلا ہوا اسلوب ہے جو باغ و بہار کے علاوہ کسی اور داستان میں نہیں ملتا ہے۔اسلوب کا یہی توازن اور ہمواری اور بیان کی یہی شگفتگی و دل نشینی ہے جس نے اسے قبول عام کا شرف بخشا ہے............

فسانۂ عجائب کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کا وہ اندازِ بیان ہے۔جس پر لکھنؤ کے تہذیبی مزاج کی گہری چھاپ ہے۔ رانی کیتکی کی کہانی انشا کی ذہانت طبع اور جدت تخیل کی ترجمان ہے۔نورتن کی کہانیوں کے تنوع نے انہیں دلچسپ بنایا ہے۔حاتم کی صحبتوں میں حقیقت اور تخیل کے لطیف امتزاج سے دلکشی پیدا ہوئی ہے اور داستان امیر حمزہ کے دو مختلف نسخوں میں مصنفوں کے مزاج اور ماحول کا نقش ثبت ہے۔اس طرح مضامین کے اس مجموعے میں

اتفاق سے وہی تنوع پیدا ہو گیا ہے جس کی مظہر ہماری داستانیں ہیں۔‘‘(۵)

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ انھوں نے اس سلسلے میں اور بھی کئی اہم کتابیں لکھی ہیں جن کی فہرست ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

(۱)	افسانہ نگاری	۱۹۳۵ء
(۲)	ہمارے افسانہ نگار	۱۹۳۵ء
(۳)	انشا کی تعلیم	۱۹۴۳ء
(۴)	ہندوستان پانچ ہزار برس پہلے	۱۹۴۳ء
(۵)	علامہ راشد الخیری	۱۹۴۵ء
(۶)	نیا افسانہ	۱۹۸۲ء، ۱۹۴۶ء
(۷)	ہماری داستانیں	۱۹۵۶، ۶۸، ۸۰ء
(۸)	اقبال ادب	۱۹۵۸ء
(۹)	داستان سے افسانے تک	۱۹۶۰ء
(۱۰)	امریکی ناول اور اس کی روایات	۱۹۶۱ء
(۱۱)	اقبال معاصرین کی نظر میں	۱۹۸۲، ۱۹۷۳ء
(۱۲)	اقبال شاعر اور فلسفی	۱۹۸۲ء، ۱۹۷۵ء
(۱۳)	اقبالیات کا مطالعہ	۱۹۷۷ء
(۱۴)	فن افسانہ نگاری	۱۹۹۷ء، ۱۹۷۷ء
(۱۵)	آغا حشر اور ان کے ڈرامے	۱۹۶۰ء، ۱۹۷۸ء
(۱۶)	منٹو کا فن	۱۹۸۲ء
(۱۷)	فورٹ ولیم کالج تحریک اور تاریخ	۱۹۸۶ء
(۱۸)	چند قدیم ڈرامے	۱۹۹۲ء
(۱۹)	اردو ڈراما: فن اور منزلیں	۲۰۰۵ء
(۲۰)	اردو ڈرامافن: تنقیدی اور تجزیاتی	۱۹۹۶ء
(۲۱)	داستان امیر حمزہ	۱۰۰، ۱۰۲، ۰۳، ۰۴، ۰۵

اردو فکشن کی تنقید کے حوالے سے سید وقار عظیم کا نام کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔انھوں نے داستان، ناول، افسانے اور ڈرامے وغیرہ کے فن پر خوب لکھا اور مشرقی ومغربی اصول ونظریات سے استفادہ کرتے ہوئے فکشن کی تنقید کے فنی وسائل اور تکنیک میں تنوع پیدا کیا ہے۔اس میں ان کا انداز استدلالی ہے۔ان کی اہم کتابیں ہماری داستانیں اور فورٹ ولیم کالج براہ راست داستان کی تنقید سے تعلق رکھتی ہیں۔داستان سے افسانے تک اور فن اور فن کار میں بھی انھوں نے وہ انداز اختیار کیا ہے جو تنقید کے لیے نہایت موزوں اور مناسب ہے۔

انھوں نے اول الذکر کتاب میں داستانوں کی خصوصیات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور باغ و بہار، رانی کیتکی کی کہانی، داستان امیر حمزہ، آرائش محفل، بیتال پچیسی، نورتن، فسانہ عجائب، شگوفہ محبت، گل وصنوبر اور الف لیلہ وغیرہ کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ لیا ہے جو آج بھی یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔انھوں نے داستانوں کی جانچ اور پرکھ کے لیے جن پیمانوں کو اپنے لیے نمونہ عمل قرار دیا ہے وہ قابل ستائش ہیں۔ان میں سخت گیری اور جانب داری نہیں ہے۔بلکہ ایک معتدل نقاد کی حیثیت سے وہ ان کا جائزہ لیتے ہیں اور آخر میں جن نتائج پر پہنچتے ہیں ان کو بے باکی کے ساتھ قلم بند کر دیتے ہیں۔یہی ان کا مابہ الامتیاز بھی ہے۔

☆☆☆

سید احتشام حسین

سید احتشام حسین اردو ادب کا ایک جلیل القدر نام ہے۔ یہ بنیادی طور پر اردو کے استاد، تنقید نگار، افسانہ نگار، سفر نامہ نگار اور ڈرامہ نگار اور شاعر بھی تھے۔ وہ مارکسی نظریات کے حامل تھے۔ ترقی پسند تنقید کا ذکر ان کے نام کے بغیر نامکمل ہے۔ ان کی پیدائش ۲۱ اپریل ۱۹۱۲ء کو اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ کے ایک قصبے ماہل میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم اور ہائی اسکول تک کی پڑھائی اعظم گڑھ میں ہی مکمل کی۔ ہائی اسکول پاس کر کے آگے کی تعلیم کے لیے الٰہ آباد آ گئے اور یہیں سے انٹرمیڈیٹ، گورنمنٹ کالج، الٰہ آباد سے مکمل کرنے کے بعد بی۔ اے ۱۹۳۴ء میں نیز ایم اے (اردو) الٰہ آباد یونیورسٹی سے ۱۹۳۶ء میں پاس کرنے کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو فارسی کے شعبے میں اردو کے لکچرر ہوئے۔

سولہ برس کی ملازمت کے بعد ۱۹۵۲ء میں امریکہ کی ایک ادبی انجمن نے موصوف کو لکچر کے لئے مدعو کیا انہوں نے اس دعوت کو قبول کیا اور تقریباً ایک سال کے لئے امریکہ چلے گئے اور اپنے لکچروں سے وہاں کے لوگوں کو متاثر کیا اور انہیں خوب پسند کیا گیا امریکہ سے لوٹتے وقت پروفیسر سید احتشام حسین نے انگلستان اور فرانس کا بھی سفر کیا۔ ۱۹۶۱ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں پروفیسر اور صدر شعبہ اردو کی باگ ڈور سنبھالی اور آخر وقت تک علمی اور ادبی کاموں میں مصروف عمل رہے۔ یکم دسمبر ۱۹۷۲ء کو انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

اردو تنقید کو احتشام حسین نے اپنے وسیع مطالعے اور پر مغز تحریروں سے بڑی توانائی عطا کی۔ ان کے زمانے میں، اردو تنقید پر مشرقی طرز تنقید کا بڑا اثر تھا۔ محمد حسین آزاد، حالؔی، شبلی اور کچھ نئے لکھنے والے جن میں عبدالرحمٰن بجنوری، نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھپوری ایک خاص ڈھنگ کی تنقید لکھنے میں مصروف تھے۔ احتشام حسین کے وقتوں میں ترقی پسند ادب کا بول بالا ہوا اور جب ۳۶-۱۹۳۵ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام ہوا،

تو احتشام حسین، انجمن ترقی پسند مصنفین کے موئید ہوئے اور ادب کے اس نظریے کے مطابق، ادب کا تنقیدی جائزہ پیش کرنے لگے۔

احتشام حسین کی تنقیدوں میں اس وقت یہ سوال اٹھنے لگے کہ ادب میں ہیئت کی اہمیت زیادہ ہے یا مواد (Matter) کی۔ شاعری میں جمالیاتی اقدار سے کیا مراد ہے؟ سماج اور ادب کا کیا رشتہ ہے؟ تنقید اور عملی تنقید کا مطلب کیا ہے؟ احتشام حسین نے اپنے مختلف مضامین میں، ان تمام باتوں کی منطقی اور توضیحی وضاحتیں پیش کیں۔ اپنی نظریاتی بحثوں اور عملی تنقیدوں سے اپنے قارئین کو مطمئن اور تنقید کو باوزن و باوقار بنایا۔ احتشام حسین کی تنقیدی فکر کا محور، ہمیشہ مارکسی فلسفہ حیات رہا ہے۔ ان کا ایمان ہے کہ ادب زندگی سے بیگانہ ہو کر نہیں رہ سکتا۔ اس کو سماج کا آئینہ بننا ضروری ہے۔

احتشام حسین، اپنی تنقیدوں میں، دلائل، براہین اور نظم وضبط کا بے حد خیال رکھتے ہیں۔ ان کی تنقیدیں، تاریخ، تہذیب اور سماجی زندگی کی مختلف کارفرمائیوں کے ساتھ، تمام ادب کا جائزہ لیتی ہیں۔ تاریخ جو حالات اور زندگیوں کو بدلتی جاتی ہے اور انسان انہیں تبدیل ہوتی ہوئی صورتوں سے اپنی زندگی، ارتقا، تنزل، حظ اور دلچسپیوں سے گزرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ان کی فکر اور طور طریقے اسی محور پر مرکوز ہیں۔ سرشار کے خوجی اور میاں آزاد کا جو مطالعہ احتشام حسین نے پیش کیا ہے اور اودھ کی بدلتی ہوئی زندگی میں جو بدلاؤ اور پیچ وخم آئے، ان سب میں تاریخ اور تہذیب کی بدلتی ہوئی قدروں کا ہی ہاتھ رہا ہے جو ایجابی بھی ہے اور انکاری بھی۔ یہ تبدیلیاں بتدریج آتی ہیں، جن کے ردوقبول میں کسی ایک خاص دور کے انسان، اپنے طبقاتی شعور کے ساتھ شریک ہوتے ہیں اور اسی معرفت اور آگہی کا اظہار ادب میں ہوتا رہتا ہے۔ کبھی ایجاب وقبول میں ایک سمجھوتے کی بھی شکل نظر آتی ہے۔ جس سے قدیم روایات اور جدید زندگی کے امکانات میں تصادم بھی ہوتا ہے، مگر اس میں سے زندگی کو آگے بڑھانے والی طاقتیں بھی انسانی زندگی کو لے کر آگے بڑھتی ہیں۔ احتشام حسین کی تنقیدوں میں یہ بات ہر ہر قدم پر دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کے یہاں ماضی کا احترام بھی ہے اور حال کی خوش آئند قدروں سے دلچسپی بھی اور اسی لئے ترقی پسند امکانات کا وہ خیر مقدم بھی کرتے ہیں اور ان کی وکالت بھی کرتے ہیں۔ جسے انہوں نے عقلیت، تنقیدی شعور کی نئی فضا، افادیت اور خواہش اصلاح سے تعبیر کیا ہے۔

انگریزی ادب کے مطالعے نے ان کی تنقیدوں میں مزید گہرائی پیدا کی۔ ان کے یہاں ادب کو پرکھنے کے مشرقی اور مغربی پیمانے دونوں تقریباً ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ مغربی تنقید کے تقریباً تمام اسکولوں پر ان کی نظر رہی ہے اور ان میں سے ہر اچھے نظریئے اور فکر کو انہوں نے اپنی تنقیدوں میں سمونے کی کوشش کی ہے جس کے باعث اردو تنقید، ان کے ہاتھوں، مغربی تنقید اور ادبی پرکھ کے بہت قریب پہنچتی نظر آتی ہے۔

احتشام حسین کے تنقیدی مضامین کے متعدد مجموعے اور دو ایک مکمل تنقیدی نیز دیگر کتابیں بھی شائع ہوئیں جو بالترتیب یوں ہیں:

(۱) ادب اور سماج (۱۹۴۸ء)

(۲) تنقید اور عملی تنقید (۱۹۵۲ء)

(۳) تنقیدی جائزے (۱۹۵۶ء)

(۴) روایت اور بغاوت (۱۹۵۶ء)

(۵) عکس اور آئینے (۱۹۶۲ء)

(۶) ذوق ادب اور شعور (۱۹۶۳ء)

(۷) افکار و مسائل (۱۹۶۳ء)

(۸) اعتبارِ نظر (۱۹۶۵ء)

(۹) ادب پارے (۱۹۶۷ء)

(۱۰) اردو لسانیات کا خاکہ (۱۹۷۱ء)

(۱۱) جدید ادب: منظر و پس منظر (۱۹۸۲ء)

(۱۲) جوشؔ ملیح آبادی: انسان اور شاعر (۱۹۸۳ء)

(۱۳) ساحل اور سمندر (سفر نامہ) (۱۹۸۴ء)

(۱۴) ویرانے (افسانوں کا مجموعہ)

(۱۵) اردو ساہتیہ کا آلوچناتمک اتہاس (ہندی میں)

احتشام حسین ایک بلند قامت نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ تخلیقی صلاحتیوں سے بھی بہرہ ور تھے۔جس فن پارے کا جائزہ لیتے یا جس شخصیت کو اس کے فن کے تناظر میں جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کرتے اس کے تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے۔مثال کے طور پر ان کی تنقیدی تحریر کا نمونہ پیش ہے:

''پریم چند کی حقیقی قدر و قیمت کو سمجھنا چاہتا ہے تو اسے، ان کی چند خامیوں یا ان فنی نقائص میں الجھ کر نہیں رہ جانا چاہئے جن سے، پریم چند نہ بچ سکے بلکہ انسان دوستی کے اس بے پناہ طوفان کو دیکھنا چاہئے جو غلاموں، مزدوروں، کسانوں، مظلوموں اور اچھوتوں کے لئے، ان کے دل میں اُٹھ رہا تھا اور ان کے فن کو جہد حیات میں کام آنے والا، ایک نازک مگر مضبوط آلہ بنا تا تھا۔''(٦)

احتشام حسین کی فکشن کی تنقید بہت سادہ، سلیس اور شائستہ ہے۔ان کی تنقید معروضی پیمانہ تلاش کرتی ہے، اس لیے ان کی تنقید میں چمکتے ہوئے فقرے، جگمگاتے ہوئے جملے اور کڑکتے ہوئے گرجدار فیصلے نہیں ہوتے، بلکہ ان کا لب ولہجہ بہت سادہ اور شائستہ ہوتا ہے۔ وہ فکشن کی تنقید میں معروضیت کے قائل ہیں۔ بلکہ اگر ان کو معروضیت کا بانی قرار دیا جائے تا مبالغہ نہیں ہوگا۔انھیں اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ تنقید میں سوز و گداز بھی پایا جائے۔خوبیوں کے ساتھ کمیوں کی بھی نشاندہی کی جائے لیکن انداز جارحانہ نہیں ہونا چاہیے۔

انھوں نے انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی سرگرمیوں میں حصہ لیا تھا، اس لیے آگہی کی بدلتی کروٹوں سے بخوبی واقف تھے۔ان کا ماننا تھا کہ آگہی صرف فرد اور سماج کو ہی متاثر نہیں کرتی بلکہ ادب پر بھی غیر معمولی اثر انداز ہوتی ہے۔ہم ادب کے گھروندے الگ سے بنا کر چاہے جتنا خوش ہوں مگر یہ سارے گھروندے معاشرے سے ہی وجود میں آتے ہیں۔اس لیے وہ وہ تنقید میں سماج اور معاشرے کی شمولیت کو لازمی تصور کرتے ہیں اور ادب کے ان پہلوؤں پر زیادہ زور دیتے ہیں جن کا تعلق سماج اور معاشرے کی تعمیر یا تخریب سے ہو۔یہی وجہ ہے کہ ان کو ترقی پسند تنقید کا قدر آور نقاد تسلیم کیا جاتا ہے۔

احتشام حسین کا ماننا ہے کہ ہمارا معاشرہ مختلف طبقات میں بنٹا ہوا ہے جس کی وجہ سے سماج اور معاشرے میں ہمیشہ بدنظمی اور تخریب کارفرما رہتی ہے۔اسی طرح طبقوں میں مختلف طبقے بنٹے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے ہر

طبقہ اپنے مفاد کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ گویا زندگی کی کتاب ایک سلسلہ ہے کوئی سادہ ورق نہیں کہ نیا صفحہ پلٹنا ہے تو پچھلے سارے ورق نظر سے اوجھل ہو جائیں۔ اس کا ہر صفحہ بلکہ ہر جملہ اور ہر لفظ ایک دوسرے سے پیوست ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احتشام حسین نے ہمیشہ ادب اور زندگی کو ایک دوسرے سے جوڑ کر دیکھنا اور جانچنا اور پرکھنا سکھایا۔ ان کی پوری تنقید پر مارکسیت کی چھاپ نظر آتی ہے۔ بلکہ کہیں کہیں وہ مارکسزم سے اس قدر متاثر ہو جاتے ہیں کہ سب سے پہلے فن پارے کے سماجی پہلوؤں پر ہی نظر ڈالتے ہیں۔ ان سب کے باوجود ان کی تنقید کی سب سے بڑی دین یہی ہے کہ انھوں نے اردو تنقید کو جارحیت سے پاک صاف کیا اور اسے اعلی اقدار سے روشناس کرایا۔

☆☆☆

گیان چندجین

اردو کی مایہ ناز شخصیت گیان چندجین کا وطن سیوہار ضلع بجنور یوپی ہے۔ یہ مذہبی اعتبار سے جین اور ذات اگروال تھی۔ ان کی پیدائش ۱۹ رستمبر ۱۹۲۳ء کو ہوئی۔ انہوں نے ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی تھی جہاں علم وادب کی قندیلیں پہلے سے روشن تھیں۔ ان کے والد بحال سنگھ والدہ پاروتی پرداداحکیم پدم سنگھ فارسی کے عالم تھےاور شعرو شاعری بھی کرتے تھے۔ تخلص زیرک رکھتے تھے۔ ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے فارسی مخطوطات گیان چندجین کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ گیان چندجین کی شادی ۱۹۵۳ء میں سہارن پور میں ہوئی۔ ان کی بیگم کا نام ارملا ہےاور وہ سناتن دھرم سے تعلق رکھتی ہیں۔

ابتدائی تعلیم کے بعد مسلم قدرت اسکول سوہارا سے انہوں نے آٹھویں درجے کا امتحان پاس کیا۔ مرادآباد سے ۱۹۳۹ء میں ہائی اسکول، گورنمنٹ انٹر کالج سے انٹرمیڈیٹ ۱۹۴۱ء میں، الہ آباد یونیورسٹی سے بی اے، ایم۔اے کے بعد ''اردو کی نثری داستانیں'' کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ لکھا اور ڈی فل کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے آگرہ یونیورسٹی سے بھی سوشیالوجی میں ایم۔اے کیا اور وہیں سے ۱۹۶۰ء میں ڈی لٹ کی سند حاصل کی۔ پھر ساگر یونیورسٹی سے لسانیات میں بھی درس لیا اور ۱۹۶۲ء میں کرناٹک یونیورسٹی بھاڑوار میں شامل ہوکر ایڈوانس لسانیات کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔

گیان چندجین نے مختلف جگہوں پر ملازمت اختیار کی اور ترقی کے زینے طے کرتے ہوئے کئی کالجوں میں اپنی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۵۰ء میں حمیدیہ کالج بھوپال میں اردو کے لکچرر ہوئے اور اسی کالج میں پروفیسر بھی ہوئے۔ پھر وہ گورنمنٹ ڈگری کالج میسور کے پرنسپل ہوئے۔ ۱۹۶۵ء میں جموں کشمیر یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہوئے۔ وہاں گیارہ سال ملازمت کرتے رہے۔ اس کے بعد ۱۹۷۶ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسرو

صدر شعبہ اردو ہو گئے۔ دسمبر ۱۹۷۰ء میں حیدر آباد کی سنٹرل یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہوئے۔

پروفیسر گیان چند کو حکومت ہند کی جانب سے ''ساہتیہ اکادمی ایوارڈ'' برائے ''ذکر و فکر'' ۱۹۸۲ء میں اور ''پدم شری'' اعزاز برائے ''ادب و تعلیم'' دیا گیا۔ ان کی زندگی کے آخری ایام متحدہ امریکہ میں گزرے۔ وہ وہاں بھی علم و ادب کو فروغ دیتے رہے۔ ۱۹ اگست ۲۰۰۷ء کو اس دریائے فانی کو خیر باد کہہ دیا۔

گیان چند جین اردو کے ایک نامور ادیب اور محقق رہے ہیں۔ ادبی طور پر بے فعال اور متحرک رہے۔ انہوں نے داستان اور مثنوی پر بطور خاص کام کیا ہے اور ان کی متعلقہ کتابیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ لسانیات سے ان کا شغف محتاج تعارف نہیں ہے۔ تاریخ ادب اردو سے بھی ان کی دلچسپی رہی ہے اور انہوں نے فروغ اردو، دہلی کے لئے سیدہ جعفر کے ساتھ دکنی ادب کی تاریخ متعدد جلدوں میں قلمبند کی۔

''اردو کی نثری داستانیں'' پہلے انجمن ترقی اردو پاکستان سے ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی، لیکن جین صاحب نے اس میں مزید تصحیح اور اضافے کئے جو ۱۹۶۹ء میں پاکستان ہی سے شائع ہوئی۔ گیان چند جین نے لکھا ہے کہ وہ اس کتاب پر مزید کام کر رہے ہیں۔ گویا یہ کتاب یوں تو سبھوں کی نظر میں ہے، وہ خود بھی اسے مزید مفید بنانے کے لئے برابر کوشش کرتے رہے ہیں۔ ڈی لٹ کا مقالہ ''اردو مثنوی شمالی ہند میں'' ۱۹۶۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ''تفسیر غالب'' ان کی ایک اہم کتاب ہے۔ دراصل اس میں غالب کے قلم زد کلام کی شرح پیش کی گئی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی، لیکن کتاب پر تاریخ اشاعت ۱۹۷۱ء درج ہے۔ یہ اطلاع خود مصنف نے بہم پہنچائی ہے۔

غالب کے سلسلے میں ایک دوسری کتاب ''رموز غالب'' ہے۔ دراصل یہ گیان چند جین کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کے سبھی مضامین غالب سے متعلق ہیں جسے انہوں نے ۱۹۷۶ء میں مکتبہ جامعہ سے شائع کرایا۔ تحقیق و تنقید کا ایک مجموعہ ''حقائق'' کے نام سے ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔ اس طور کا ایک دوسرا مجموعہ ''ذکر و فکر'' بھی ہے۔ ایک ضخیم کتاب ''عام لسانیات'' بھی شائع ہو چکی ہے۔ انہوں نے قاضی عبدالودود پر ایک مفصل کتاب بہ عنوان ''قاضی عبدالودود بہ حیثیت مرتب متن'' قلمبند کی ہے۔ یہ کتاب ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دلی سے شائع ہوئی۔

گیان چند جین انتھک محنت کرنے والے ایک ایسے ادیب ہیں جو ادبی حقائق بغیر کسی تعصب کے سامنے

لانے کی کوشش کرتے رہے۔ان کی محنت اور دل جمعی سے اردو کے کئی الجھے اور پیچیدہ مسائل حل ہوئے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنی تحقیق میں بھی اپنے بیان کو کافی ترسیلی بنانے کی کوشش کرتے تھے۔گیان چندجین کے مضامین میں بھی علم وتحقیق کی بصیرتیں ملتی ہیں۔جین صاحب ہمارے ادبی سالاروں میں ایک ہیں جن کی رہنمائی میں تحقیق وتنقید مسلسل آگے بڑھتی رہی۔ نیز لسانیاتی مطالعات کا شغف لوگوں کو متاثر کرتا رہا۔

آپ نے اردو ادب کی تقریباً سبھی صنفوں پر مضامین لکھے ہیں اور باضابطہ طور پر کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں۔ اردو فکشن کی تنقید کے تعلق سے ان کی باضابطہ اور براہِ راست کتاب ''اردو کی نثری داستانیں'' ہے اس کتاب پر انہیں ڈی فل کی ڈگری تفویض ہوئی۔ یہ کتاب پاکستان سے دومرتبہ چھپی اس کے بعد پروفیسر موصوف دوبارہ اس کتاب پر مسلسل ایک سال تک مواد، ہیئت اور دوسری داستانوں کی مشتملات میں ترمیم واضافہ کرتے رہے پھر اسے ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہوں سے چھپوایا۔زیر مطالعہ کتاب کم وبیش ایک ہزار صفحات اور تیرہ ابواب پر مشتمل ہے۔عہد قدیم میں قصہ گوئی، اردو کا قدیم افسانوی ادب، داستانوں کے فروغ وزوال کے اسباب، دکنی قصے، شمالی ہند میں داستان نویسی، فورٹ ولیم کالج کا دور، سنسکرت اور ہندی سے متاثر قصے، سرور کا عہد، اردو میں الف لیلہ، داستان امیر حمزہ اور بوستانِ خیال کا بالاستیعاب مطالعہ پیش کرتے ہوئے اردو نثر میں داستانوں کا مقام معین کرنے کی کوشش کی ہے۔اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''غرض داستان ماضی کے ورثے کی بیش بہا متاع ہے۔اردو ادب کی تاریخ اس کو کبھی نظروں سے نہیں اتار سکتی۔اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے بڑی سرعت سے نثر کو دل نشیں اور دل نواز بنا دیا۔اس میں متعدد اسالیب کے کامیاب تجربے کئے۔شاعری کے بعد یہ ادبیت کا سب سے بڑا مخزن قرار پائی۔نثر میں کوئی صنف شاعری سے کندھا ٹکراتی ہے تو وہ داستان ہے۔ داستان کی بدولت اردو نثر کو کتنی جلد پایہ اعتبار ملا۔وہ بیک وقت بادشاہوں کی بارگاہوں، امراء کی مجلسوں اورعوام کے اجتماعوں کی روحِ رواں بن گئی۔اس نے اردو کو وجہی، میرامن انشاء اور رجب علی بیگ سرور جیسے صاحب طرز انشاء

پرداز دیئے۔ اس نے اردو نثر کو فکر و ذہن نہیں دیا، لیکن قلب ونظر، جذب و
تاثیر ضرور دیئے۔
چوتھائی صدی تک داستان اور ناول میں آویزش رہی جس میں داستان کو پسپا
ہونا پڑا، لیکن یہ سخت جان صنف اب بھی ایوانِ ادب میں ایک جائے موقر پر
فائز ہے۔ اب بھی گاہے گاہے کسی سرزمین سے اس کی جوت جاگ اٹھتی ہے۔
رام پور میں آخری داستان گو ۱۹۴۰ء تک داستان تصنیف کرتے رہے۔ الف
لیلہ کی سب سے ضخیم ترجمے کی آخری جلد ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی۔ حیرت یہ
ہے کہ داستان ابھی تک دلوں کو سیر کئے ہے۔ چنانچہ پچھلے چند برسوں میں طلسم
ہوشربا کا ایک انتخاب اور تلخیص شائع ہوئی۔ 'سب رس' کی تصنیف سے رئیس
احمد جعفری کے طلسم ہوشربا تک داستان کی دل آویز کہانی سوا تین سو سال میں
مکمل ہوئی ہے۔ اب بھی اہل نقد اور ارباب تحقیق جب اس کے شعلہ طور پر
ایک نگاہ بازگشت ڈالتے ہیں تو چشم و دل، ذہن و روح ہجوم تجلی سے معمور ہو کر
رہ جاتے ہیں۔''(۷)

اتر پردیش اردو اکادمی کے چیرمین (محمد رضا انصاری) نے کتاب کی اہمیت اور انفرادیت پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:

''اردو نثر کے آغاز وارتقاء کے مطالعے کے لئے بالعموم اور اردو کے داستانی
ادب کے بالاستعاب مطالعے کے لئے علی الخصوص اس کتاب سے رجوع کرنا
ناگزیر ہے۔''(۸)

گیان چند جین کی فکشن کی تنقید کے حوالے سے مشہور و معروف کتاب 'اردو کی نثری داستانیں' ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی اور ۱۹۶۰ء تک اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا۔ اس دوران ان کا تنقیدی شعور مزید پختہ ہو گیا۔ چنانچہ اس میں ترمیم واضافے کے ساتھ اس کا جدید ایڈیشن ۱۹۶۰ء میں کراچی سے شائع کرایا۔ اس کے علاوہ اس سلسلے کی ان کی دوسری اہم کتاب 'ذکر و فکر' ہے جس میں داستان، ناول اور افسانہ وغیرہ کے حوالے سے تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ اس

میں تحقیقی وتبصراتی مضامین بھی ہیں لیکن فکشن کی تنقید کے حوالے سے انھوں ے جو کچھ قلم بند کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ مجموعی طور پر جائزہ لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک عالمانہ اور محققانہ بصیرت کے ساتھ فکشن پاروں کے تجزیے پیش کرتے ہیں اور ہر جگہ ان کی ناقدانہ بصیرت ان کو اپنے ہم عصروں سے ممتاز ونمایاں کیے ہوئے رہتی ہے۔ گیان چند جین کی یہی علمی وادبی ہمہ گیریت ان کو فکشن کے صف اول کے ناقدین میں شامل کرتی ہے۔

انھوں نے داستان کے بنیادی اصول وضوابط اور فنی تقاضے قائم کیے اور داستان کے پلاٹ کی دو اہم قسمیں بتائیں۔ پہلی وہ ہے جس میں پلاٹ واحد ہوتا ہے یعنی داستان ایک یا چند کرداروں کی سرگزشت ہوتی ہے اور داستان کی ابتدا اور انتہا تو ہوتی ہے لیکن درمیان میں کہانی ادھر ادھر بھٹکتی رہتی ہے۔ اسی طرح گیان چند جین کردار نگاری، منظر نگاری اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ زبان و بیان اور اسلوب کو بھی داستانوں کے لیے ضروری خیال کرتے ہیں۔ غرض انھوں نے اردو فکشن کی تنقید کے حوالے سے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔

☆☆☆

ممتاز شیریں

ممتاز شیریں اردو ادب کی نامور افسانہ نگار، تنقید نگار اور ترجمہ نگار کے طور پر مشہور و معروف ہیں۔ ان کی تخلیقی اور تنقیدی کامرانیوں سے اردو ادب کی ثروت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ علمی اور ادبی ماحول میں ان کی پیدائش ۱۲ستمبر۱۹۲۴ء کو اپنے آبائی وطن بنگلور میں ہوئی۔ ان کے والد قاضی عبدالغفور اپنے عہد کے ممتاز عالم تھے۔ عربی اور فارسی زبان پر انہیں دسترس حاصل تھی۔ ممتاز شیریں کا گھریلو ماحول ادبی تھا۔ ان کا ننھیالی خاندان بھی روشن خیال اور تعلیم یافتہ تھا۔ ان کے نانا، نانی نے ان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دی۔

ممتاز شیریں ایک ذہین و فطین طالبہ تھیں۔ انہوں نے تیرہ برس کی عمر میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۴۱ء میں مہارانی کالج، بنگلور سے بی اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ۱۹۴۲ء میں ان کی شادی صمد شاہین نام کے شخص سے ہوئی جو پیشے سے وکیل تھے۔ ان کی ازدواجی زندگی خوشگوار رہی اور مزاج میں ہم آہنگی تھی جس کے سبب ۱۹۴۴ء میں اپنے شوہر کی مدد سے بنگلور سے ایک ادبی مجلّہ ''نیا دور'' نکالا۔ ان کے شوہر نے وکالت کے بعد ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ پھر وہ حکومت پاکستان میں سرکاری ملازم ہوگئے۔ وہ ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے حکومت پاکستان کے بیورو آف ریفرنس اینڈ ریسرچ میں جوائنٹ ڈائرکٹر کے منصب پر فائز ہوئے۔

ممتاز شیریں ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد وہاں سے بھی ''نیا دور'' نکالتی رہیں۔ یہ سلسلہ ۱۹۵۲ء تک جاری رہا۔ ''نیا دور'' ممتاز شیریں کی تنقیدی بصیرت کا منھ بولتا ثبوت تھا۔ ممتاز شیریں کو زمانۂ طالب علمی سے ہی سنجیدگی، فہم و فراست، تدبر و بصیرت اور وسیع مطالعہ نے انہیں سب کی منظور نظر بنا دیا تھا۔ ہر جماعت میں وہ اول آتیں اور ہر ایک مضمون کے امتحان میں سرفہرست رہتیں۔ تعلیم حاصل کرنے کا شوق اور ان کے علمی مذاق نے ان سے پاکستان میں بھی یونیورسٹی جانے پر مجبور کیا وہاں انگریزی میں ایم اے کرنے کے بعد وہ برطانیہ چلی

گئیں اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں جدید انگریزی تنقید میں اختصاصی مہارت فراہم کرنے والی تدریسی کلاسز میں داخلہ لیا۔انگریزی ادب کے نابغہ روزگار نقادوں اور ادیبوں سے اکتساب فیض کیا اور انگریزی ادب کا وسیع اور عمیق مطالعہ میں منہمک رہیں۔ان کی دلی تمنا تھی کہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں ان کی تعلیم جاری رہے اور وہ اس عظیم جامعہ سے ڈاکٹریٹ کریں، لیکن بعض ناگزیر حالات و مسائل کے باعث اپنا نصب العین حاصل نہ کرسکیں۔

ممتاز شیریں نے اپنی زندگی کے زیادہ تر اوقات تعلیم حاصل کرنے میں گزارا۔ ملازمت کی طرف انہوں نے رخ کیا ہی نہیں ورنہ انہیں بہت آسانی سے سرکاری محکمہ میں نوکری مل جاتی۔بعد میں حکومت پاکستان نے انہیں وفاقی وزارت تعلیم میں بہ حیثیت مشیر کے عہدے پر فائز کیا۔ بہت قلیل مدت میں انہوں نے بہت سارے کام انجام دیئے۔۱۹۷۲ء میں پیٹ کے سرطان کا عارضہ ان کے اوپر لاحق ہوگیا۔مرض میں اس قدر شدت آئی کہ ۱۱/ مارچ ۱۹۷۳ء کو اسلام آباد میں آخری سانس لی۔

ممتاز شیریں نے ۱۹۴۲ء میں تخلیقی ادب میں اپنے سفر کا آغاز کیا۔ان کا پہلا افسانہ ''انگڑائی'' ادبی مجلّہ ''ساقی'' دہلی میں ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا تو ادبی حلقوں میں اسے زبردست پزیرائی ملی۔اصل میں فرائڈ کے نظریہ تحلیل نفسی کو جس موثر انداز میں پیش کیا ہے وہ قاری کو مسحور کردیتا ہے۔ وہ ایک مستعد اور فعال تخلیق کار تھیں۔ان کے اسلوب کو علمی و ادبی حلقوں نے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا۔۱۹۵۴ء میں ہالینڈ کے دارالحکومت میں ایک بین الاقوامی ادبی کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی کرتے ہوئے ممتاز شیریں نے ''عالمی ادب کے تناظر میں عصری آگہی'' کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔اس عالمی ادبی کانفرنس میں انہیں دنیا کے نامور ادیبوں اور دانشوروں سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ادب کو وہ زندگی کی تنقید اور درپیش صورتِ حال کی اصلاح کے لئے بہت اہم سمجھتی تھیں۔

ممتاز شیریں اردو کی پہلی خاتون نقاد، افسانہ نگار، مترجم اور تانیثیت کی علم بردار ہیں۔وہ ادب میں ان تمام پہلوؤں کو خوبی سے پیش کرتی ہیں۔اردو ادب میں حریت فکر کی روایت کو پروان چڑھانے میں ممتاز شیریں کا کردار بہت اہمیت کا حامل ہے۔ وہ عجز، انکسار اور خلوص کا پیکر تھیں۔ان کی کتاب ''ظلمت نیم روز'' ہو یا ''منٹو نوری نہ ناری''، ہر جگہ ان کا اسلوبیاتی تنوع ایک نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔

انہوں نے قدرت اللہ شہاب، محمد حسن عسکری اور محمود ہاشمی کی تنقیدی اور تخلیقی نگارشات سے فیض حاصل

کیا تھااور اس کے اثرات ان کی زندگی اور فن پر مرتب ہوئے تھے۔ان کی تنقیدی بصیرت کا خوبصورت نمونہ قدرت اللہ شہاب کی تصنیف ''یا خدا'' اور محمود ہاشمی کی تصنیف ''کشمیر اداس ہے'' کے تجزیے ہیں۔ممتاز شیریں نے کرشن چندر، عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو کے افسانوی ادب پر خوب لکھا ہے بلکہ عصمت اور منٹو پر جنس کے حوالے سے کی جانے والی تنقید کو بلا جواز بتاتے ہوئے ان کے اسلوب کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی ہے اور اس کی پذیرائی کی۔موصوفہ جب بھی کسی شاعر و ادیب کے فن پارے کے اوپر لکھتی ہیں یا تنقید کرتے وقت غیر جانب داری سے کام لیتی ہیں۔حالانکہ ان کا خلوص اور اخلاق اعلیٰ پائے کا ہوتا تھا۔ان کا یہ سلوک ان کی شخصیت کا امتیازی وصف تھا۔ان کے اسلوب کی بے ساختگی اور بے تکلفی اپنی مثال آپ ہے۔زبان و بیان پر ان کی خلاقانہ دسترس اور اسلوب کی ندرت کے اعجاز سے انہوں نے ادب، فن اور زندگی کو نئے آفاق سے آشنا کیا ہے۔ایک مضمون میں ممتاز شیریں نے اپنے اسلوب اور تخلیقی محرکات کی صراحت کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''مجھ میں فن کار کی اَنا سہی، لیکن اتنا انکسار تو ضرور ہے کہ یہ محسوس کرسکوں کہ بڑے ادیبوں کے سامنے ہم کتنے چھوٹے ہیں اور فنکار کے ارتقاء اور تکمیل تک پہنچنے میں ہمیں ابھی تک کتنے اور مرحلے طے کرنے ہیں۔ میں اپنے بارے میں صرف یہ کہہ سکتی ہوں کہ پہلے درجے سے گزر کر میں نے دوسرے میں قدم رکھا ہے اور اپنی ذات میں نارسیسی انہماک پر بڑی حد تک قابو پا لیا ہے۔''(۹)

افسانوی ادب کی تنقید میں ممتاز شیریں کا بلند و باوقار لہجہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔گزشتہ دہائیوں میں لکھی جانے والی اردو تنقید پر غور وخوض کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو کی واحد خاتون نقاد ممتاز شیریں ہیں جنہوں نے اردو ادب کے تنقیدی سرمایہ کو اپنی عالمانہ تنقید کے گوہر نایاب سے اسے عالمی ادب میں مقام دلانے کی کوشش کی۔

ممتاز شیریں کی تبحر علمی کا اندازہ ان کی تخلیقی اور تنقیدی تصانیف سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔انہوں نے اپنی تخلیقی کامرانیوں سے اردو دنیا کو حیرت زدہ کر دیا، رنگ، خوشبو اور حسن وخوبی کے تمام استعارے ان کے توانا اور ابد آشنا اسلوب میں سمٹ آئے ہیں۔ان کی سبھی تحریریں قلب اور روح کی عمیق گہرائیوں میں اتر جانے والی اثر

آفرینی سے لبریز ہیں۔ ان کی تنقیدی تصانیف میں 'معیار (۱۹۶۳ء)' اور 'منٹو۔نوری نہ ناری' (۱۹۸۵ء) خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

ممتاز شیریں کی کتاب ''معیار'' کئی اعتبار سے اردو ناقدوں، ادیبوں اور طالب علموں کے درمیان قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ اس کے سبھی مضامین افسانوی ادب پر منحصر ہے۔ موصوفہ کو محمد حسن عسکری سے نہایت انسیت تھی اسی کے باعث انہوں نے کتاب کا پیش لفظ بھی محمد حسن عسکری سے ہی لکھوایا ہے۔ محمد حسن عسکری نے کتاب کی انفرادیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''تنقید کے یہ مختلف فرائض ادا کرتے ہوئے ممتاز شیریں نے پچھلے پندرہ سال کی ادبی سرگرمیوں میں نہایت نمایاں حصہ لیا ہے۔ ان کی تنقید ایک دور کے نمائندے کی حیثیت رکھتی ہے۔ لہٰذا اس دور کی ادبی تاریخ ان کے تنقیدی مضامین کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکے گی۔'' (۱۰)

''تکنیک کا تنوع ناول اور افسانے میں'' بھی ان کی عمدہ تنقیدی کتاب کا نمونہ ہے۔ تکنیک کا تنوع کے سلسلے میں ان کا خیال کچھ اس طرح ہے:

> ''تین دن اور ایک دن کے اول جدت طرازیاں ہیں۔ آج اتنی قلیل مدت میں ناول کا مواد مہیا کرنا اس لئے ممکن ہو گیا ہے کہ موجودہ دور کی زندگی واقعات سے معمور ہے۔ ہیمنگ وے کے تین دنوں کے ناول کو اتنا وسیع کینوس مبین کی خانہ جنگی نے دیا اور پھر آج تو وقت کے متعلق یہ نیا نظریہ بھی قائم ہو چکا ہے کہ ماضی کا اثر حال پر پڑتا ہے۔ یہ ماضی حال سے زیادہ اہم ہے۔ ہمارے شعور میں چھپا ہوا یہ ماضی ہمارے حال پر اثر انداز ہوتا ہے۔ جوئس نے 'یولی سس' اور پروست نے Remembrance of thing past میں حال کے کینوس میں ماضی کی ایسی تصویر کشی کی ہے اور ماضی کو حال میں اس طرح سمویا ہے کہ سب کچھ حال میں گزرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔'' (۱۱)

مذکورہ کتابوں کے علاوہ موصوفہ نے تراجم کے میدان میں بھی اپنا لوہا منوایا ہے۔ انہوں نے انگریزی ادب کے ناول نگار جان اسٹین بیگ کا ناول "The Pearl" کا اردو ترجمہ ''درشہوار'' کے نام سے کیا ہے اور امریکی افسانوں کے مجموعہ کا اردو ترجمہ ''پاپ کی زندگی'' کے نام سے کیا ہے۔

☆☆☆

اسلوب احمد انصاری

اسلوب احمد انصاری کا براہ راست تعلق انگریزی ادب سے تھا۔ان کی پیدائش ۱۹۲۵ء میں دہلی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے آکسفورڈ یونیورسٹی چلے گئے۔ وہاں سے انہوں نے آنر اسکول آف انگلش لینگویج اینڈ لٹریچر سے فارغ التحصیل ہوئے۔اس کے بعد ان کی تقرری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ انگریزی کے استاد کے طور پر ہوئی۔ وہ ایک مشہور انگریزی کے پروفیسر، نقاد، ماہر تعلیم،، ماہر غالبیات و اقبالیات کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔

یوں تو ان کی انگریزی اور اردو کتابوں کی فہرست بہت لمبی ہے مگر یہاں پر میں ان کی صرف ایک کتاب جس کا تعلق افسانوی ادب سے ہے۔جس کا تنقیدی جائزہ ناگزیر ہے۔کتاب ہذا کے جائزے سے قبل یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ جس دور میں اسلوب احمد انصاری پورے آب وتاب کے ساتھ تنقیدی اور تحقیقی کاموں میں منہمک تھے اس زمانے میں اردو میں فکشن کی تنقید کا رجحان کم تھا۔افسانوں کی تنقید کی طرف خیال بھی نہیں جاتا تھا۔اصل میں اردو فکشن کی تنقید اتنی ترقی یافتہ نہیں تھی جتنی کہ شاعری کی تنقید ترقی کر چکی تھی۔تاہم جن معدودے چند نمائندہ نقادوں کی تحریروں نے فکشن کی تنقید کو وقار واعتبار بخشا ہے ان میں ایک اہم اور ممتاز نام پروفیسر اسلوب احمد انصاری کا ہے۔

''اردو کے پندرہ ناول''اسلوب احمد انصاری کی عمدہ اردو فکشن تنقید کا نمونہ ہے۔انہوں نے عمومی (داستان ،افسانے ،تمثیل اور ڈراموں) فکشن تنقید کے بجائے اپنا اختصاص ناول کی تفہیم وتعبیر اور محاکے سے وابستہ کیا ہے۔افسانوں میں زندگی کی ایک قاش یا پہلو کو بیان کیا جاتا ہے جب کہ ناول میں افسانے کے

برعکس تجربات کی گونا گونی اور واقعات کی فراوانی اور بہتات ہوتی ہے۔اسی لیے ناول اپنی وسعت، ہمہ جہتی اور اسالیب کی رنگارنگی کے اعتبار سے تنقید کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ پروفیسر موصوف نے کتاب کی مندرجات میں ناول کی ترتیب میں زمانی اعتبار کو مطمحِ نظر رکھا ہے۔اس سے مختلف اسالیب کی نمائندگی کرنے والے ناولوں کی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ناول کے اس تنقیدی جائزے اور کارنامے سے اردو ناول نگاری کی موجودہ صورت حال پر بھی روشنی پڑتی ہے اور بہ آسانی اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے کہ الگ الگ دور میں یا پھر ایک ہی زمانے میں ناول کے متنوع اسالیب کا تجربہ منظر عام پر آ چکے ہیں۔

اسلوب احمد انصاری کی کتاب ''اردو کے پندرہ ناول'' اردو فکشن کی تنقید کی تاریخ میں اضافی سرمائے کی حیثیت رکھتی ہے۔اس کی اہمیت اور افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہے۔اس سے اردو میں ناول نگاری کی تاریخ کے اہم سنگ میل کا بھی پتہ چلتا ہے۔کتاب میں جن ناولوں کے تنقیدی جائزوں کو شامل کیا گیا ہے ان کی ترتیب مندرجہ ذیل ہے۔

''باغ و بہار (میر امن)، توبتہ النصوح (ڈپٹی نذیر احمد)، فردوس بریں (عبدالحلیم شرر)، امراؤ جان ادا (مرزا ہادی رسوا)، میدانِ عمل (پریم چند)، ایسی بلندی ایسی پستی (عزیز احمد)، آگ کا دریا (قرۃ العین حیدر)، اداس نسلیں (عبداللہ حسین)، آنگن (خدیجہ مستور)، آبلہ پا (رضیہ فصیح احمد)، ایوانِ غزل (جیلانی بانو)، راجہ گدھ (بانو قدسیہ)، کاروانِ وجود (نثار عزیز بٹ)، دشتِ سوس (جمیلہ ہاشمی) اور آگے سمندر ہے (انتظار حسین)۔

ناول ''امراؤ جان ادا'' ایک معاشرتی ناول ہے۔اس میں لکھنوی تہذیب و معاشرت کے مختلف طبقوں اور پہلوؤں کا نقشہ پیش ہوا ہے۔ بقول اسلوب احمد انصاری ''یہاں اودھی تہذیب کی ڈھلتی دھوپ جھر جھر کرتی نظر آتی ہے۔'' (ص ۷۱)۔اس ناول کا سب سے اہم وصف اصلیت وقطعیت ہے۔ جو کچھ بیان ہوا ہے وہ اصلیت سے اتنا قریب ہے کہ پڑھنے والا اس کہانی کو فرضی اور امراؤ جان ادا کو گڑھا ہوا کردار مان ہی نہیں سکتا ہے۔مرزا رسوا نے اس ناول کے ذریعے جاگیردارانہ نظام کا زوال و انتشار اور امراؤ جان ادا کے المیے کو بے نقاب کرنا چاہا ہے۔ناول کے اس رویے کو پروفیسر موصوف نے کچھ اس طرح سمجھنے کی کوشش کی ہے:

''اس پورے معاشرے میں عورت کی جو تذلیل اور تضحیک کی جو صورت ابھر کر

سامنے آئی ہے وہ خاصی شرمناک اور عبرت انگیز ہے۔ کیونکہ خانم کی نوچیوں میں سے جس کسی کو کوئی امیر وکبیر اور صاحب ثروت اپنی ہوس رانی کے لیے چنتا ہے، اس کے حق تصرف کو متعین کرنے کا پیمانہ صرف اس کی دولت ہے۔ اس طلسماتی حسن کو بنانے سنوارنے اور چار چاند لگانے میں تین عناصر بیش از بیش ممد ہوتے ہیں۔ اول لباس، زیور اور سنگھار پٹار کے جملہ ساز و سامان، دوسرے فن موسیقی اور رقص میں کمال اور اختصاصیت کا حصول (امراؤ جان ادا ان دونوں فنون میں طاق ہے)، اور تیسرے گفتگو اور نشست و برخاست کے آداب و اطوار میں سلیقہ، ہنر مندی اور دلآویزی و دل ربائی کی آمیزش۔ بہ الفاظ دیگر یہاں عشق و محبت ایک سراب کی مانند ہے اور عشوہ و ناز و ادا اس التباس کو قائم رکھنے کے موثر ترین ذرائع ہیں۔'' (۱۲)

اوپر کی عبارت سے واضح ہے کہ انتشار و اضمحلال زدہ لکھنوی تہذیب کے اندر عورت کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ اسے سونے کی مہروں کے بدلے جہاں اور جس وقت جی چاہے سودا کیا جا سکتا ہے۔ اور اس سے رئیس، نواب اور نواب زادے اپنی خواہشات کو آسودہ کرتے ہیں۔ اپنے جنسی تلذذ کی خاطر عورتوں کے نگار خانے میں آنے والے وہ سبھی مردوں کا واحد مقصد اور محبوب ترین مشغلہ عورتوں کے ریشمی حسن سے کھیلنے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ جس کی حقیقت محض سفلی محبت ہے۔ عورتیں اپنے نگار خانے میں دولت مند مردوں کی آمد کی خاطر وہ سارے ساز و سامان، بناؤ سنگھار اور ماحول کو رنگین و دلچسپ بنانے کے لیے موسیقی اور رقص کا التزام کرتی ہیں۔ اور اپنی مجبور زندگی کو زندہ رکھنے کے لیے ان سے دولت حاصل کرتی ہیں۔

جیلانی بانو کا پہلا ناول ''ایوانِ غزل'' بھی کئی اعتبار سے اہم ہے۔ جس کا تنقیدی جائزہ اسلوب احمد انصاری نے اپنے زاویہ نگاہ سے لینے کی کوشش کی ہے۔ اس ناول کا موضوع سقوط حیدرآباد کے تناظر میں تقسیم ہند کا المیہ ہے۔ ناول کی شروعات گاندھی جی کی تحریک سول نافرمانی سے ہوتا ہے اور ملک کے تقسیم کے حادثے پر ختم ہوتا

ہے۔اس کے بعد آئین کے وفاقی نظام کے مطابق سقوط حیدر آباد ہوتا ہے۔اس طرح ناول کا بڑا کینوس حیدر آباد کے ٹوٹتے بکھرتے جاگیردارانہ نظام اور تہذیبی اقدار کی داستان پر محیط ہے۔اس نظام کے نمائندہ احمد حسین اور واحد حسین ہیں۔

جیلانی بانو نے ناول کی پیش کش میں اپنے بھرپور تجربے اور مشاہدے کا استعمال مختلف مقامات پر ضرورت کے مطابق کیا ہے۔انھیں محاکات نگاری، جزئیات نگاری، خانگی زندگی کی پیش کش، ہندوستانی تہذیب و معاشرت اور ملک گیر سطح پر مختلف تحریکات سے آشنائی کا مظاہرہ، ہندو شاستروں، لوک کتھاؤں اور دیو مالائی اساطیر سے بھی انھیں دلچسپی ہے۔اس لئے وہ نثر میں ان سے متعلقہ عناصر کو بھی جگہ دیتی ہیں۔جس سے یہ ناول استعاراتی اسلوب کا حامل بن جاتا ہے اور ایک خاص قسم کی دل کشی، دل چسپی اور ہندوستانی خوشبو کا حامل بن جاتا ہے۔ان تمام خوبیوں کے باوجود ناقد موصوف نے ناول کے ایک اہم نکتے کی طرف انگشت نمائی کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> ''بالعموم ناول میں ہر واقعے، حادثے اور تجربے کے صرف ظاہری پہلو ہی سے سروکار رکھا گیا ہے اور اس کے باطن میں اتر کر اس کے متعلقات اور مضمرات کا جائزہ لینے کی کوشش نظر نہیں آتی۔یہ ناول ایک طرح کا خانگی المیہ ہے، یہاں بڑا اور بھرپور موضوع مرکز توجہ نہیں بنایا گیا، جو ناول کو ترفع بخش سکے، یا جسے اس کا پایانِ کار فریم ورک قرار دیا جا سکے، البتہ روزمرہ کے انسانی اعمال اور مسائل کے محرکات کو بڑی خوبی کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے۔یہاں ٹھوس اور تابناک محاکات کا استعمال بھی چابکدستی کے ساتھ کیا گیا ہے۔یہاں تفکر اور تخیل سے بڑھ کر مشاہدے کی اکائیوں کو پیش کرنے پر زور ملتا ہے۔یہ ناول صاف ستھرا ترشا ہوا اور بہت واضح ہے۔یہاں ابہام اور گنجلک پن نہیں ہے۔''(۱۳)

ناقد موصوف کا اشارہ درست اور قابل ستائش ہے۔اصل میں مصنفہ نے ایوان غزل میں تین دور کے حالات کو قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے۔تینوں دور کے وسیع کینوس کے بیان اور پیش کش میں سماجی اور طبقاتی

بصیرت کو نمایاں کرنے کے لیے ان کے کردار ظاہری پہلو تک ہی سروکار رکھتے ہیں ۔ ان کی سماجی، سیاسی اور معاشرتی بصیرت کو اجاگر کرنے میں ان کے کردار، ماحول، واقعے او ر واردات قلبی کے بیان کے لئے چھوٹے چھوٹے فقروں، جملوں، خطیبانہ لہجے اور شاعرانہ اسلوب کی مدد سے ناول میں روانی، تسلسل اور دلچسپی قائم کرتی ہیں۔

یہ درست ہے کہ ناول کے اندر گہرائی اور گیرائی کا فقدان کا احساس انہیں مقامات پر ہوتا ہے۔لیکن یہاں پر اس بات کا بھی خیال رکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنے ہی متعلقات اور مضمرات کا جائزہ لینے کی سعی میں ان کی شخصیت تہہ دار اور پہلو دار ضرور ہو جاتی مگر انہوں نے ایسا کرنے سے گریز کیا ہے کہ ان کا کردار اور ماحول اسی تہہ داری کو نمایاں کرنے میں محو ہو جائیں۔اس سے ایوانِ غزل کے دوسرے اور تیسرے موضوعات کی پیش کش مبہم اور معدوم ہو جاتی ۔ بہرصورت اسلوب احمد انصاری نے مذکورہ ناولوں کے تنقیدی جائزے میں جو انداز اختیار کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔وہ کسی بھی ناول کی تعریف میں غلو کا شکار نہیں ہوتے اور نہ ہی صرف عیوب کی نشاندہی کر کے تنقیص کرتے ہیں۔ بلکہ خوبیوں اور خامیوں کی طرف بلیغ اشارے کرتے ہیں اور یہی ان کا امتیاز بھی ہے۔

☆☆☆

دیویندراسر

دیویندراسر کا پورا نام دیوندرناتھ اسر تھا،مگر وہ پوری زندگی دیویندراسر کے نام سے جانے جاتے رہے۔ان کی پیدائش ۱۴اگست ۱۹۲۸ءکو پنجاب کے ایک مردم خیز علاقہ پنجا صاحب ضلع کیمبل پور،مغربی پنجاب میں ہوئی۔ان کا بچپن عام بچوں کی طرح خوشگوار نہیں گزرا۔ابھی آپ کمسن ہی تھے کہ والدہ کا انتقال ہو گیا اور آپ کی پرورش و پرداخت والد شری ناتھ اسر نے کی۔ جو کیمبل پور کے مشہور وکیل تھے۔تقسیم ملک کے بعد دیویندراسر کے والد مع اہل خانہ پنجاب سے ہجرت کر کے کانپور آ گئے اور وہیں مقیم ہو گئے اور کئی برسوں تک وہاں وکالت کرتے رہے۔

دیویندراسر کی ابتدائی تعلیم اوران کی پرورش میں ان کے والد نے ایمانداری اور دیانت داری کا ثبوت دیا کہ ماں کے نہیں رہنے کے باوجود انہوں نے اپنے بچے کی تعلیم میں کمی نہیں رکھی اور بی اے تک کی پڑھائی گورنمنٹ کالج، پنجاب یونیورسٹی، کیمبل پور سے مکمل کی اس کے بعد ایم اے (معاشیات) کی تعلیم ۱۹۴۹ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے کیا۔ بی ایڈ ۱۹۵۳ء دہلی یونیورسٹی اور کمیونی کیشن آرٹس کی ڈگری ۱۹۷۴ء کارنل یونیورسٹی، امریکہ سے حاصل کی۔

دیویندراسر کی ادبی زندگی کی ابتدا گورنمنٹ کالج کیمبل پور میں انٹر کی تعلیم کے دوران ہوئی جب کالج کی میگزین ''مشعل'' میں ان کے کئی مضامین شائع ہوئے جن میں منٹو ایک ادبی جراح، کچھ ٹیگور کے بارے میں انسانی زندگی کا معمار اعظم، ٹیپو سلطان اور تبصرے وغیرہ شامل ہیں۔ وہ ''مشعل'' کے اسٹوڈنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔ کالج کے اساتذہ ڈاکٹر غلام جیلانی برقؔ، ڈاکٹر محمد اجمل اور انگریزی کے استاد صدیق کلیم نے ان کی ادبی تربیت میں بڑا اہم رول ادا کیا جس سے ان کا رجحان اشتراکیت کی طرف ہو گیا اور وہ کمیونسٹ تحریک

سے وابستہ ہوگئے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی تحریک میں وہ بڑی سرگرمی سے حصہ لیتے رہے اور وہ انجمن ترقی پسند مصنفین الٰہ آباد اور کانپور کے سکریٹری اور اتر پردیش انجمن ترقی پسند مصنفین کی مجلس عاملہ کے رکن بھی رہے۔ دہلی میں کلچر فورم کا قیام ان کی کوششوں سے ہوا۔ وہ اس کے کنوینز تھے۔

کمیونسٹ پارٹی کی سرگرمیوں میں عملی حصہ لینے کی وجہ سے یکم جنوری ۱۹۵۰ء کو انہیں گرفتاری کے بعد کچھ مدت جیل میں بھی گزارنی پڑی۔ ۱۹۵۳ء میں انہوں نے اس تحریک کو خیر باد کہہ دیا۔

معاشیات میں ایم۔اے کرنے کے بعد اسر ۱۹۴۹ء میں کانپور کے روزنامہ ''امرت'' کے ادارےیے سے وابستہ ہوگئے۔ ماہنامہ ارتقا کانپور، ماہنامہ ''شعلہ'' کانپور، ماہنامہ ''راہی'' دہلی اور انگریزی کے کئی رسائل سے وابستہ رہے۔ ۱۹۵۰ء میں کانپور سے دہلی آ گئے اور پرائیوٹ کالجوں میں پڑھنا شروع کیا۔ ۲۶/اکتوبر ۱۹۵۹ء میں سرکاری ملازمت اختیار کی اور انگریزی میں شائع ہونے والے رسالوں کی ادارت کے فرائض انجام دینے لگے۔ ۳۱/اگست ۱۹۸۶ء کو ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔ اس وقت تک دیویندر اسر کی اردو، ہندی، انگریزی اور پنجابی میں پچاس سے زائد کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ ان کی چند اہم تنقیدی کتابیں مندرجہ ذیل ہیں:

(۱)	فکر و ادب	۱۹۵۸ء
(۲)	ادب اور نفسیات	۱۹۶۳ء
(۳)	ادب اور جدید ذہن	۱۹۶۸ء
(۴)	مستقبل کے روبرو	۱۹۸۶ء
(۵)	ادب کی آبرو	۱۹۹۶ء
(۶)	نئی صدی اور ادب	۲۰۰۰ء

دیویندر اسر نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں افسانے لکھنا کم کر دیا تھا اور زیادہ تر تنقیدی مضامین ہی لکھا کرتے تھے۔ اتناز و دنویس، کئی زبانوں کے ماہر اور جدید علم و ادب پر دسترس رکھنے والے اسر کا بچپن اور بڑھاپا دونوں ہی عسرت سے پر دردناک اور غمناک گزری۔ آخر کار ۶/نومبر ۲۰۱۲ء کو اپنے درد کو سمیٹتے ہوئے تلخی بھری زندگی کو دیویندر اسر نے خیر باد کہہ دیا۔

دیویندراسر صرف اردو زبان میں ہی نہیں لکھتے پڑھتے تھے بلکہ ان کا مطالعہ وسیع اور عمیق تھا۔ انہیں اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی اور پنجابی زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا۔ اردو سے زیادہ ان کی ہندی میں تخلیقی اور تنقیدی کتابیں موجود ہیں۔ تراجم کے میدان میں بھی وہ پیچھے نہیں رہے۔ ان کی انگریزی کتابوں میں Images of Kama (1983) اور Communication Mass Media and Development (1991) کی خوب پزیرائی ہوئی اوران کی کتابوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

دیویندراسر نئی نسل کے ذہین ناقدوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ نفسیات کے ساتھ وجودیت، سرریلزم اور دیگر جدید ترین ادبی اور فکری تحریکوں سے بھی گہری واقفیت رہی۔ انہوں نے جب نفسیات کا مطالعہ کیا تو اس کی افادیت ثابت کرنے یا افادیت گنوانے تک خود کو محدود نہیں رکھا بلکہ جدید ادب اور جدید ذہن کو نفسیات کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کی۔ دیویندراسر کے بارے میں پروفیسر عتیق اللہ نے اپنے مضمون متبادل تنقید اور دیویندراسر میں لکھتے ہیں:

> ''ان کی تخلیقی عمر بھی اب تقریباً چالیس برس کو پہنچ رہی ہے اور کم وبیش اتنی ہی عمر عزیز انہوں نے نقد ادب میں کھپائی ہے..........تنقید میں فکر و ادب، ادب اور نفسیات، ادب اور جدید ذہن اور مستقبل کے روبرو جیسی کتابیں بالترتیب منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان تمام کتابوں میں ایک ایسے تنقیدی ذہن سے ہمارا تعارف ہوتا ہے جو ہمیشہ کرید میں رہتا ہے۔ نئے نئے علمی اور فلسفیانہ نظریوں، تھیوریوں، تیزی سے بدلتی ہوئی قدروں اور تقاضوں سے جسے ہمیشہ سروکار رہا ہے۔ ان نظریات اور تھیوریز نے ان کے اندر تعصّبات قائم نہیں کئے اور نہ ہی مغرب کی اندھا دھند پیروی کو استحکام بخشا ہے کہ حقیقت اپنے انفراد میں جتنی پیچیدہ، متنوع ابعاد کی حامل، سیال اور تغیر پزیر ہوتی ہے اتنی ہی اس کی فہم بھی ایک مشکل ترعمل ہے۔ اس سے معاملت، اس کی تفہیم اور اس کی تعبیر کے طریقے بھی اتنے ہی مختلف اور متنوع ہیں۔'' (۱۴)

ان کے افسانوں کے بارے میں مشہور، نقاد ممتاز حسین کی رائے ہے کہ:

''دیویندر اسر اردو کے ان تھوڑے سے ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ہیں جو قومی زندگی کے اعلیٰ شعور کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کی کہانیاں مدھم سروں میں اُس زندگی کے گیت گاتی ہیں جو باوجود جبر و تشدد جھیلنے کے آہستہ آہستہ قوت پکڑتی جارہی ہے۔ وہ زندگی ہندوستان کے بے شمار مفلوک الحال انسانوں کی زندگی ہے۔ انہیں کہانی لکھنے کا ایک خاص سلیقہ ہے۔ تھوڑی سی بات کہہ کر ایک مخصوص ماحول پیدا کر لیتے ہیں، جو بے حد یقین آفریں ہوتا ہے۔ اُن کے کردار اسی یقین آفریں ماحول میں اپنے کردار اور عمل سے سماجی حقیقت کے سمجھنے میں مدد کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کہانی لکھنے کا یہی فن ہے اور یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ دیویندر صحیح راستے پر ہیں۔'' (۱۵)

دیویندر اسر کی کہانیوں کے بارے میں کرشن چندر کی رائے ملاحظہ کیجئے:

''دیویندر اسر نے باشعور طریقے سے ہمارے سماجی نظام زندگی کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کے افسانوی تجزیے میں حسن کاری سے بھی زیادہ اہم چیز ان کی یہی فلسفہ زندگی ہے جو انہوں نے اشتراکیت کے عالموں سے مستعار لیا ہے اور انہیں ہر لحظہ بدلتی ہوئی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر پرکھ کر دیکھا ہے۔ اس سے جو دلچسپ نتائج مرتب ہوتے ہیں، انہیں دیویندر اسر نے کمال صداقت سے اپنے افسانوں کے روپ میں پیش کیا ہے اور صداقت ہمیشہ مبارکباد کی مستحق ہوتی ہے۔'' (۱۶)

انھوں نے فکشن کی تنقید کے حوالے سے باضابطہ کوئی کتاب تحریر نہیں کی ہے لیکن اس سلسلے میں کئی اہم مضامین تحریر کیے ہیں جو ان کی کتابوں کی زینت بنے ہوئے ہیں اور بہت سے مضامین رسالوں میں شائع ہوئے جو آج تک کتابی صورت میں جمع نہیں کئے جا سکے۔ اس سلسلے کے اہم مضامین میں منٹو اور انسان کا تصور، آگ کا

دریا: تہذیب کا مرثیہ اور لہو کے پھول: ایک ناول ایک تاریخ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

دیوندر اسر ادب کو نفسیات اور فکری رجحانات کے ساتھ معاشرے کے تناظر میں جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔انھوں نے فکر و ادب میں ان تمام ادبی فکری اور فنی رجحانات کی تاریخ رقم کر دی جن سے ہمارے معاشرے میں عصری دانش وبینش کی ترویج وترقی ہوئی۔ان سب میں میں توسیع سے زیادہ تردید کا پہلو نمایاں ہے۔ البتہ اس تردید میں توسیع کا پہلو بھی مضمر ہیمگر ان کی توسیع کا اصل مخرج اقرار نہیں انکار رہے۔

وہ اس انکار کے مثبت رویے سے کہیں بھی انکاری نہیں ہیں۔مگر یہ مسئلہ عالم انسانیت کے لیے اس وقت ایک اہم مسئلہ بن جاتا ہے جب ان کا سارا تناظر ہی انکاروں کے اژدہام سے قائم ہو رہا ہو۔ایسی صورت میں ادیب یا تو ماضی کی سمت مراجعت کرنے میں عافیت محسوس کرتا ہے یا اپنے داخل کی غواصی اور ضمیر کی عکاسی اس کا منصب بن جاتی ہے۔مگر یہ ایک ایسا عنصر ہے جو صرف انھیں کا خاصہ ہے۔

انھوں نے اپنے مضمون منٹو اور انسان کا تصور میں منٹو کی حقیقت پسندی کی داد دی ہے۔لیکن ان کی بعض جنسی عکاسی کی تردید بھی کی ہے۔ان کا ماننا ہے کہ بہت سی حقیقتیں ایسی ہیں جن کو اصل صورت میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔اس لیے اس کے بیان کے لیے ایسا پیرایہ اظہار اپنانا چاہیے کہ نوعمر قارئین جنسی بے راہ روی کا شکار نہ ہوں۔ بہر صورت انھوں نے فکشن کی تنقید کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے وہ قابل تعریف ہے۔اگر چہ یہ کمیت میں کم ہے لیکن کیفیت میں کہیں زیادہ ہے۔

☆☆☆

سید محمد عقیل

اردو کے ممتاز ترقی پسند ادیب و ناقد سید محمد عقیل ضلع الٰہ آباد کے قصبہ کراری کے گاؤں عیدل پور کے ایک سادات گھرانے میں ۱۰/۱اکتوبر ۱۹۲۸ء کو پیدا ہوئے۔ جس ماحول میں انہوں نے آنکھ کھولی تھی چاروں طرف مرثیہ خوانی کا ماحول عربی، فارسی کا چلن اور شعر و ادب اوڑھنا بچھونا تھا۔ ابتدائی تعلیم ماڈرن گھوش کالج الٰہ آباد سے ہوئی۔ ۱۹۴۶ء میں جب ہائی اسکول پاس کیا تو پورے یوپی میں ان کی پوزیشن دسویں تھی کم و بیش یہی صورت انٹرمیڈیٹ میں بھی تھی۔

۱۹۵۰ء میں انگریزی، تاریخ اور اردو جیسے مضامین لے کر نہایت امتیاز کے ساتھ بی۔اے۔ کیا اور انگریزی ادب کی طرف مڑ گئے۔ اردو کے نامور ادیب اور استاد پروفیسر اعجاز حسین کا تجربہ اور مشاہدہ زبردست تھا۔ عقیل صاحب کی سنجیدگی اور علمی دلچسپی کو پرکھ لیا تھا چنانچہ فوراً ہی انہیں انگریزی سے اردو کی طرف لے آئے۔ ۱۹۵۲ء میں جن نمبروں سے عقیل صاحب نے ایم۔اے کیا تھا وہ ایک طرح سے ریکارڈ تھا ان کی اس غیر معمولی کامیابی نے اس سال ان کو شعبہ اردو سے بحیثیت استاد وابستہ کر دیا اور انہوں نے تدریس و تحقیق (برائے ڈی۔ فل) کا کام ایک ساتھ شروع کیا۔

ان دنوں شعبہ اردو میں تھرسڈے کلب ہوا کرتا تھا۔ ہر جمعرات کو کلاس کے بعد صدر شعبہ اردو کے کمرے میں ادبی نشستیں ہوا کرتی تھیں کوئی استاد یا ریسرچ اسکالر مقالہ پڑھتا اس پر با قاعدہ بحث ہوتی اور چائے پی جاتی۔ اس کلب میں فراقؔ گورکھپوری، پروفیسر رام کمار ورما، ڈاکٹر سرسوتی پرساد، ڈاکٹر سعید حسن اور دوسرے انگریزی ہندی کے اساتذہ شریک ہوتے۔ عقیل صاحب کی ابتدائی زندگی میں اس کلب کا بڑا رول ہے۔

۱۹۵۳ء میں جب عقیل صاحب کے مضامین کا پہلا مجموعہ ''نئی فکریں'' شائع ہوا تو اس کے زیادہ تر

مضامین تھرسڈے کلب میں پڑھے جا چکے تھے۔ ۱۹۵۵ء میں انہوں نے ''اردو مثنوی کا ارتقا (شمالی ہند میں)'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈی۔فل کی ڈگری حاصل کی۔

انہیں دنوں عمر کے تقاضے کے تحت عقیل صاحب کا شاعری اور افسانے سے بھی شغف رہا اور ''شبنم غبار'' کے نام سے باقاعدہ غزلیں اور نظمیں کہیں اور کچھ شائع بھی ہوئیں۔ ان دنوں ان کے اندر تخلیقی لہریں کس حد تک کارفرما تھیں اس کا ثبوت ان کے ''سامرسٹ مام'' کا ترجمہ شدہ ناول ''کیک اور شراب'' سے ملے گا جو ۱۹۵۶ء میں چھپا۔ یہ ناول آزاد اور تخلیقی ترجمہ کی عمدہ مثال ہے۔

۱۹۶۰ء میں ہندوستانی اکادمی الٰہ آباد کی فرمائش پر داغؔ کی شاعری کا انتخاب کیا اور جو مقدمہ لکھا اس کی دلکش و تخلیقی زبان لطیف و شوخ نے عقیل صاحب کی ایک دوسری ہی تصویر پیش کرتے ہیں۔ ۱۹۶۱ء میں جب اعجاز حسین صاحب ملازمت سے سبکدوش ہو گئے اور ان کی جگہ پروفیسر احتشام حسین نے لے لی تو عقیل صاحب کی علمی و ادبی زندگی میں ایک انقلاب آ گیا۔ ان کی رفاقت، صحبت اور ان کے ساتھ علم و ادب کے موضوعات پر گفتگو نے ان کو زبان و ادب کی تفہیم کا ایک نیا وژن عطا کیا، عالمی ادب کو تنقید سے متعارف کیا اور ان کے اندر ادب کے جاننے اور خاص طور پر تنقید کے بین الاقوامی معیار و افکار کو پڑھنے اور سمجھنے کا حوصلہ ملا۔ بس اسی مقام پر عقیل صاحب نے تنقید کا ایک نیا راستہ اپنایا۔

تاریخ کے مطالعے، انگریزی ادب سے غیر معمولی دلچسپی اور مغربی ادب و تنقید کی واقفیت نے عقیل صاحب کو ایک نیا وجدان و شعور عطا کیا اور وہ ہمہ تن تنقید میں ڈوب گئے اس کا سب سے بڑا ثبوت ان کی کتاب ''نئی علامت نگاری'' (۱۹۷۴ء) ہے جو ایک طرح سے جدید شاعری پر پہلی فکر انگیز اور بحث طلب کتاب ہے جس میں نہایت تحقیق و تفصیل کے ساتھ علامت نگاری پر بحث کی گئی ہے۔

۱۹۷۶ء میں ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''تنقید اور عصری آگہی'' پورے اہتمام سے چھپ کر منظر عام پر آیا۔ اس درمیان ان کی دلچسپی عملی تنقید سے ہوئی۔ ۱۹۸۰ء میں شائع شدہ کتاب ''سماجی تنقید اور تنقیدی عمل'' میں اسی طرح کی کوششیں کر کے عملی تنقید کا وہ کارواں جو کلیم الدین احمد کے بعد رُک سا گیا تھا۔ اسے اپنے انداز میں آگے بڑھایا۔ ۱۹۴۸ء میں انہوں نے اپنے استاد اعجاز حسین کی کتاب ''تاریخ ادب اردو'' کو ترمیم و اضافے کے

ساتھ پیش کیا تقریباً ۷۵ شعرا و مصنفین کے اضافے کئے۔ یہ کارنامہ بھی ان کا خاصا ہے جو ان کی ہمہ دانی و ہمہ جہتی کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ ۱۹۹۰ء میں عقیل صاحب یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش ضرور ہو گئے، لیکن ان کا علمی وادبی اور تنقیدی سفر جاری رہا۔ اس درمیان انہوں نے انگلینڈ، تاشقند، پاکستان کے سفر کئے اور عالمی سیمناروں میں شرکت کرتے ہوئے مقالات اور خطبات پیش کئے۔

ان کی ''جدید ناول کا فن'' (۱۹۹۸ء) اور ''اصول تنقید اور ردعمل'' (۲۰۰۴ء) جیسی اہم کتابوں نے ایک نئے سید محمد عقیل کو پیش کیا۔ جدید ناول کا فن سے قبل سید محمد عقیل عموماً شعریات کے ناقد کے طور پر تسلیم کئے جاتے تھے، لیکن اس کتاب نے نہ صرف اردو فکشن بلکہ مغربی فکشن پر ان کی گہری نظر نے ایک نئی تنقیدی بصیرت سے آگاہ کیا۔ اسی طرح اصول تنقید کے ابتدائی مضامین میں وہ عالمی صورت حال کے حوالے سے عالم کاری (Globalization) کے گہرے شعور کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں ورنہ اس سے قبل ان کا مطالعہ تاریخی وتہذیبی حوالوں سے ہی ہوا کرتا تھا۔ اس درمیان انہوں نے اپنی خودنوشت گودھول (۱۹۹۵ء) بھی لکھی اور شعری مجموعہ ''شام دھنک رنگ'' (۱۹۹۹ء) بھی شائع کیا۔

سید محمد عقیل کو زمانۂ نوعمری ہی سے شعر گوئی سے دلچسپی رہی ہے۔ اس تخلیقی جوہر کو دیکھتے ہوئے سید اعجاز حسین نے سید محمد عقیل کو ان کی طبعی سمت میں چلنے کا مشورہ دیا تھا۔ عقیل رضوی کی شعری تخلیقات یوں تو مشاعروں، نشستوں اور جریدوں کے توسط سے لوگوں تک پہنچتی رہیں، لیکن مجموعی صورت میں پہلی بار ''شام دھنک رنگ'' کی شکل میں ہی سامنے آئیں۔ اس مجموعے نے ترقی پسند فکر ونظر کی نمائندگی کرتے ہوئے ان کی شخصیت کے بعض پنہاں گوشوں کو سامنے لانے کا فرض انجام دیا۔

پروفیسر سید محمد عقیل نے اپنی پوری زندگی علمی، ادبی اور تحقیقی کاموں میں صرف کیا۔ تقریباً اسی (۸۰) سال کی زندگی پائی اور بالآخر ۸ جنوری ۲۰۲۰ء کو حقیقی دنیا کی طرف مراجعت کر گئے۔ ان کی تحریروں اور تقریروں میں ایک طرح کی انفرادیت کا احساس ہوتا ہے۔ آپ نے درجنوں کتابیں تصنیف کی ہیں اور آج بھی ان کتابوں سے طلبا اور اساتذہ کو علم کی روشنی مل رہی ہے۔ ان کی کتابوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ جو مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) نئی فکریں (۱۹۵۳ء)

(۲) مثنوی زہر عشق (۱۹۶۰ء)

(۳) مثنوی کا ارتقا (شمالی ہند پر) (۱۹۶۵ء)

(۴) نئی علامت نگاری (۱۹۷۴ء/۱۹۷۵ء)

(۵) تنقید اور عصری آگہی (۱۹۷۶ء)

(۶) سماجی تنقید اور تنقیدی اعمال (۱۹۸۰ء)

(۷) عمل انتقادیات (۱۹۹۰ء)

(۸) مرثیہ کی سماجیات (۱۹۹۳ء)

(۹) جدید ناول کا فن (۱۹۹۸ء)

(۱۰) ادیب وادب (۲۰۰۲ء)

(۱۱) اصول تنقید اور ردعمل (۲۰۰۴ء)

(۱۲) تعبیر خیال (۲۰۰۶ء)

(۱۳) اردو افسانہ کی تاریخ (۲۰۰۶ء)

(۱۴) ترقی پسند تنقید کی تنقیدی تاریخ (۲۰۰۹ء)

(۱۵) ورق تمام ہوا (تنقیدی مضامین) (۲۰۱۰ء)

پروفیسر سید محمد عقیل کی تصنیفات سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ موصوف کی شخصیت بے حد چیلینجنگ تھی اور اپنے کاموں میں مگن رہتے تھے۔ان کے انتقال پر ملال کے موقع سے پروفیسر علی احمد فاطمی نے روزنامہ انقلاب کے سنڈے ایڈیشن (۱۹ جنوری ۲۰۲۰ء) میں رقمطراز ہیں:

> ''عقیل صاحب کے اندر ایک ضد تھی جو اکثر چیلنج میں بدل جاتی۔ وہ چیلنج قبول کرنے کی غیر معمولی ہمت اور صلاحیت رکھتے تھے، لیکن مجھے یہ ڈر لگتا تھا کہ جوش وجذبہ میں وہ اپنے اصل مقصد سے بھٹک نہ جائیں۔ ایسا قمر رئیس کو بھی لگتا تھا جس کا اظہار وہ مجھ سے کیا کرتے تھے۔ عقیل صاحب سے نہیں کہہ

پاتے اس لئے کہ وہ ان کا بہت لحاظ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ احتشام حسین اور ممتاز حسین کے بعد محمد حسن اور سید محمد عقیل ہی ایسے بڑے نقاد ہیں جو ترقی پسند تنقید کے ستون ہیں جن سے ہماری تنقید کی آبرو ہے۔ اس کا اعتراف تو ترقی پسند مخالف بھی کرتے تھے اور جدید نقاد بھی۔'' (۱۷)

شمس الرحمٰن فاروقی ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''۱۹۶۳ء کا سال تھا۔ اس وقت تک عقیل صاحب کا ستارہ خوب چمک چکا تھا۔ لوگ انہیں اُبھرتے ہوئے نقاد اور اپنی رایوں پر سختی سے قائم رہنے والے اردو کے استاد کی حیثیت سے جان چکے تھے۔ ڈاکٹر اعجاز صاحب مرحوم کے جمعراتی کلب (Thursday Club) کی نشستوں میں میری حاضری اور عقیل صاحب سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔ میں نے دیکھا کہ انہیں انگریزی ادب اور زبان سے تقریباً اتنا ہی شغف تھا جتنا اردو زبان وادب سے تھا۔ احتشام صاحب مرحوم بھی اس وقت الٰہ آباد آچکے تھے۔ میں احتشام صاحب کے یہاں بھی اٹھنے بیٹھنے لگا۔ عقیل صاحب سے وہاں بھی ملنا ہوتا تھا۔ ان کا گھر بہت دور تھا، لیکن ایک آدھ بار میں ان کے یہاں بھی حاضر ہوا۔ ہر طرف کتابوں کا انبار دیکھ کر دل بہت متاثر ہوا کہ یہ شخص واقعی بہت پڑھنے والا ہے۔'' (۱۸)

احتشام حسین اور ممتاز حسین کے بعد سید محمد عقیل ان معدودے چند نقادوں اور دانشوروں میں سے ہیں جہاں علم اور حصول علم ان کا اوڑھنا بچھونا ہے اور جو ادب کو میکانکی انداز سے دیکھنے کے بجائے معروضی اور حقیقی انداز سے دیکھنے اور پرکھنے کے قائل ہیں۔ انہوں نے پرانے مکتب فکر سے بہت کچھ حاصل تو کیا، لیکن نئے ماحول اور نئے تناظر میں ترقی پسند تنقید کو کچھ اس طرح پیش کیا جو زیادہ قابل قبول ہوئی، لیکن اس کے باوجود ان کے کچھ تحفظات ہیں جن سے باہر نکل آنا آسان نہیں تاہم وہ نئے ادب اور نئے ادیبوں کو خلوص اور توجہ سے پڑھتے تھے اور اس میں نئی سماجی زندگی کے عناصر تلاش کرتے تھے تاریخ تہذیب اور معاشرے ان کے مطالعہ کے محبوب

موضوعات ہوتے۔ وہ اپنے تنقیدی رویے میں مارکسی اور سماجی طرز تنقید کے حامل ہیں۔ وہ صرف ادب کو ہی نہیں حرف ولفظ اور زبان و بیان کو بھی اسی تناظر میں دیکھتے و پرکھتے تھے۔نمونہ تنقید ملاحظہ ہو:

''الفاظ کی دنیا شاعر کے ذہن کی دنیا تو ہے، لیکن پختہ کار نقاد اسے صرف انفرادی فکر کی دنیا اس لئے تسلیم نہیں کرسکتا کہ اس کی ذہنی سوچ میں شاعر یا ادیب کی زندگی اور اس کے گردو پیش کے حالات بھی شامل ہوتے ہیں جونت نئے اور انوکھے جذبات ابھارتے ہیں۔ اس کی زندگی میں بنتے ہوئے نقش و نگار یا داخل ہوتی ہوئی محرومیاں بھی انوکھے جذبات کی محرک ہوتی ہیں تب جاکر الفاظ کے چہرے اُبھرتے ہیں۔ اگر الفاظ اپنے محسوسات کی ترجمانی اور دوسروں تک اپنے اظہار سے سلسلے نہ جوڑیں تو شاعری کیا معمولی گفتگو بھی ممکن نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ شاعر یا ادیب بیرونی دباؤ یا اندرونی اخفا کا لحاظ کرکے اسے دوسری طرف ڈھال دے۔ اس اندرونی اخفا میں بیرونی دباؤ بہت کچھ کام کرتا رہتا ہے کہ بہت سے محسوسات سماج اور سوسائٹی کے خیال اور ڈر سے حقیقی اظہار کی جرأت نہیں کر پاتے اور نامساعد حالات انہیں علامتوں کا سہارا لینے پر مجبور کرتے ہیں۔''(۱۹)

آج سید محمد عقیل ہمارے درمیان نہیں ہیں، مگر ان کی کتابیں علمی اور ادبی حلقوں میں مشعل راہ بنی ہوئی ہیں۔''اردو افسانے کی نئی تنقید'' اردو فکشن کی تنقید پر ان کی اہم کتاب ہے۔کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں افسانے کی تنقید اور اسلوب وغیرہ پر بڑی کارآمد باتیں قلم بند کی گئی ہیں۔ اسی حصے میں ایک طرح کا چیلنج بھی ہے اور اعتماد بھی۔ اس میں اردو کے نئے افسانوں کے جانچنے اور پرکھنے کی خاص کسوٹی مقرر کی گئی ہے۔ وقت، تاریخ اور بدلتے ہوئے سماج کی روشنی میں انھوں نے افسانوں کا جائزہ لینے کی کوشش ہے۔

دوسرے حصے میں انھوں نے اردو کے مشہور افسانہ نگاروں کی کہانیوں کا تجزیہ، اان کے اسلوب اور اپنے عملی تنقیدی نظریات سے ان کا محاسبہ و محاکمہ کیا ہے۔ ان میں وہ افسانہ نگار بھی شامل ہیں جن کو ہم اردو کے اہم

ترین افسانہ نگار قرار دے سکتے ہیں اور جو اردو افسانہ نگاری کے اہم ستون خیال کئے جاتے ہیں۔

ان کا ماننا ہے کہ آج کے دور کو فکشن کا دور کہا جاتا ہے لیکن کیا وجہ ہے کہ آج چوٹی کے افسانہ نگار پیدا نہیں ہو رہے ہیں۔آج کے دور میں پریم چند، کرشن چندر، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، راجندر سنگھ بیدی، منٹو اور انتظار حسین کے طرز پر تو بہت افسانے لکھے جا رہے ہیں لیکن اپنے ہلکے پن کی وجہ سے وہ پیچھے رہ گئے ہیں۔آج بھی جنسی موضوعات پر افسانے لکھے جا رہے ہیں لیکن جو مسائل عصمت اور منٹو نے اٹھائے اور جس انداز سے اٹھائے وہ آج کا افسانہ نگار پیش کرنے سے قاصر ہے۔بہر حال انھوں نے مواد، ہیئت اور اسلوب ہر اعتبار سے افسانوں کو جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ان کی زبان سادہ، صاف اور نکھری ہوئی ہے جس کی وجہ سے ایک عام قاری بھی اس سے محفوظ ہوتا ہے۔

☆☆☆

گوپی چند نارنگ

پروفیسر گوپی چند نارنگ اردو کے ان معدودے چند نقادوں میں سے ایک ہیں جو اپنے مخصوص تنقیدی نظریات وتصورات کی وجہ سے اردو تنقید میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ حالی اور شبلی کے بعد جن ناقدوں نے اردو تنقید کی آبیاری میں نمایاں رول ادا کیا ان میں ایک اہم نام پروفیسر گوپی چند نارنگ کا ہے۔ گوپی چند نارنگ کی پیدائش ۱۱رفروری ۱۹۳۱ء کوڈکی، بلوچستان، موجودہ پاکستان میں ہوئی۔ انہوں نے اردو میں ایم۔ اے اور ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری دہلی سے حاصل کی۔ نارنگ نے پنجاب یونیورسٹی سے فارسی زبان میں آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے انڈیانا یونیورسیٹی، امریکہ سے لسانیات، سمعیات اور تشکیلی گرامر پر خصوصی کورس کیا۔

ابتدا ہی سے پروفیسر گوپی چند نارنگ کا رجحان زبان، تہذیب اور ثقافت کے ادبی رشتوں کی طرف رہا ہے۔ ان کا ادبی سفر ۱۹۵۲ء سے اب تک جاری وساری ہے۔ انہوں نے اپنے مطالعے میں زبان، لسانیات، اسلوبیات اورادبی تھیوری پر خصوصی اہمیت دی۔ ان کے علاوہ مختلف تنقیدی نظریات وتصورات بالخصوص مابعد جدیدیت پر خاص توجہ دی۔ ان کے تنقیدی تصورات کو سمجھنے کے لئے ان کی نظری تنقید اور عملی تنقید کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کا نام محض کسی شخص کا نام نہیں ہے بلکہ پوری اردو تہذیب اور ایک مکمل ادارے کا نام ہے۔ ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں انہیں بے حد احترام اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ موصوف کی تقریباً ۷۰ کتابیں شائع ہوئی ہیں جن مین بارہ انگریزی میں، آٹھ ہندی میں اور پچاس سے زائد اردو میں ہیں۔ ان کی ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ کتاب، ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات کے تراجم اردو اور انگریزی کے علاوہ پنجابی، کشمیری، تمل، ملیالی، کنڑ، بنگالی، میتھلی، نیپالی، گجراتی اور مراٹھی زبانوں میں ہوئے۔ ویسے تو اردو میں ان کی تمام کتابیں خاص اہمیت کی حامل ہیں، مگر ان میں جن چند کتابوں نے غیر معمولی

مقبولیت حاصل کی، ان میں غالب معنی آفرینی جدلیاتی وضع شونیتا اور شعریات، ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات، اردو افسانہ روایت اور مسائل، انیس شناسی، اسلوبیات میر، سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ، انتظار حسین اوران کے افسانے، امیر خسرو کا ہندوی کلام، ادبی تنقید اور اسلوبایت، اردو مابعد جدیدیت پر مکالمہ، ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں، اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب، ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری، ترقی پسندی جدیدیت اور مابعد جدیدیت، جدیدیت کے بعد، اطلاقی تنقید: نئے تناظر، اردو زبان اور لسانیات، فکشن شعریات تشکیل وتنقید، کاغذ آتش زدہ، تپش نامہ، تمنا کا ذکر ناگزیر ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی حیثیت اردو ادب وتنقید میں ایک ''لیجنڈ'' کی ہے۔ ان کی تحریر وتقریر، فکر وفلسفہ اور نثر میں موتی پرونے کا ہنر دیکھا جاسکتا ہے۔ حیرانی ہوتی ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اردو ادب میں اس قدر بیش قیمت مقالات لکھے اور ان کی اتنی گراں مایہ کتابیں منظر عام پر آئیں جو اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں نارنگ صاحب نثر نگار اچھے ہیں یا مقرر اس کا فیصلہ مشکل ہے۔ علمی نثر کی وجہ سے تو وہ مخصوص شناخت رکھتے ہیں، لیکن قدرت کی طرف سے انہیں تقریر کا ملکہ بھی خوب خوب ملا ہے ان کی تقریر میں اردو زبان کی شیرینی وخوبصورتی، روانی اور تسلسل کے ساتھ ساتھ علمی وقار، سنجیدگی اور متانت بھی پائی جاتی ہے۔ وہ بہترین مقرر، خطیب اور انشا پرداز ہیں۔ ان کے یہاں بے پناہ لگن، علمی وادبی جستجو اور ذہانت وذکاوت ملتی ہے۔ تنقید ہو یا تحقیق، فکشن ہو یا شاعری، مشرقی ادب ہو یا مغربی ادب، زبان کا مسئلہ ہو یا تعلیم وتدریس کے مسائل، تہذیب وثقافت کی گفتگو ہو یا ادبی تھیوری کے نکات، لسانیات کی الجھنیں یا قدیم شعر وادب کے پرکھنے کا معاملہ، پروفیسر نارنگ کا کوئی ثانی نہیں۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ اپنی علمی صلاحیتوں، تحقیقی وتنقیدی کارناموں، بصیرت وبصارت، فکر وفلسفے، مشرق ومغرب کے ادبیات پر گہری نظر رکھنے کی وجہ سے پوری دنیا میں مشہور ومقبول ہیں۔ اردو زبان وادب کی جیسی بے لوث اور پرخلوص خدمت انہوں نے کی ہے اس کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ یہ بات بے حد وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ہندوستان ہو یا پاکستان، امریکا ہو یا برطانیہ، کناڈا ہو یا جرمن، چیکوسلوکیہ یا چین، دوبئ ہو یا قطر، انہوں نے ان تمام ممالک کا سفر کیا ہے، جہاں جہاں اردو ہے وہاں وہاں نارنگ ہیں۔ ایک بار کسی صاحب نے ان سے ازراہِ مذاق دریافت کیا کہ وہ کون سا ایسا خطہ ہے، جہاں آپ تشریف نہیں لے گئے۔ فرمایا، چاند پر نہیں گیا۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کے یہاں تنظیمی صلاحیت بھی غضب کی تھی۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سربراہ رہے ہوں یا دہلی یونیورسیٹی کے سربراہ، انہوں نے اردو اکادمی کے وائس چیرمین کی ذمہ داری سنبھالی ہو یا قومی کونسل برائے فروغ اردو کے وائس چیرمین کی یا پھر ساہتیہ اکادمی کے نائب صدر اور پھر صدر کی، پروفیسر نارنگ نے ہر ادارے میں چار چاند لگا دیا اور اس ادارے کی ایسی خدمت کی کہ وہ ادارے بلندیوں ک جا پہنچے اور اداروں کے علمی و ادبی کارناموں کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ پروفیسر گوپی چند نارنگ جیسی عبقری اور عظیم شخصیت کی اس ادارے سے ۱۹۷۴ء سے ۱۹۸۴ء تک گہری وابستگی رہی۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ شعبہ اردو میں پروفیسر، صدر شعبہ، ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لینگویجیز، ڈائرکٹر اردو خط و کتابت کورس اور قائم مقام وائس چانسلر جیسے مختلف اہم عہدوں پر فائز رہے۔ پروفیسر نارنگ نے بحیثیت صدر شعبہ اردو اس شعبے کو جس عظمت اور بلندی سے سرفراز کیا، تاریخ اس اس کی گواہ ہے۔ انہوں نے شعبہ اردو کے زیر اہتمام، جدید اردو ادب میں زبان کا تخلیقی استعمال سمینار، انیس صدی سمینار، اقبال صدی سمینار، لغت نویسی کے مسائل سمینار، ڈاکٹر عابد حسین کی ادبی و قومی خدمات سمینار، ہندو پاک اردو افسانہ سمینار اور ہندو پاک میر تقی میر سمینار جیسے غیر معمولی اور مہتم بالشان سمیناروں کا انعقاد کیا۔ ان سمیناروں میں ہندو پاک کے ممتاز فنکاروں، ادیبوں، ناقدوں کے علاوہ بڑی تعداد میں مرکزی وزرا، حکومت ہند کے اعلیٰ افسران اور شائقین علم و ادب نے شرکت کی۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ ہمارے دور کے بلند پایہ نقاد اور ماہر لسانیات ہیں۔ ان کے مضامین سے اردو تنقید میں بیش قیمت اضافہ ہوا ہے اور ان کی تحریروں نے ہماری تنقید کو نئی جہتوں سے روشناس کیا ہے۔ پروفیسر نارنگ نے اپنے کلاسیکی سرمایے کے ساتھ ساتھ جدید ادب کا بھی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ گویا اردو ادب کا پورا ذخیرہ ان کے پیش نظر رہا ہے کیونکہ وہ ادب کو ادب کی نظر سے دیکھتے ہیں، اسے قدیم و جدید اور ترقی پسند و غیر ترقی پسند کے دائروں میں قید کرنے کے قائل نہیں۔ وہ ادب کو ایک اکائی مان کر پورے خلوص کے ساتھ اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کا یہ دعوا بے بنیاد نہیں کہ ”میں نے ادب کی روایت کا مطالعہ نہایت سنجیدگی اور محنت کے ساتھ کیا ہے اور آج بھی میری کوشش یہی رہتی ہے کہ میں سب سے زیادہ توجہ مطالعے پر صرف کروں۔“ چنانچہ وہ گہرے اور وسیع

مطالعے اور ضروری غور وفکر کے بغیر قلم نہیں اٹھاتے ، بے دلیل کوئی دعوا نہیں کرتے ۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان کا مطالعہ صرف اردو ادب تک محدود نہیں بلکہ بعض دوسری زبانوں کا ادب بھی ان کے پیش نظر رہتا ہے۔

انھوں نے فکشن کی تنقید پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔فکشن میں نظریے کی اہمیت سے پروفیسر نارنگ کو انکار نہیں ،لیکن ادیب کا کسی گروہ سے وابستہ ہونا ان کے نزدیک ادب کے لئے مہلک ہے۔ وہ ادیب کی مکمل آزادی کے حامی ہیں اور اس کی انفرادیت کو احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔انہیں اعتراف ہے کہ ترقی پسند تحریک اردو ادب کی ایک اہم تحریک تھی اور اس نے ہمارے ادب میں بیش بہا اضافے کئے ،مگر اس کی نعرہ بازی اور لیبل سازی نے ادب کو ادب نہیں رہنے دیا۔ جب یہ تحریک ادیب کی آزادی میں سدراہ ہوئی اور اس کی سخت گیری بڑھتی ہی چلی گئی تو آخر کار ادیبوں نے آزادی کا پرچم بلند کر دیا۔اس طرح جدیدیت کی تحریک کا آغاز ہوا۔جن نقادوں نے اس تحریک کو فلسفیانہ اساس فراہم کی ان میں ایک اہم نام پروفیسر گوپی چند نارنگ کا ہے۔

پروفیسر نارنگ چونکہ سنجیدہ اور ذی علم نقاد ہیں اس لئے وہ فن کاروں اور فن پاروں کو پرکھنے کے لئے تنقید کے مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں اور حسب موقع مختلف راستوں سے فن اور فن کار تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن ان کا خیال ہے کہ ''ادبی تنقید میں جو مدد اسلوبیات سے مل سکتی ہے، کسی دوسرے ضابطہ علم سے نہیں مل سکتی۔'' دراصل یہ بغاوت ہے اس رجحان کے خلاف جو موجودہ صدی کے نصف اول میں تنقید پر غالب رہا یعنی فن اور ہو سکے تو فن کار کو بھی چھوڑ کر اِدھر اُدھر کے تمام مسائل وموضوعات پر گفتگو۔اس کے برعکس اسلوبیاتی تنقید اپنی توجہ ادب پارے پر مرکوز رکھتی ہے اور اس کی صوتیاتی ،صرفی اور معنیاتی پرتوں کو کھولتی اور ان کا تجزیہ کرتی ہے جس سے شعر وادب کی تفہیم کا راستہ ہموار ہوتا ہے اور بہت سے ایسے سوالوں کے جواب مل جاتے ہیں جن کے لئے تنقید برسوں سے سرگرداں رہی ہے۔ یہی طریق تنقید ہے جس سے قطعی طور پر یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ شعر وادب میں حسن پیدا ہوا تو وہ کس طرح اور وہ دل آویزی سے محروم رہا تو آخر کس لئے۔

بعض ناقدین کو گلہ ہے کہ پروفیسر نارنگ جتنا لکھ سکتے تھے،انہوں نے اس سے بہت کم لکھا ہے۔تاہم ان کی تنقید کا دائرہ بہت وسیع ہے۔افسانوی ادب سے ڈاکٹر نارنگ کو خاص شغف ہے۔ پریم چند، بیدی، انتظار حسین اور سریندر پرکاش پر ان کے مضامین کا مطالعہ ان اہم افسانہ نگاروں کے فن کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے۔اس

سے بھی ضروری ہے ان کے مضمون ''اردو میں تجریدی و علامتی افسانہ'' کا مطالعہ کیا جائے۔ میں ان کی معروف تصنیف ''اردو افسانہ روایت اور مسائل''اور''فکشن شعریات: تشکیل وتنقید'' کا مختصر جائزہ لینے کی کوشش کرتی ہوں۔

نجی گفتگو ہو، تقریر ہو یا تحریر ڈاکٹر نارنگ کی نثر سامع یا قاری کے دل کا دامن کھینچے بغیر نہیں رہتی۔ ان کی زبان میں سادگی کے ساتھ بے پناہ دل آویزی و دلکشی ہے۔ کتنا ہی مشکل موضوع اور کیسا ہی پیچیدہ مسئلہ کیوں نہ ہو وہ اپنے واضح اور روشن انداز بیان سے اسے سہل اور دل نشیں بنا دیتے ہیں۔ گہری تنقیدی بصیرت، وسیع مطالعہ، ادب کے تازہ ترین رجحانات سے مکمل آگاہی، متعلقہ علوم پر دسترس اور زبان پر کامل قدرت وہ اوصاف ہیں جنہوں نے پروفیسر نارنگ کی تنقید کو وقار عطا کیا ہے۔

''اردو افسانہ: روایت اور مسائل'' ان کی نمائندہ کتابوں میں سے ایک ہے۔ اصل میں یہ کتاب جامعہ ملیہ اسلامیہ میں منعقد سہ روزہ ہندو پاک سمینار میں پڑھے گئے مقالات کو ایک جگہ جمع کر کے کتابی صورت دی گئی ہے۔ یہ کتاب تقریباً ۷۵۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر ہندوستان اور پاکستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ اس کا اندازہ ہم اس لحاظ سے بھی لگا سکتے ہیں کہ ۱۹۸۰ء کے بعد ۲۰۱۶ء تک اس کے چھ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس سمینار کے بارے میں وہ خود ہی کتاب کے ابتدائیہ میں لکھتے ہیں:

> ''اس تاریخی اور یادگار ہندو پاک اردو افسانہ سیمینار کے جو جامعیہ ملیہ اسلامیہ میں ۲۹/۳۰ اور ۳۱ مارچ ۱۹۸۰ء کو منعقد ہوا۔ اس میں ہندوستان اور پاکستان کے ممتاز دانشور، ادیب اور افسانہ نگار پہلی بار کسی یونیورسٹی سمینار میں شریک ہوئے اور سب نے مل کر ایک نثری صنف کے مسائل پر غور کیا۔ کہنے کو تو یہ ہندو پاک سمینار تھا، لیکن واقعتاً اس کی حیثیت بین الاقوامی تھی کیونکہ اس میں ہندوستان اور پاکستان کے علاوہ روس، امریکہ، سعودی عرب، برطانیہ اور ناروے سے بھی ادیبوں اور تخلیقی فن کاروں نے شرکت فرمائی۔'' (۲۰)

''فکشن شعریات: تشکیل وتنقید'' بھی گوپی چند نارنگ کی تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کے

سبھی مضامین افسانوی نثر سے تعلق رکھتے ہیں۔ان کے مضامین موضوع سے انصاف کرنے کی غرض سے ادیب اوراس کےفن پارے کےایک ایک جز پرمختلف زاویں، مذہبی،سماجی،ثقافتی اوراساطیری تصورات کےتحت غوروفکر کرتے ہیں پھر لکھتے ہیں۔اس طرح فن پارے کی تہہ تک جاکرس کے پرت در پرت کوواکرتے ہیں۔اس کتاب پرڈاکٹر شافع قدوائی نے ایک مبسوط مقدمہ لکھ کر گوپی چند نارنگ کی تحقیقی اورتنقیدی خدمات کااعتراف کیا ہے۔ اس کے مضامین کوقریب سے سمجھنے کے لئے مقدمہ کو پڑھنا از حد ضروری ہےاس طرح کتاب کا مقدمہ اوراس کے مضامین ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔گوپی چند نارنگ کے بارے میں شائع قدوائی یوں رقم طراز ہیں:

> ’’صنف افسانہ ابتداء ہی سے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تنقیدی کاوشوں کامحور رہی ہےاورانہوں نے افسانہ کے علاوہ نظم،مثنوی اودیگر اصناف سخن میں بھی افسانہ کے Karnal Point یعنی Story Line کی معنویت پر دقت نظر کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔علاوہ ازیں انہوں نے Legend اور Myth کی بازتخلیق،متن کی نوتشکیل اوراس کی معنویت پر بھی سوال اٹھائے ہیں۔راجندر سنگھ بیدی سے متعلق ان کے تفصیلی بلکہ Seminal مضمون ’بیدی کےفن کی استعاراتی اوراساطیری جڑیں‘ بر صغیر میں بیدی فہمی کی ایک نئی روایات کا آغاز کیا۔ یہ مضمون آرکی ٹائپل اوراسطوری تنقید کےنظری اوراطلاقی امکانات کوپہلی بار گہری تنقیدی بصیرت کے ساتھ بروئے کارلاتا ہے۔یہی سبب ہے کہ وارث علوی اسے اردو فکشن تنقید کی سب سے بہتر اور خیال انگیز مثال قرار دیتے ہیں۔‘‘(۲۱)

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی اعلیٰ علمی وادبی خدمات کےاعتراف میں انہیں حکومت ہند کی جانب سے’’پدم شری‘‘اور’’پدم بھوشن‘‘ کےاعزاز سےنوازا گیا تو حکومت پاکستان نے انہیں اپنے سے بڑے اعزاز ستارۂ امتیاز

سے نوازا۔ پروفیسر نارنگ ایسے ادیب ہیں جنہیں دہلی یونیورسیٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نے پروفیسر ایمریٹس بنانے پر فخر کا اظہار کیا تو علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی، سینٹرل یونیورسیٹی آف حیدرآباد اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسیٹی نے انہیں ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری Honoris Causa سے نوازا۔

ان کا ماننا ہے کہ فکشن اور شاعری میں لسانی عمل کے اعتبار سے بہت زیادہ مغائرت نہیں ہے۔اس لحاظ سے وہ جدیدیت کے ان دعویداروں سے ذہنی سطح پر بہت قریب ہو جاتے ہیں جو صنفی حدبندیوں اور ان کے علیحدہ علیحدہ تقاضوں کے قائل نہیں ہیں۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ داستان، ناول اور افسانے میں استعارہ اور پیکر آفرینی کی بہت زیادہ اہمیت نہیں ہے جب کہ شاعری میں اس کو وہ خاص اہمیت دیتے ہیں۔انھوں نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ فکشن میں کردار استعارے کا بدل نہیں ہو سکتے اور نہ ہی واقعات ومناظر کو متحرک پیکروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔تاہم یہ تحریک ہمارے حواس کو متحرک رکھنے کے لیے لازم وضروری بھی خیال کیا جاتا ہے۔

ایک خلاق اور جہاں دیدی فکشن نگار واقعے یا حادثے کو اس انداز میں پیش کرتا ہیکہ وہ کردار زندہ وتابندہ ہجاتے ہیں اور اپنے سماج ومعاشرے کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے فکشن پاروں کو مواد کے ساتھ ساتھ ہیئت کے اعتبار سے بھی جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب وکامران بھی ہوئے۔ چوں کہ وہ ایک کامیاب تھیوریسٹ اور ماہر لسانیات ہیں اس لیے ہیئت بھی ہمیشہ ان کی تنقید میں سایے کی طرح ساتھ ساتھ چلتی ہے۔انھوں نے فکشن پاروں کے لیے جو اصول ونظریات مقرر کیے ہیں وہ آج بھی ہمارے لیے مشعل راہ ہیں اور آئندہ بھی ہم کو ان سے روشنی ملتی رہے گی۔

☆☆☆

قمر رئیس

قمر رئیس ترقی پسند ادیبوں میں ایک نمایاں مقام رکھتے تھے۔ ان کی پیدائش ۱۲ جولائی ۱۹۳۲ء میں شاہجہاں پور ضلع اتر پردیش ہندوستان میں ہوئی۔ قمر رئیس کی پرورش و پرداخت بڑے ناز و نعم سے ہوئی کیونکہ ان سے قبل ان کے گھر میں کئی شیر خوار بچوں کی موت ہو چکی تھی۔ ان کے والد مولوی عبدالعلی خاں بے حد ذہین، محنتی و بارعب شخصیت کے مالک تھے اور پیشے سے وکیل تھے۔ افراد خانہ روشن خیال اور ذہین تھے۔ اسی لئے ان کے گھر کا ماحول علمی اور ادبی تھا۔

ان کی ابتدائی علیم گھر پر ہی ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۴۸ء میں میٹرک، ۱۹۵۰ء میں گاندھی فیض عام کالج سے انٹرمیڈیٹ، ۱۹۵۲ء میں آگرہ یونیورسٹی سے بی۔ اے، ۱۹۵۴ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی اور والد کی عین خواہش کے مطابق خاندانی پیشہ وکالت شروع کر دیا، لیکن ذہنی مناسبت نہ ہونے اور پیشہ میں گراوٹ آنے کی وجہ سے اسے ترک کر دیا۔ ۱۹۵۵ء میں ناگپور یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کا امتحان اول درجے سے پاس کیا اور شہرہ آفاق ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی کی نگرانی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹۵۹ء میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

۱۹۵۹ء میں ہی قمر رئیس کو دہلی یونیورسٹی میں لکچرر شپ کی ملازمت مل گئی۔ ۱۹۶۸ء میں ریڈر اور ۱۹۸۴ء میں پروفیسر کے عہدے سے سرفراز ہوئے۔ وہ ۳۸ برسوں تک شعبہ اردو سے وابستہ رہے۔ لمبے عرصے تک درس و تدریس سے وابستگی ہونے سے طلبہ سے سابقہ رہا۔ ایم۔ فل، پی۔ ایچ۔ ڈی کے اسکالروں کی تربیت و نگرانی بھی کی۔ خود ان کی علمی و ادبی خدمات پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ قلم کی جولانی اور تخلیقی دانشوری کی بدولت کئی مناصب پر فائز ہوئے۔ بے شمار ایوارڈ اور کئی اعزازی ڈگریوں سے سرفراز کیے گئے۔

قمر رئیس ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ زندہ دل، تعقل دوست اور صاف گو انسان تھے۔ اس کی مثال خود ان کا قلمی نام ہے جسے انہوں نے اپنی پہلی محبت اور شریک حیات کے ناموں سے اخذ کیا ہے۔ یہ اپنے دوستوں کے دوست، طلبا کے شفیق استاد، بیوی سے بے حد محبت کرنے والے خاوند، بیٹی کے شفیق باپ، اپنے رفقائے کار کے معاون و رفیق اور ان سب سے بڑھ کر بنی نوع انسان کے لئے جذبہ اخلاص، دردمندی و ہمدردی رکھنے کی وجہ سے مشہور و معروف ہوئے۔ ان کے حلقۂ اساتذہ میں بڑی بڑی شخصیات شامل ہیں۔

قمر رئیس کا شمار باوقار ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ان کی تحریروں میں اعتدال و توازن کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ شاید اسے مبالغہ کہا جائے، لیکن یہ سچ ہے کہ ان کی شخصیت بغض و عناد کے جذبات سے پاک ہے اور ذاتی پسند، ناپسند سے بلند ہو کر فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ اپنے مخالفین کی باتوں کو بھی یکلخت رد نہیں کرتے اور نا ہی اس کا جواب تلخی سے دیتے تھے بلکہ اپنی باتوں کو صراحت کے ساتھ مدلل انداز میں پیش کرتے۔ وہ ایک متوازن، سلجھے ہوئے ترقی پسند ادیب تھے۔ پریم چند اور فکشن تنقید ان کے خصوصی موضوعات رہے ہیں۔ انہوں نے ازبکستان کے ادب اور تہذیبی تاریخ کو اردو میں متعارف کرایا۔ اس کے علاوہ قمر رئیس نے نیاز حیدر جیسے خلاق شاعر کے کلام کا انتخاب کر کے مقدمے کے ساتھ اشاعت کا اہتمام بھی کیا۔

ترجمے کے فن اور روایت پر ایسی کتاب ترتیب دی کہ اساسی متن کی حیثیت رکھتی ہے۔ ترقی پسند تحریک کے گولڈن جوبلی کے موقع پر انہوں نے ''ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر'' کے عنوان سے ایک ضخیم کتاب ترتیب دی جو دستاویزی حیثیت رکھتی ہے۔ علمی و ادبی خدمات کے علاوہ قمر رئیس کو ترقی پسند تحریک کے سربراہوں میں امتیاز حاصل ہے۔

قمر رئیس انٹرمیڈیٹ کے زمانے سے ہی اس تحریک میں دلچسپی لینے لگے تھے، لیکن باقاعدہ طور پر ۱۹۷۳ء میں اس انجمن کی قیادت سنبھالی۔ اس موقع پر ''ادب اور عصری آگہی'' کے موضوع پر انہوں نے ایک کل ہند سمینار کیا۔ سمینار کی کامیابی میں بلاشبہ قمر رئیس کا ہی ہاتھ رہا۔ سجاد ظہیر اس سمینار کے حوالے سے فرماتے ہیں:

''ان تمام فیصلوں سے زیادہ کمیٹی کے کنوینر ڈاکٹر قمر رئیس کی وہ آخری اپیل ہے...... کہ ہم سب سے زیادہ اور بہتر لکھنے کی کوشش کریں۔ یہ ایک ایسی اپیل

تھی جس نے نہ صرف سب کے دلوں پر اثر کیا اور اس کے خاطر خواہ نتائج
برآمد ہوئے بلکہ قمر رئیس کا یہ نظریہ سب پر واضح ہو گیا اور انہوں نے جو انتھک
محنت کی اس کے بڑے دور رس نتائج سامنے آئیں گے۔''(۲۲)

تحریک میں ایک نئی جان پڑ گئی اور اس طرح یہ تنظیم نئے سرے سے سرگرم ہو گئی۔ انہوں نے بے شمار ر جلسے اور سمینار منعقد کئے۔ مثلاً ۱۹۷۶ء میں ترقی پسند تحریک کے قیام کا چالیس سالہ جشن، ۱۹۸۰ء میں پریم چند کا صد سالہ جشن اور کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کی ۶۰ ویں کانفرنس (۱۰ مارچ ۱۹۹۵ء حیدر آباد) وغیرہ۔ موخر الذکر کانفرنس میں قمر رئیس نے یادگار رپورٹ پیش کی اور اس کے آخری حصے میں بہت نازک مسئلہ یہ اٹھایا:

''آج کے نوجوان ادیب اکثر یہ سوال کرتے ہیں کہ عہد حاضر میں ترقی پسندی
کی ترجیحات کیا ہیں؟ کیا کسی خاص نظریہ سے غیر مشروط وفاداری کا نام ترقی
پسندی ہے؟ ساتھ ہی اس کی وضاحت بھی کر دی کہ کوئی بھی نظریہ اور اس کا
اطلاق ترقی پسندانہ ہو گا جو انسان کی آزادی، آسودگی اور فلاح کا ضامن ہو،
جو اس کو سدہا سال کے استحصال، ظلم، احتیاج، زبردستی اور نابرابری کی اذیت
سے نجات بخشنے کے امکانات رکھتا ہو ......اشتراکی نظریہ سب سے بڑھ کر
انسان دوستی، عوام دوستی اور دردمندی کا حامل ہے۔''(۲۳)

غرض یہ کہ ۱۹۵۰ء میں انہوں نے جس نظریے کو اپنایا اس پر آج زمانے کے نامساعد حالات اور سخت اختلاف رائے کے باوجود مضبوطی سے کاربند ہیں اور اس تحریک کی کامیابی سے قیادت کر رہے ہیں۔ بقول احمد جمال پاشا:

''انجمن ترقی پسند مصنفین' کے تن مردہ میں قمر رئیس نئی روح پھونک چکے ہیں۔
یہ اپنا تاریخی کارنامہ انجام دے کر اب خود تاریخ بن چکے ہیں۔''(۲۴)

طالب علمی کے زمانے میں قمر رئیس علی گڑھ میگزین کے اڈیٹر رہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ماہنامہ ''ادیب''، علی گڑھ ماہنامہ ''عصری آگہی''، سہ ماہی ''آب وگل'' دہلی جیسے رجحان ساز ادبی مجلّے جاری کئے اور سہ

ماہی ''نیا سفر'' کے اڈیٹر کی خدمات بھی انجام دیں۔

قمر رئیس نے بے شمار علمی و ادبی کارنامے انجام دیے ہیں اور انعامات و اکرام سے نوازے گئے۔ دو درجن کتابوں کے مصنف ہوئے۔ انہوں نے ترتیب و تدوین اور تراجم بھی کئے ہیں۔ بے شمار کتابوں کے پیش لفظ اور مقدمے بھی انہوں نے لکھے۔ صحافت اور شاعری سے بھی اُن کی دلچسپی رہی۔ ان کی ادبی خدمات کے پیش نظر مختلف ایوارڈ سے نوازے گئے۔ انہیں مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ ۱۹۹۴ء، اتر پردیش اردو اکیڈمی کا مولانا ابوالکلام ایوارڈ ۱۹۸۱ء، بہار اردو اکادمی ایوارڈ ۱۹۸۱ء، ہندی اردو ادب ایوارڈ ۱۹۸۴ء، نیشنل لکچرر آف اردو، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا اعزاز ۸۶-۱۹۸۵ء، سید احتشام حسین ایوارڈ ۱۹۸۷ء، پریم چند ایوارڈ ۱۹۸۹ء، نیاز فتح پوری ایوارڈ (کراچی) ۱۹۸۹ء، بھارتیہ انو واد پریشد ایوارڈ ۱۹۹۴ء مرزا غالب ایوارڈ ۲۰۰۰ء اور اردو اکیڈمی مغربی بنگال کے سب سے بڑے پرویز شاہدی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا ہے۔

قمر رئیس تحقیقی و اشاعتی کمیٹی، اردو اکیڈمی، دہلی (۱۹۸۷ء) کے چیرمین بھی رہے۔ انہیں انڈو سوویت کلچرل سوسائٹی دہلی (۱۹۷۸ء تا ۱۹۸۶ء) کا نائب صدر منتخب کیا گیا۔ یہ کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین، کل ہند انجمن اساتذہ اردو، کل ہند جشن فیض کمیٹی (دلی) انڈو ازبیک فرینڈ شپ سوسائٹی دہلی، نیاز حیدر میموریل سوسائٹی، دہلی کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔ فروغ اردو کے بارے میں گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل درآمد کمیٹی کے رکن نامزد ہوئے۔

قمر رئیس کی زندگی میں ازبکستان کو خاصی اہمیت حاصل ہے جہاں انہوں نے تقریباً چودہ برس گزارے ہیں۔ یوں تو انہوں نے سوویت یونین سے وابستہ ممالک کے متعدد سفر کئے، لیکن ازبکستان میں رہ کر خدمات انجام دینے کے لئے وہ وہاں چار مرتبہ گئے۔ تین بار ستمبر ۱۹۶۲ء سے جون ۱۹۶۶ء تک، ستمبر ۱۹۷۰ء سے جون ۱۹۷۲ء تک اور ستمبر ۱۹۸۲ء سے جون ۱۹۸۳ء تک وہ اسٹیٹ یونیورسٹی تاشقند میں مہمان پروفیسر رہے جب کہ ۱۹۹۷ء سے ۲۰۰۱ء تک وہ انڈین کلچرل سنٹر، سفارت خانہ ہند تاشقند میں ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز رہے۔ اس مدت میں انہوں نے وہاں کی زبان سیکھی اور متعدد شعرا کے کلام کے ترجمے کئے۔ انہوں نے ازبکستان اور وہاں کی تہذیب سے متعلق کئی مضامین اور کتابیں شائع کیں۔ ازبکستان میں قمر صاحب کے بے شمار دوست اور شاگرد ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قمر رئیس علمی اور عملی دونوں حیثیت سے اعلیٰ خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ غیر معمولی تنظیمی صلاحیت کے بھی مالک تھے۔ یہ سنگم شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ ۱۹۵۸ء میں جب قمر رئیس نے اپنی نظم ''مسودہ'' میں یہ کہا تھا کہ:

لے کے نکلا ہوں یہ دفتر آ گہی

ان کا بازار ہے، میری جنس گراں

کس سے سودا کروں کس کو آواز دوں؟

کون ہے جو سنے شوق کی داستاں؟

دفتر آ گہی لے کے نکلنے والے اس شخص کو خود بھی نہیں معلوم ہوگا کہ ایک بڑی ادبی تحریک کا تصور ان کے بغیر نامکمل رہے گا۔ ان کی داستان والوں کی تعداد لامحدود ہوگی، نہ صرف ہندوستان میں بلکہ غیر ممالک میں بھی ان کی خدمات ناقابل فراموش ہوں گی۔ انہوں نے بنیادی طور پر منشی پریم چند پر خوب کام کیا ہے۔ ان کی کتاب ''منشی پریم چند: شخصیت اور کارنامے'' (۱۹۸۳ء) ''پریم چند: فکر و فن'' (۱۹۸۰ء) ''پریم چند'' (۱۹۸۵ء) ''پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار'' (۱۹۵۹ء) جیسی کتابیں فکشن کی تنقید میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔

ان کے علاوہ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''تعبیر و تحلیل'' (۱۹۹۶ء) ''تلاش و توازن'' (۱۹۶۸ء) ''تنقیدی تناظر'' (۱۹۷۸ء) ''اردو میں طنز و مزاح کی روایت اور ہم عصر رجحانات'' (۱۹۸۶ء) ''اردو میں بیسویں صدی کا افسانوی ادب'' (۲۰۰۴ء) ''ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر'' (۲۰۰۷ء) اور ''ترقی پسند ادب کے معمار'' (۲۰۰۶ء) میں شائع ہوئی۔ ان کی اہم کتابوں میں ''آزادی کے بعد دہلی میں اردو افسانہ'' جسے انہوں نے ۱۹۹۰ء میں ترتیب دیا تھا۔ پیش نظر کتاب میں پروفیسر موصوف نے سات موضوعات (دہلوی روایت کی توسیع، ترقی پسند رجحانات، ترقی پسند روایت کی توسیع، انحراف کی لکیریں، جدیدیت کی لہر، ملی جلی روایت اور نئی آوازیں) کے ضمن میں نمائندہ افسانوں کا انتخاب کیا ہے اور مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع کیا۔

ان کی دوسری سب سے اہم کتاب ''ہندوستان میں ترقی پسند ادب کے معمار'' (انسائیکلوپیڈیا کے طور پر) ۲۰۰۶ء میں منظر عام پر آئی۔ اس میں ملک اور بیرون ملک کے ادباء و شعرا جن کا تعلق کسی نہ کسی طور پر ترقی پسند

رجحانات وتصورات سے رہا ہو۔ ان سب کی الف بائی ترتیب مواد کی صحت کے ساتھ پیش کر کے اردو ادب میں بہت بڑا کام انجام دیا ہے۔ پروفیسر موصوف نے پیش لفظ میں انسائیکلوپیڈیا کے اغراض و مقاصد پیش کیے ہیں اور لکھتے ہیں:

> ''صف اول کے ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں ناقدین نے مستقل کتابیں تصنیف اور شائع کیں اور ادبی رسائل کے خاص نمبر بھی نکلتے رہے، لیکن اوسط صلاحیت کے فنکار نظر انداز ہوگئے۔ حالانکہ ترقی پسند تحریک کو تحریک کی مقبولیت اور مرتبہ دینے میں ان کا حصہ کم نہیں تھا۔'' (۲۵)

کتاب میں پیش لفظ کے بعد چالیس صفحات پر مشتمل مقدمہ لکھا گیا ہے۔مقدمہ میں ترقی پسند تحریک کے دبی پس منظر سے بات شروع ہوئی ہے اور جستہ جستہ بیسویں صدی کی اہم تحریکات وعوامل اور مشہور ومعروف ادب کے فنکاروں (جن کا کوئی خاص علاقہ رہا ہو) اور تحریک کا سیاسی اور نظریاتی تناظر کے تحت پر مغز باتیں کہی گئی ہیں۔ بقول قمر رئیس:

> ''ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کی شاہکار تخلیقات ۱۹۴۹ء کے بعد ہی سامنے آئیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ جب تحریک میں بکھراؤ آیا تو تخلیق میں پختگی اور ٹھہراؤ کے آثار پیدا ہوئے۔ وہ کرشن چندر ہوں، بیدی ہوں، عصمت چغتائی ہوں، حیات اللہ انصاری ہوں یا پھر شعرا کی صف میں جذبی، مجروح سلطان پوری، فراق گورکھپوری، علی سردار جعفری، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی، منیب الرحمٰن، ساحر لدھیانوی، مخدوم محی الدین، وامق جونپوری، غلام ربانی تاباں اور دوسرے شعرا......سب نے اپنے نو بہ نو فن پاروں میں ترقی پسندی کو ایک نئے معنی ومفہوم سے ہمکنار کیا اور ان کے بعد کی پیڑھیاں بھی۔ جوگندر پال، پرویز شاہدی، مظہر امام، اقبال مجید، جیلانی بانو، عبدالصمد، قاضی عبدالستار، اقبال متین، رام لال، رتن سنگھ، وحید اختر، زاہدہ زیدی سے الیاس احمد گدی، ساجد رشید اور سلام بن رزاق تک ......ایسے ان گنت تخلیقی فنکار ہیں

جنھوں نے معنوی اور فنی میدان میں ترقی پسند روایات کو نئی توسیع دی اور نئے

امکانات سے آشنا کیا۔''(۲۶)

انھوں نے فکشن کی تنقید کے حوالے سے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں انھیں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ پریم چند کے حوالے سے ان کا کام بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔ان کا خیال ہے کہ زندگی اپنے ظاہری معنوں میں بظاہر جتنی شفاف ہے اتنی ہی گرفت،مبہم اور غیر یقینی بھی ہے۔لیکن ایک فکشن نگار اسے معنی خیز بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔لیکن ہزار گرہیں کھولنے اور ہزار معنی پہنانے کے باوجود اس کے الجھاؤ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ چوں کہ وہ ایک تخلیق کار بھی ہیں اس لیے زندگی کے پیچ وخم سے بخوبی واقف ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ افسانوی ادب کے میدان میں شاہکار تخلیقات وہ ہیں جو اپنے عہد کے بنیادی مسائل کو سمیٹے ہوئے ہوتی ہیں۔

انھوں نے پریم چند کے ساتھ بیدی اور قرۃالعین حیدر جیسے کئی اہم فن کاروں کے فکشن پاروں کا تجزیہ کیا ہے اور ان کی فنی اور جمالیاتی قدروں کی تسہیل وتفہیم کی کوشش کی ہے۔انھوں نے بھی داستانوں، ناولوں اور افسانوں میں مواد کے ساتھ ہیئت اور لسانی نظام کو ملحوظ خاطر رکھا ہے اور ان میں پائی جانے والی معنوی تہہ داری اور پرت در پرت مفاہیم کی گرہیں وا کی ہیں۔اپنی تنقید میں وہ سادہ،سلیس اور صاف زبان استعمال کرتے ہیں جو سب کے لیے قابل فہم ہو اور یہی ان کا مابہ الامتیاز بھی ہے۔

☆☆☆

سلیم اختر

سلیم اختر کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ وہ اردو کے مایہ ناز نقاد، نامور افسانہ نگار، ماہر لسانیات، ماہر اقبالیات، ادبی مورخ، مشہور معلم اور معروف محقق تھے۔ کثیر الجہت شخصیت کے مالک سلیم اختر ۱۱/ مارچ ۱۹۳۴ء کو لاہور (پاکستان) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد قاضی عبدالحمید ملٹری اکاؤنٹس میں ملازم تھے۔ اس نسبت سے ان کا تبادلہ ہوتا رہا اور جہاں جہاں دوران تبادلہ وہ جاتے اپنی فیملی کو بھی ہمراہ لے جاتے تھے۔

قیام پاکستان کے وقت آپ کے والد انبالہ میں مقیم تھے۔ سلیم اختر کو بھی انبالہ، پونہ، لاہور، بلوچستان اور راولپنڈی وغیرہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بہترین مواقع ملے، انہوں نے ۱۹۵۱ء میں فیض الاسلام اسکول راولپنڈی سے میٹرک کیا۔ ایف۔ اے اور بی اے گورنمنٹ کالج راولپنڈی سے ہی کیا۔ جامعہ پنجاب لاہور سے ڈپلومہ آف لائبریری سائنس ایم۔ اے (اردو) اور پی۔ ایچ ڈی کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد شعبہ تعلیم سے وابستگی ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ان کا ادبی ذوق مختلف رسالوں سے منسلک رہا۔

انہوں نے بطور اردو لکچرار پہلی ملازمت گورنمنٹ ایمرسن کالج ملتان میں کی۔ وہاں انہوں نے آٹھ سال اردو کی خدمت کی پھر گورنمنٹ کالج لاہور چلے آئے۔ ۱۹۹۶ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد اگلے گیارہ برسوں تک وزیٹنگ پروفیسر کے طور پر درس دیتے رہے اس کے علاوہ آپ یونیورسٹی آف ایجوکیشن میں درس و تدریس کی ذمہ داریاں بخوبی انجام دیتے رہے۔ آپ کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں ۲۰۰۸ء کو حکومت پاکستان سے صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی سے بھی سرفراز کیا گیا۔

ڈاکٹر سلیم اختر جامع کمالات تھے۔ ان کی تفصیلات کی تعداد تقریباً سیکڑوں کی ہے۔ نمونے کے طور پر یہاں چند کتابوں کی فہرست سازی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ افسانہ ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ

(۱۹۷۱ء/۲۰۰۵ء)''اقبالیات کے نقوش''(دو جلد ۱۹۷۷/۱۹۹۹ء)''حقیقت سے علامت تک'' (تنقید ۱۹۸۰ء) ''انشائیہ کی یاد''(تنقید ۱۹۸۶ء)''نفسیاتی تنقید'' (۱۹۸۶ء) ''اقبال کا نفسیاتی مطالعہ'' (تنقید ۱۹۸۷ء)''نگاہ اور نقطے''(دوایڈیشن ۱۹۸۸/۱۹۸۷ء)''باغ و بہار تحقیق وتنقید کے آئینے میں''(تنقید ۱۹۹۰ء) ''بنیاد پرستی'' (تنقید ۱۹۹۶ء) ''اقبال کی فکری میراث'' (تنقید ۱۹۹۶ء) ''شعور اور لاشعور کا شاعر غالب''، ''تنقیدی دبستان'' (۱۹۹۷ء)،مغرب میں نفسیاتی تنقید، اردو زمانی کیا ہے، ایران میں اقبال شناسی کی روایت وغیرہ وغیرہ ان کی ادبی میراث ہے۔

سلیم اختر کی ذہنی دلچسپیوں کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔انہوں نے زندگی کے چالیس برس درس وتدریس میں گزارے۔ان کے طلبہ کی تعداد ہزاروں میں شمار کی جاتی ہے ان میں سے اکثر نے ان کے زیر نگرانی ایم فل اور پی ایچ ڈی(Ph.D) کے مقالے تحریر کئے۔دوران تدریس جی سی یونیورسٹی میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب شعبہ اردو کا تقریباً نصف درجہ ان کے شاگردوں پر مشتمل تھا۔غرض سلیم اختر ایک عہد ساز شخصیت کے مالک تھے جن کا میدان وسیع سے وسیع تر ہے۔انہوں نے اردو ادب کی تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی اور کامیاب بھی ہوئے۔

سلیم اختر کی ادبی زندگی کو ہم چار حصوں میں منقسم کر سکتے ہی ایک سلیم اختر بطور نقاد، دوسرا سلیم اختر بطور افسانہ نگار، سلیم اختر بطور اقبال شناس اور سلیم اختر بطور ادبی مورخ۔جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے کہ انہوں نے کئی درجن کتابیں تخلیق کیں۔بطور اقبال شناس انہوں نے اقبال کی ذات کے بعض ایسے پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا ہے جو پہلے کسی ناقد نے کام نہیں کیا تھا۔سلیم اختر نے اقبال کی شعری ونثری دونوں اصناف کو نمونہ بنایا۔انہوں نے اقبالیات کے ان پہلوؤں کو اجاگر کیا جو عام اقبال شناسوں کی نظر سے اوجھل رہے۔

بحیثیت ادبی مورخ بھی سلیم اختر کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔اس واسطے ان کی کتاب ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' کو دیکھا جا سکتا ہے۔یہ ایک لاجواب کارنامہ ہے جس کو تمام اردو زبان کے چاہنے والے قدر کی نظر سے دیکھتے ہیں۔خود مصنف کو بھی اپنی تمام تخلیقات میں یہ کتاب سب سے زیادہ عزیز تھی اور وہ اس کو بے حد پسند کرتے تھے حالانکہ کتاب کی پہلی اشاعت پر ان کو بہت زیادہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑا،تنقیدیں کی جانے لگیں۔ کوئی اپنا نام نہ آنے سے ناراضگی تھی تو کسی کو اپنے حریف کے نام،کسی کو شکوہ تھا کہ اس کی ادبی حیثیت کم کر دی ہے تو

کوئی اپنے مخالف کو زیادہ جگہ ملنے پر برہم تھا۔ بات یہاں تک پہنچ گئی کہ ان کو دکھ بھرے خطوط بھی موصول ہونے لگے، لیکن بعد کو انہوں نے سب کو شامل کیا۔ اس کتاب کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ اس کا تیسواں ایڈیشن ۲۰۱۸ء میں سنگ میل پبلی کیشنز کی طرف سے شائع کیا گیا۔

بطور نقاد سلیم اختر کی شخصیت مسلم ہے نفسیاتی تنقید ان کا خاص موضوع ہے یہی وجہ تھی کہ انہوں نے بطور نقاد نفسیاتی تنقید پر زیادہ زور دیا۔ ان کا مطالعہ نفسیات پر کافی گہرا تھا۔ ژائدنگ اور ایڈسر کے نظریات سے بخوبی آگاہ تھے۔ شاید اسی مطالعے کا اثر تھا کہ انہوں نے اس ضمن میں مغرب میں نفسیاتی تنقید ''تنقیدی دبستان''، ''خود شناسی: فرد اور معاشرے'' کے تعلقات کا نفسیاتی مطالعہ''، ''نفسیاتی تنقید''، ''تنقید، منطق اور سائنس'' جیسی کتابیں لکھیں اس کے علاوہ جوش اور اقبال کی شاعری پر نفسیاتی تنقید بھی لکھی۔

میرے مقالے کا عنوان ''اردو فکشن کی تنقید'' ہے اس لئے سلیم اختر کے تنقیدی زاویے کو بھی پیش کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ انہوں نے دیگر تصانیف کی طرح فکشن کی تنقید میں بھی ایک اعلیٰ مقام حاصل کیا ہے۔ ان کی تنقیدی کتابیں فکری و ذہنی اعتبار سے معیاری ہیں اور اردو فکشن کی تاریخ میں ان کی خاصی اہمیت بھی ہے۔ سلیم اختر کو اردو دنیا ایک عہد ساز تنقید نگار کے طور پر جانتی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے کئی کتابیں تخلیق کی ہیں۔ ان کی کتاب ''افسانہ حقیقت سے علامت تک'' خاصی اہم ہے۔ ۱۹۸۰ء میں اردو رائٹرس گلڈ (الہ آباد) پریس سے شائع ہوئی۔ کتاب کے حوالے سے وہ خود لکھتے ہیں:

> موجودہ تنقیدی گرم بازاری میں افسانہ نگاروں اور افسانے کے فن پر
> باضابطہ تصانیف بہت کم ہیں۔ یہ کتاب اسی توقع سے پیش کی جارہی ہے کہ
> شاید یہ مضامین مزید تنقیدی تحریروں کے لیے محرک ثابت ہوسکیں۔ (۲۷)

یہ بات بالکل درست ہے فکشن کی تنقید کے حوالے سے ہمیں کتابیں خال خال ہی نظر آتی ہیں، لیکن اب ایسی بات نہیں ہے اور گاہے گاہے ہمیں ایسے مضامین دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ لہٰذا سلیم اختر کی یہ کتاب قابل قبول ہے، انہوں نے مختلف موضوعات کے تحت منفرد نظریے سے عام قارئین کو متاثر کیا ہے۔ داستان سے افسانے تک کا سفر کرتے ہوئے انہوں نے ایک جامع کتاب کی تخلیق کی۔ باغ و بہار کا تجزیہ ہو یا بیدی کا افسانہ

’’متھن‘‘ کا تحقیقی جائزہ دونوں اپنے آپ میں معیاری حیثیت رکھتے ہیں۔ دیگر ناقدین کی طرح اردو فکشن کی تنقید کے حوالے سے سلیم اختر کو بھی اولیت کا شرف حاصل ہے اور انہیں اردو زبان وادب کی تاریخ میں ایک مکمل جگہ دیا جاتا ہے۔ بلا شبہ سلیم اختر ایک عہد ساز شخصیت کے مالک ہیں۔ آنے والے دور میں اردو زبان وادب کا قاری و ناقد ان کا مطالعہ کریں گے۔ ان کی ذات کا کوئی نہ کوئی نیا گوشہ ضرور اجاگر ہوگا اور اردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا۔

سلیم اختر افسانہ نگار بھی ہیں اور افسانے کے نقاد بھی۔ افسانے کے بارے میں ان کے اپنے نظریات ہیں جن کی روشنی میں وہ افسانے کا ادبی مقام ومرتبہ معین کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ لکھتے وقت بھی انھوں نے اس کے تمام پہلوؤں مثلاً تکنیک، تاثر، اردو افسانے کی جہت، جدید افسانہ، افسانوں پر تنقید، افسانہ مغرب میں وغیرہ پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس طرح انھوں نے افسانہ لکھنے اور سمجھنے میں کسی حد تک ادیب وقاری کی رہنمائی کی ہے۔

بحیثیت فکشن نقاد ان کی اپنی حیثیت مسلم ہے۔ وہ ہند و پاک میں احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے اس تنقیدی سفر کا آغاز ’’نگاہ اور نقطے‘‘ سے کیا۔ اس سے پہلے اگر چہ ان کے تنقیدی مضامین مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہے لیکن تنقیدی مقالات کا باقاعدہ مجموعہ یہی ہے۔ اس کے علاوہ بھی انھوں نے فکشن کی تنقید کے حوالے سے کئی اہم مضامین اور کتابیں تصنیف کیں۔ اس سلسلے میں وہ سطحی تنقید کے قائل نہیں ہیں اور نہ ہی تنقید برائے تنقید کو مانتے ہیں، بلکہ وہ تخلیقی تنقید کے قائل ہیں۔ کسی بھی فکشن پارے کے مطالعے کے وقت وہ فن پارے کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کرتے ہیں اور تخلیق کار کی نفسیات تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس لیے اگر ان کو نفسیاتی تنقید کے ذیل میں رکھا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

☆☆☆

شارب ردولوی

پروفیسر شارب ردولوی، ردولی کے ایک زمیندار گھرانے میں یکم ستمبر ۱۹۳۵ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم حسن عباس اور دادا حکیم غلام حسین کا شمار فارسی و عربی کے بڑے عالموں میں ہوتا تھا۔ ڈاکٹر شارب نے ایسے ماحول میں آنکھیں کھولیں جہاں گھر ہی میں اچھی خاصی لائبریری موجود تھی۔ جس میں متعدد علوم وفنون کے نایاب کتب کا ذخیرہ محفوظ تھا۔ جو ان کے زیر مطالعہ رہیں۔ دورانِ تعلیم انہوں نے پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب، پروفیسر احتشام حسین، پروفیسر نورالحسن ہاشمی اور پروفیسر آل احمد سرور کے علم اور لکچرز سے استفادہ کیا۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے ۱۹۶۵ء میں پروفیسر احتشام حسین کی نگرانی میں اپنا تحقیقی مقالہ بہ عنوان ''جدید اردو ادبی تنقید کے اصول'' لکھا اور پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

نومبر ۱۹۷۵ء سے مئی ۱۹۷۹ء تک وزارت تعلیم وسماجی بہبود حکومت ہند کے ترقی اردو بیورو میں پرنسپل پبلی کیشن افسر کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۷۹ء میں وہاں سے مستعفی ہوکر دیال سنگھ کالج واپس آ گئے۔ ۱۲ جنوری ۱۹۹۰ء میں جواہر لال نہرو یونیوسٹی کے شعبہ اردو میں بحیثیت ریڈر ان کا تقرر ہوا۔ ۱۵ ستمبر ۱۹۹۳ء میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں پروفیسر مقرر ہوئے اور وہیں سے ۲۰۰۰ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے ان کے ادبی سفر کا آغاز ایک تخلیقی فن کار کی حیثیت سے ہوا۔ بچپن ہی سے ان کا رجحان شاعری کی طرف تھا۔ ان کے استاد مولوی حبیب الرحمٰن نے جو خود ایک اچھے شاعر تھے، ان کی صحبت نے ان کے اندر شعری ذوق پیدا کیا۔

ایک معیاری شعری ذوق رکھنے کے باوجود ڈاکٹر شارب کی ادبی حلقے میں شناخت ایک ممتاز تنقید نگار کی حیثیت سے ہے۔ تحقیق وتنقید کے باہمی رشتے کی وجہ سے انھوں نے بڑی سنجیدگی اور ادبی دیانت داری سے اس فن میں طبع آزمائی کی۔ بعدازاں وہی ان کا کیریر بن گیا۔ دراصل دورانِ تعلیم ہی پروفیسر احتشام حسین کی صحبت میں ان

کا تنقیدی شعور نہ صرف بیدار ہو چکا تھا بلکہ اس میں ایک خاص نکھار بھی آ چکا تھا۔ ان کا تحقیقی مقالہ بھی ادبی تنقید ہی سے متعلق تھا۔ تعلیمی مصروفیات کے ساتھ ان کی علمی مصروفیات کا بھی آغاز ہو چکا تھا۔ پہلا مضمون روزنامہ ''سیاست'' (کانپور) میں شائع ہوا تھا۔ ان کی ابتدائی نگارشات روزنامہ ''قومی آواز'' (لکھنؤ) ماہنامہ ''نیا دور'' (لکھنؤ) ہفت روزہ ''آثار'' (کلکتہ) میں شائع ہوتی رہیں۔

ڈاکٹر شارب نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں ۱۹۵۵ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے ایک پندرہ روزہ اخبار ''پاسبانِ طلبہ'' نکالا تھا جو ۱۹۵۶ء میں کسی سبب بند ہو گیا۔ اسی سال کچھ عرصہ بعد روزنامہ ''اردو'' (لکھنؤ) کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ ان کے متعدد ادبی اور تنقیدی مضامین، مقالے، ریویو مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ بارہ سے زائد کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ کچھ کتابیں مرتب کردہ ہیں، جن میں ان کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین بھی شامل ہیں۔ اپنی تصنیفی مصروفیات کے علاوہ ڈاکٹر شارب علمی و ادبی تقریبات میں بھی برابر شریک ہوتے رہے۔ انہوں نے پچاس سے زائد ملکی و بین الاقوامی کانفرنسوں، سمیناروں میں شرکت کی ہے۔ ان کے علمی و ادبی خدمات کے عوض انہیں متفرق ادبی اکادمیوں اور تعلیمی اداروں نے اعزازات و انعامات سے نوازا۔ وہ خود متعدد تعلیمی اداروں اور کمیٹیوں کے فعال رکن رہے ہیں۔ انہوں نے ریڈیو اور ٹی۔ وی کے مختلف پروگراموں میں شرکت کی اور فلموں کی اسکرپٹ بھی لکھی ہیں۔

ان کی نمائندہ کتابوں میں ''جدید اردو تنقید: اصول و نظریات''، ''تنقیدی مطالعے'' اور ''معاصر اردو تنقید: مسائل و میلانات'' ہیں۔ ''جدید اردو تنقید: اصول و نظریات'' (۱۹۸۷ء) ۴۸۵ صفحات پر مشتمل ایک اہم تصنیف ہے جس میں انہوں نے تنقید کے مختلف مشرقی و مغربی نظریات اور ان کے اصولوں کا بڑی جامعیت سے تجزیہ کیا ہے۔ اسی لئے یہ کتاب ہندوستان کی مختلف یونیورسیٹیوں میں تنقید کے نصاب میں شامل ہے۔ اس کے چوتھے ایڈیشن کے دیباچہ میں پروفیسر شارب ردولوی لکھتے ہیں:

> ''گزشتہ پندرہ سال میں بعض نئے تنقیدی رجحانات مغربی ادب میں سامنے آئے جن کا انگریزی ادب و تنقید پر خاصا گہرا اثر پڑا ہے۔ اس کتاب کے دوسرے اور تیسرے ایڈیشن کی اشاعت کے وقت اس کے اثرات اردو میں

نمایاں نہیں تھے اس لئے میں نے ان رجحانات کو شامل نہیں کیا تھا، لیکن اس عرصے میں اردو میں بھی ان کے اثرات نظر آنے لگے ہیں گوکہ اب بھی نمایاں نہیں ہیں۔ پھر بھی میں نے مناسب سمجھا کہ مختصراً ان کا تعارف کرادیا جائے۔'' (۲۸)

تنقید ایک سنجیدہ فن ہے۔ اس فن کو اپناتے وقت اس بات کا ادراک ضروری ہے کہ تنقید محض عیب جوئی سے عبارت نہیں ہے۔ اس کا مقصد کسی کی بے جا توصیف یا مذمت کرنا نہیں ہے بلکہ کسی تخلیق میں پوشیدہ صفات و خصوصیات کا پتہ لگانا، اس کی صحیح قدر و قیمت کا تعین کرنا نیز اس کا صحیح تجزیہ، توضیح و تشریح ہے۔ اس ضمن میں تنقید نگار کا رویہ مثبت اور غیر جانبدارانہ ہونا چاہئے۔ ڈاکٹر شارب کی تنقیدی نگارشات میں یہ محاسن پائے جاتے ہیں۔ وہ اپنے خیالات اور اپنی آرا کا اظہار کرتے وقت وہ انتہا پسندی سے احتراز کرتے ہیں۔ جارحانہ رویہ اختیار کرنے کے بجائے نسبتاً نرمی سے کام لیتے ہیں۔ اپنے مضامین میں بے جا علمیت کا اظہار نہیں کرتے ہیں۔ اس طرح اپنی تحریروں کو بوجھل اور غیر دلچسپ ہونے سے بچالیتے ہیں۔ پروفیسر قمر رئیس کے مطابق:

''ڈاکٹر شارب ردولوی کا شمار سید احتشام حسین کے تلامذۂ ارشد میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اردو تنقید میں سائنٹفک تجزیہ اور معروضی طرز فکر کو رواج دیا جو احتشام حسین کے تنقیدی اسلوب کا امتیازی عنصر رہا ہے۔ قدیم ادب کے نمونے ہوں یا جدید اور معاصر ادب کے رجحانات وہ یکساں سہولت سے ان کا جائزہ لیتے ہیں اور اکثر صحیح نتائج تک پہنچتے ہیں۔'' (۲۹)

شارب رودولوی نے فکشن کی تنقید کے حوالے سے زیادہ نہیں لکھا ہے۔ اس سلسلے میں وہ گاہے بہ گاہے مضامین و مقالات رسائل و جرائد میں شائع کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر شاعری کی تنقید لکھی ہے یا نظری تنقید کے مسائل و مباحث سے بحث کی ہے۔ انھوں نے دوسرے نقطہ ہائے نظر اور تنقید کے دوسرے مکاتیب فکر کو معروضی میں پیش کیا ہے اور ان کو تنقیدی نقطہ نظر سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ فکشن کی تنقید کے حوالے سے ان کے اہم مضامین قرۃ العین حیدر، راجندر سنگھ بیدی اور انتظار حسین کے حوالے سے ہیں۔ انھوں نے اپنے

مضامین میں ان کے فن پاروں کا جائزہ نہایت گہرائی سے لیا ہے۔لیکن معروضیت ان کی تنقید کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

معروضیت کا تقاضا یہی ہے کہ جو چیز جس طرح سے ہے جو دلائل جس نقطہ نظر کی حمایت میں پیش کیے گئے ہیں ان کو اسی طرح معروضی انداز میں پیش کیا جائے اور فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ یہ طے کریں کہ اس میں کس کو رد کرنا ہے اور کس کو قبول کرنا ہے۔فکشن کی تنقید میں یہی معروضیت ان کو اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے۔

☆☆☆

شمس الرحمٰن فاروقی

شمس الرحمٰن فاروقی اردو ادب کے مشہور نقاد اور محقق تھے۔ جنہوں نے تنقید نگاری سے اپنا سفر شروع کیا۔ آپ کی پیدائش کالا کانکر ہاؤس، پرتاپ گڑھ اودھ میں ۳۰ ستمبر ۱۹۳۵ء کو اپنے نانا جان محمد نظیر کے گھر ہوئی۔ اس وقت ان کے نانا کورٹ آف وارڈس کی حیثیت سے مہاراجہ پرتاپ گڑھ کی کوٹھی کالا کانکر ہاؤس میں مقیم تھے۔ آپ کے والد خلیل الرحمٰن فاروقی اور دادا حکیم محمد اصفر فاروقی تھے۔

شمس الرحمٰن فاروقی کا حقیقی وطن موضع کوریا پار، ضلع اعظم گڑھ تھا۔ آپ کی ابتدائی تعلیم اعظم گڑھ اور گورکھپور میں ہوئی۔ انہوں نے گورنمنٹ جبلی ہائی اسکول سے ۱۹۴۹ء میں میٹرک پاس کیا۔ جارج اسلامیہ انٹر کالج گورکھپور سے ۱۹۵۱ء میں انٹرمیڈیٹ ہوئے اور مہارانا پرتاپ گڑھ، گورکھپور سے ۱۹۵۳ء میں بی اے کیا۔ اس کے بعد الٰہ آباد یونیورسٹی سے ۱۹۵۵ء میں انگریزی میں ایم۔ اے امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا۔ فاروقی نے اپنی ملازمت انگریزی ادب کے لکچرر کی حیثیت سے شروع کی۔ پہلے وہ ستیش چند ڈگری کالج، بلیا سے وابستہ رہے، اس کے بعد شبلی کالج، اعظم گڑھ سے ہوئے۔ یہ سلسلہ ۱۹۵۸ء تک چلتا رہا۔ اس کے بعد وہ انڈین سول سروس کے مقابلہ جاتی امتحان میں کامیاب ہوئے اور حکومت ہند کے پوسٹل بورڈ کے ممبر کی حیثیت سے ۱۹۹۴ء میں سبکدوش ہوئے۔

اردو اور انگریزی کے شاعر اور نقاد کی حیثیت سے بھی شمس الرحمٰن فاروقی معروف ہیں۔ ان کا شمار اردو کے چند معتبر اور اہم نقادوں میں ہوتا ہے۔ وہ جدیدیت کی تحریک کے امام سمجھے جاتے ہیں اور یہ پوری تحریک ان کی ذات سے عبارت ہو کر رہ گئی ہے۔ ویسے انہوں نے شاعری میں بھی امتیاز حاصل کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن جو اعتبار انہیں، بحیثیت نقاد حاصل ہوا ہے وہ شاید شاعری میں ممکن نہ ہو سکا۔

احمد محفوظ لکھتے ہیں کہ ’’فاروقی پر مولانا روم، عبدالقادر میر جرجانی، بیدل، میر، غالب، حالی، اقبال، مولانا اشرف علی تھانوی، محمد حسن عسکری، میراجی، آل احمد سرور، کلیم الدین احمد، ن م راشد، مالک رام کے علاوہ قدیم سنسکرت ماہرین شعریات کے اثرات ہیں۔‘‘ موصوف نے مغربی ادب کے بعض اہم فنکاروں کے بھی نام لئے ہیں مثلاً پروپڑیز، ارسطو، شیکسپیئر، جان ڈاوٗن، کولرج، بودلیئر، دستووسکی، ٹامس ہارڈی، آئی اے رچرڈس، امریکی تنقید کے بنیادگزار اور روسی ہیئت پسند نقاد وغیرہ۔

شمس الرحمٰن فاروقی رسالہ ’شب خون‘ الہ آباد کے بانی بھی تھے اور مرتب بھی۔ انھوں نے جدیدیت کے فروغ میں بہت بڑا رول انجام دیا، لیکن اس تحریک کی پشت پر ابہام، اہمال، علامت وغیرہ پر اتنا زور صرف کیا کہ شعروادب ایک خاص نہج پر ڈھلنا شروع ہوا۔ افسانے کی معمگی اور ابہام اسے اہمال کی سرحدوں پر لے گئی۔ جہاں پیچیدہ علامتوں سے تفہیم محال ہوگئی۔ ایسے افسانوں نے بار پانا شروع کیا جن کے لئے کوئی بھی منطقی استدلال لایعنی ٹھہرا۔ افسانے کی عضویاتی تکمیل منہا ہوگئی اور ماجرا کی شکستگی اور بودگی نے اس کی جگہ لے لی۔ تفہیم کے مشکل مرحلے نے اس کا رشتہ پڑھنے والوں سے توڑ دیا۔ نتیجے میں افسانہ نگار کا ذہن ایک ایسی پیچیدگی کا شکار ہوگیا جس سے اس کی تخلیق ناروا حد تک بے مایہ ہوگئی۔

ان تمام امور کے پیچھے شمس الرحمٰن فاروقی کی یہ تبلیغ رہی تھی کہ شعروادب دراصل داخلیت سے عبارت ہے جس میں ہر شخص کو صرف اپنے اندر کی دنیا تلاش کرنی ہے، لہٰذا کردار کی بے چہرگی افسانہ نگاروں کے لئے اہم ٹھہری۔ شکست اور ریخت کے مرحلے نے نہ صرف افسانے کو متاثر کیا بلکہ شاعری بھی اس کی زد میں آئی۔ خارجی دنیا سے کنارہ کشی نے اس کا اجتماعی کیف وکم چھین لیا۔ ظاہر ہے یہ ساری صورتیں شمس الرحمٰن فاروقی کے بعض تجزیے اور بعض کتابوں نے پیدا کیں۔

انہوں نے ایک کتاب ’’افسانے کی حمایت میں‘‘ قلمبند کی ہے۔ زیرمطالعہ کتاب کے سبھی مضامین افسانے، افسانے کی تنقید پر لکھے گئے ہیں۔ ان میں انھوں نے پریم چند، سجاد انور، قمراحسن، بلراج کومل، سجاد حیدر یلدرم اور بلونت سنگھ وغیرہ کے افسانوں کے کسی نہ کسی پہلو کو اپنے تنقید کا حصہ بنایا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب ان کی عمدہ نگارشات کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے حال کے دنوں میں ایک ناول ’’کئی چاند تھے سر

آسماں'' (۲۰۰۶ء) لکھا ہے۔ یہ ناول تقریباً ۸۵۰ صفحات پر مشتمل ہے جسے پینگوئن گروپ نے شائع کیا ہے۔اس ناول کا نام انہوں نے احمد مشتاق کے شعر ؎

کئی چاند تھے سرِ آسماں کہ چمک چمک کے پلٹ گئے
نہ لہو مرے ہی جگر میں تھا نہ تمہاری زلف سیاہ تھی

سے لیا ہے۔ عالموں اور دانشوروں کے درمیان اس کتاب کی بے حد پزیرائی ہوئی اس ناول کے مطالعہ کے پیش نظر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ غیر معمولی تخلیقی کارنامہ اچانک وجود میں نہیں آیا بلکہ اس کے پیچھے وہ مقاصد اور منصوبے کارفرما رہے ہیں جن کا اظہار شمس الرحمٰن فاروقی کی دیگر تصانیف میں وقتاً فوقتاً ہوتا رہا ہے۔

شمس الرحمٰن ایک ذی علم نقاد ہیں جن کی نگاہ کلاسیکی ادب پر بہت گہری ہے۔عروض و آہنگ کے بھی وہ نہ صرف ایک واقف کار ہیں بلکہ ماہر کے طور پر سامنے آتے ہیں،لیکن ان کا ادبی موقف وقت کی کسوٹی پر شاید کھرا نہ اتر سکے۔لہٰذا جدیدیت کے ایک امام کے طور پر تو ان کی شناخت ہوتی رہے گی۔انہیں بہت سارے انعامات مل چکے ہیں۔جن میں ساہتیہ اکادمی انعام کے علاوہ برلا فاؤنڈیشن کا سرسوتی سمان بھی ہے۔ فاروقی نے بہت سی یونیورسٹیوں میں لکچرس دیے ہیں۔جن میں بیرونی یونیورسٹیاں بھی شامل ہیں۔

انہیں اردو پروفیسر کی اعزازی ڈگری بھی مل چکی ہے۔اس پس منظر میں ان کی اہمیت سے کسے انکار ہوسکتا ہے؟ لیکن میرا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کی مکمل تفہیم کے لئے اردو اور فارسی کے کلاسیکی ادب کا مطالعہ ہی زیادہ معاون ہے۔اس کے لئے بعد میں مغربی ادبیات کا وہ حصہ سامنے آتا ہے جسے ہم زوال پسندوں کی تعبیرات قرار دیتے ہیں۔لسانیات سے بھی ان کی دلچسپی رہی ہے۔ان کی کتاب ''اردو کا ابتدائی زمانہ: ادبی تہذیب و تاریخ کے پہلو'' ہر زمانے میں عوام کی پسند بنی رہے گی۔ان کا انتقال ۲۵ ر دسمبر ۲۰۲۰ء کو الہ آباد میں ہوا اور وہیں تدفین بھی ہوئی۔

فاروقی نے فکشن کی تنقید کے حوالے سے بہت کچھ لکھا ہے۔ان کے بارے میں ان کا نظریہ یہ ہے کہ اس کے سلسلے میں تھیوری قائم نہیں کی جاسکتی۔ناول کے متعلق فاروقی ان نظریات کو غلط ٹھہراتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ناول ترقی یافتہ صنف ہے اور داستان غیر ترقی یافتہ۔ ہاں ایسا ضرور ہے کہ ناول عہد انقلاب کی پیداوار ہے۔ناول کی جدید نظری تنقید کے متعلق فاروقی کا یہ کہنا ہے کہ ناول کی جدید نظری تنقید سے ہم اردو والوں کی

ملاقات بس واجبی سی ہے۔ ناول سے اصولوں کے ہماری ملاقات ان کتابوں کی بنا پر ہے جو آج سے سو برس پہلے لکھی گئی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ جہاں ناول میں کچھ چیزیں حاصل کیں ہیں وہیں اس نے بہت سی چیزیں کھوئی بھی ہیں۔ بڑی چیز تو یہ کھوئی ہے کہ کے ناول نگار اور اس کے قاری کے درمیان کوئی ربط نہیں، پتا نہیں وہ قاری کہاں ہے۔ جاپان میں ہے یا الہٰ آباد میں۔ اس لیے ناول نگار کی ذمہ داریاں مزید بڑھ جاتی ہیں۔

ان کا ماننا ہے کہ ناول کی شعریات اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ناول کسی نہ کسی صورت سے داخلی یا خارجی دنیا کی حقیقت سے روشناس کرے۔ فاروقی نے ناول کے تعلق سے ایک اور اہم بات یہ کہی ہے کہ ہمارے یہاں ناول کی کوئی مستقل روایت نہیں ہے جس کی بنا پر ایک ناول نگار کے فن کو دوسرے کے مقابلے میں رکھا جائے۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ ناول کو داستان کی روایت سے جوڑ کر آگے بڑھایا جا سکتا ہے کیونکہ دونوں بیانیہ کے اقسام ہیں۔ تو اس سلسلے میں فاروقی کہتے ہیں کہ ناول کو داستان کی روایت سے نہیں جوڑ سکتے کیونکہ داستان کی جو طرز وجود ہے وہ فکشن سے بالکل منفرد ہے۔ داستان کی روایت قصہ کہنے کی ہے جب کہ ناول کی روایت قصہ لکھنے کی ہے۔

اسی طرح افسانے کے تعلق سے ان کا بیان چونکا دینے والا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ افسانہ کوئی اہم صنف نہیں ہے۔ اس کی دلیل وہ یہ پیش کرتے ہیں کہ آج تک کسی افسانہ نگار کو اس کے افسانہ کی وجہ سے شہرت دوام حاصل نہیں ہوئی۔ پوری ادبی میراث اور ادب کی مختلف اصناف کی اضافی اہمیتوں کا اندازہ لگاتے ہوئے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ افسانہ ایک معمولی صنف سخن ہے اور بالخصوص شاعری کے سامنے افسانہ ٹھہر ہی نہیں سکتا۔ ''افسانے کی حمایت میں'' کی بہت سی باتوں سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے اور اختلاف کرنا بغرض اصلاح یا صحیح بات سامنے لانے کے لیے ضروری بھی ہے۔ لیکن اس بات پر افسوس ہے کہ ہمارے ناقدین کو یہ تو نظر آیا کہ فاروقی نے افسانے کی دھجی اڑا دی ہے، مگر اس بات کی طرف توجہ کرنے کی کسی نے زحمت گوارا نہیں کیکہ اس سلسلے میں فاروقی سے دو چار کر لیں بلکہ افضلیت اور برتریت کی بحث میں بیشتر ناقدین نے بہت کچھ لکھ دیا۔ تاہم سنجیدگی سے افسانے کے نظری مباحث قائم کرنے کی جسارت کم ہی لوگوں نے کی ہے۔

☆☆☆

عبدالمغنی

پروفیسر عبدالمغنی ۴/جنوری ۱۹۳۶ء کوصوبہ بہار کے ضلع اورنگ آباد کے ذی علم سادات خاندان میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام قاضی عبدالرؤف ندوی تھا جو ایک عالم دین بھی تھے۔عبدالمغنی کی ابتدائی تعلیم مدرسہ اسلامیہ، اورنگ آباد میں ہوئی۔ پھر انہوں نے پٹنہ کے مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ میں داخلہ لیا، جہاں سے فاضل کی سند حاصل کی۔عربی وفارسی کی تعلیم سے فراغت کے بعد باضابطہ انگریزی کی تعلیم کی طرف مائل ہوئے۔آئی اے، بی اے اور ایم اے میں انگریزی ان کا خاص مضمون رہا ہے۔انہوں نے اپنا تحقیقی مقالہ "T.S. Eliots: Concept of Culture" پر لکھا تھا۔

۱۹۶۱ء میں شعبہ انگریزی، پٹنہ کالج میں لکچرر ہوئے۔ پھر ترقی کرتے ہوئے اس زبان کے ریڈر اور پروفیسر ہوئے۔انگریزی تعلیم اور تعلم سے وابستگی کے باوجود اردو کے فروغ میں لگے رہے۔انہیں اردو زبان سے بے حد محبت تھی اور اس کی ترقی کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ایک عرصے تک انجمن ترقی اردو، بہار کے صدر رہے۔ بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلانے والوں میں ان کی حیثیت مرکزی رہی ہے۔انگریزی زبان وادب سے گہرا شغف رکھنے والے پروفیسر عبدالمغنی کو عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔اسلامی تہذیب وتمدن اور ادب وثقافت کے ماننے والے تھے۔اسی لئے وہ مشرقی افکار کے نقاد کہے جاتے ہیں۔وہ انجمن ترقی اردو، بہار کے صدر بھی ہوئے۔

بنیادی طور پر عبدالمغنی مشرقی افکار کے نقاد ہیں۔اسلامی تہذیب وتمدن وثقافت سے ان کی اٹوٹ محبت انہیں آبجیکٹیو ہونے سے روکتی ہے۔لہٰذا وہ مغرب کے اعلیٰ سے اعلیٰ اور مستند سے مستند فن پاروں کو رد کرنے سے نہیں چوکتے۔کبھی کبھی کسی عظیم مغربی ادیب اور شاعر کو اپنے مطالعے کی روشنی میں اس طرح پیش کرتے ہیں جیسے وہ اردو

ادب کے دوسرے اور تیسرے درجے کا بھی فنکار نہیں، لیکن ان کی ایسی رائے زنی ان کے مشرقی مطالعات کا ثبوت بھی فراہم کرتی ہے۔ عبدالمغنی اپنے طرز کے انوکھے اور منفرد نقاد ہیں جن کے سوچنے اور سمجھنے کا انداز سبھوں سے الگ ہے۔

اردو افسانے پر ان کا ابتدائی مضمون، احتشام حسین کی تنقیدی نگاری پر ان کا مقالہ ان کی عظمت رفتہ کا پتہ دیتا ہے۔ اس کے بعد ہی وہ اقبالیات کے مطالعے میں غرق ہو گئے اور پے در پے متعدد ضخیم کتابیں منظر عام پر آنے لگیں۔ ایک طرف تو وہ اقبال کو دنیا کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کرتے ہیں تو دوسری طرف ہر نئی فنی روش کو یکسر رد کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے۔ کلیم الدین احمد نے ایک مضمون اور پھر ایک کتاب میں یہ ثابت کرنا چاہا کہ اقبال کا عالمی ادب میں کوئی مقام نہیں ہے۔ عبدالمغنی نے ایک ضخیم کتاب میں کلیم الدین احمد کے خیالات کو نہ صرف رد کیا بلکہ اقبال کو دنیا کا عظیم ترین فنکار ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

کہیں کہیں عبدالمغنی کی رائے وزنی معلوم ہوتی ہے، لیکن استدلال معدوم ہونے کی وجہ سے اثر قائم نہیں کرتی ہے۔ اس کی کتنی ہی مثالیں دی جا سکتی ہیں، لیکن مزاج کی افتاد میں غلو اور اغراق کا عنصر اس حد تک زیادہ ہے کہ بعض مباحث بیحد سطحی معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی مثال قرۃ العین حیدر پر ان کی ایک کتاب ہے جس پر موصوف نے قرۃ العین حیدر کو جیمس جوائس اور ورجینا وولف سے افضل بتایا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

> ''قرۃ العین حیدر جیمس جوائس سے تو ممتاز ہیں ہی، ورجینا وولف سے بھی ان کا امتیاز واضح ہے۔ دونوں انگریزی ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں کے مقابلے میں قرۃ العین کے تجربات وسیع اور متنوع ہیں۔ جوائس اور ورجینا کو زیادہ سے زیادہ براعظمی (Continental) کہا جا سکتا ہے۔ گرچہ اس میں بھی کھینچ تان کرنی ہوگی، لیکن قرۃ العین برصغیر ہند و پاک، بنگلہ دیش سے آگے بڑھ کر یورپ کی زندگی کو بھی اپنا موضوع بناتی ہیں اور بین الاقوامی سطح پر عصر حاضر کے متعدد مسائل کو مدنظر رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ ماضی سے حال تک وقت کا جو بسیط

احساس قرۃ العین کے یہاں ہے وہ انگریزی ناول وافسانہ نگاروں کے یہاں نہیں ملتا۔ اقدار حیات اور تہذیب انسانی کے ساتھ قرۃ العین حیدر کی وابستگی ورجینا اور جوائس سے زیادہ بہتر ہے۔ ترتیب ماجرا، بیان قصہ، تخلیق کردار میں بھی قرۃ العین کی ہنرمندی اور سلیقگی (کذا) زیادہ نمایاں ہے............ دورِاول کے جوائس کی چند تصویروں سے جو خیال انگیز فضا قرۃ العین پیدا کر دیتی ہیں وہ جوائس کے یہاں کمتر ہے جہاں تک فلسفیانہ تخیل اور عالمانہ واقفیت کا تعلق ہے جوائس اور ورجینا مل کر بھی قرۃ العین کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتے۔ قرۃ العین نہ صرف ایک عظیم الشان تہذیب کی مرقع نگار ہیں بلکہ براعظم کی جنگ آزادی اوراس کے نتائج کی روداد نویس بھی۔'' (۳۰)

عبدالمغنی کی کتابوں میں سے ان کا ذکر ضروری ہے، جن میں فکشن کے تعلق سے ان کے مقالات سامنے آئے ہیں۔ ''جادۂ اعتدال'' (۱۹۷۲ء) موصوف کے دوسرے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اکیس تنقیدی مقالات میں سے تین مقالے فکشن پر ہیں۔ اختر اورینوی کی افسانہ نگاری، علی عباس حسینی کی افسانہ نگاری اور شین مظفر پوری کی افسانہ نگاری۔ یہ سبھی مضامین اپنی نوعیت کی منفرد تحریریں ہیں۔

۲۴۸ صفحات پر مشتمل متفرق مضامین مختلف اوصاف ادب سے تعلق رکھنے والی عبدالمغنی کی کتاب ''تنقیدی زاویے'' کے نام سے سن ۱۹۹۳ء میں آصف پبلی کیشنز علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ کتاب میں شامل سات مضامین اردو فکشن کے بڑے فنکاروں کے فن پر ان کی گہری نگاہ اور تیز مشاہدے کو پیش کرتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر: ایک منفرد فنکار، چاندنی بیگم، قاضی عبدالغفار بحیثیت ادیب، لہو کے پھول: ایک تنقیدی مطالعہ، غلام عباس کی فنکاری، کشمیری لال ذاکر کی ناول نگاری اور آدھے چاند کی رات جیسے مضامین فکشن کی تنقید میں اضافہ کا حصہ بنتے ہیں۔

''قرۃ العین حیدر کا فن'' (۱۹۹۱ء) عبدالمغنی کی عمدہ تنقیدی کتابوں میں سے ایک ہے۔ انہوں نے یہ پوری کتاب قرۃ العین حیدر کے فکر وفن اور ان کی شخصیت کے لئے مختص کر دیا ہے۔ ''اختر اورینوی کے افسانے''

کے نام سے پروفیسر عبدالمغنی نے اختر اورینوی کے ہر زمانے کے عمدہ افسانوں کا انتخاب کیا ہے۔ اختر اورینوی کے بہترین اور عمدہ افسانوں کو ایک جگہ جمع کرنے کی سعی کار خیر کے مترادف ہے اور ہم جیسے طالب علموں کے لئے زادراہ بھی۔ عبدالمغنی نے کتاب کے شروع میں اختر اورینوی کی افسانہ نگاری کے عنوان سے ایک مبسوط مقدمہ تحریر کیا ہے۔ مقدمہ اختر اورینوی کے کم وبیش پوری زندگی اور ان کے فن کا احاطہ کرتا ہے۔ اس مضمون کے معتبر اور مستند ہونے کی مثال اس طور پر دی جاسکتی ہے کہ خود عبدالمغنی کے ذریعہ ۲۵/جولائی ۱۹۷۶ء کو انٹرویو کے درمیان جو بحثیں، تنقیدی اور ادبی تناظر میں ہوئی تھیں اس کا بھی ذکر انہوں نے کیا ہے۔ اختر اورینوی کی اشاریت (Symbolism) اور سریت (Mystification) کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے بعض افسانوں میں اشاریت تو پائی جاتی ہے، مگر وہ سریت سے مبرا ہیں۔

بنیادی طور پر پروفیسر عبدالمغنی مشرقی افکار کے نقاد ہیں۔ انہیں اکثر نقادوں کلیم الدین احمد کی ضد کہا ہے، لیکن کلیم الدین احمد کے یہاں تدلیلی انداز ہوتا ہے، عبدالمغنی زیادہ تر اپنی ذاتی رائے پر اعتبار کرتے ہیں جسے عام طور پر مدلل نہیں بناتے ہیں۔ انگریزی کے استاد ہوتے ہوئے بھی مشرقی افکار وخیالات کے پروردہ تھے۔ بہرحال مشرقی ادبیات سے ان کی اٹوٹ محبت انہیں بہرحال قابل احترام بناتی ہے۔ شبلی نعمانی، ابوالکلام آزاد اور ابوالاعلیٰ مودودی جیسی عبقری شخصیات سے متاثر تھے۔ ان کی خیالات وافکار کو پروفیسر عبدالمغنی نے تصنیف وتالیف کا ادبی جامہ پہنایا ہے۔ جس کا مطالعہ ان کے حق میں عمدہ خراج ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی انہی یادوں کے ساتھ ۵ ستمبر ۲۰۰۶ء کو اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔

☆☆☆

وہاب اشرفی

اردو میں ایسے نقاد، ادیب اور دانشور معدودے چند ہیں جنہیں ہمہ گیر شخصیت کی حیثیت سے ادبی وقار، مقبولیت اور شہرت حاصل ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی ان میں سے ایک ہیں۔ انہیں اردو ادب کی دنیا میں عہد ساز نقاد، محقق، افسانہ نگار، صحافی، استاد اور دانشور جیسی مختلف حیثیتوں سے اعتبار حاصل ہے۔ اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور اور مشرقی ومغربی ادبی تصورات، خیالات اور شعریات کے رمز شناس وہاب اشرفی بنیادی طور پر اکیڈمیشن اور دانشور ہیں، مگر ان کی ادبی مصروفیات متنوع قسم کی ہیں۔ انہوں نے اپنا ادبی کینوس بہت وسیع رکھا اور ان وادیوں میں بھی قدم رکھا ہے جہاں افراد ہی نہیں اداروں کے حوصلے بھی پست ہو جاتے ہیں۔ قاموسی پروجیکٹ ''تاریخ ادبیات عالم'' کی سات جلدیں اور ''تاریخ ادب اردو'' کی تین جلدیں اس کی واضح مثال ہیں۔

پروفیسر وہاب اشرفی کا پورا نام سید عبدالوہاب اشرفی ہے۔ آپ دو جون ۱۹۳۶ء کو صوبہ بہار کے ضلع جہان آباد کے ایک مردم خیز اور علم پرور قصبہ بی بی پور (کاکو) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا اسم گرامی سید شاہ حاجی امام الدین اشرف ہے جن کا سلسلہ نسب حضرت صوفی جہانگیر اشرف سمنانی علیہ الرحمہ تک جا ملتا ہے۔ آپ اپنے عہد کے اہم صوفی تھے اور والدہ کا نام سیدہ تسلیما ہے جو حضرت تاج فقیہ کے سلسلے سے تعلق رکھتی تھیں۔

وہاب اشرفی نے اپنی ابتدائی تعلیم گاؤں بی بی پور میں حاصل کی اس کے بعد بڑے بھائی سید عبدالجبار اشرفی کے ساتھ کلکتہ چلے گئے اور وہیں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ تقسیم ہند کے سانحے کے بعد لاکھوں لوگوں کی طرح انہیں بھی اپنے بھائی کے ساتھ ڈھاکہ منتقل ہونا پڑا۔ وہیں انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور کالج میں بھی داخلہ لیا، مگر سیاسی خلفشار کے باعث پھر واپس کلکتہ آ گئے۔ انہوں نے نامساعد حالات اور ملازمت سے انسلاک کے باوجود تعلیم کا حصول ترک نہیں کیا اور بہار یونیورسٹی سے ۱۹۶۰ء، ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۴ء میں بالترتیب انگریزی،

اردواور فارسی میں امتیازی پوزیشن کے ساتھ ایم۔اے کیا۔

۱۹۶۸ء میں بہار یونیورسٹی سے ہی ''اردو نثر کے ارتقا میں شاد عظیم آبادی کا حصہ'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یہ مقالہ ۱۹۷۵ء میں کتابی صورت میں شائع ہو کر مقبول ہو چکا ہے۔اس درمیان ۱۹۵۸ء میں آپ کی شادی نسیمہ خاتون بنت سید محمد شعیب صاحب سے ہوئی جن سے چار بیٹے تولد ہوئے۔سید شکیل اشرفی، سید افروز اشرفی، سید انجم اشرفی اور سید شہیر اشرفی۔ یہ چاروں مختلف شعبوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز کامیاب و مسرور زندگی گزار رہے ہیں۔

وہاب اشرفی نے ملازمت کا آغاز صحافی کی حیثیت سے کیا اور چند سال کلکتہ کے مشہور اخبارات عصر جدید، الحق، اخوت وغیرہ سے وابستہ رہے۔۱۹۵۸ء میں لائف انشورنس کارپوریشن میں اسسٹنٹ ڈی۔او کی حیثیت سے پٹنہ میں جوائن کیا، مگر ملازمت مزاج کے خلاف ہونے کی وجہ سے ۱۹۶۴ء میں استعفیٰ دے دیا۔۳؍ستمبر ۱۹۶۹ء کو موصوف کا تقرر مگدھ یونیورسٹی کے معروف کالج، گیا میں اردو کے لکچرر کے عہدے پر ہو گیا، جہاں سے انہوں نے باضابطہ تدریسی خدمات انجام دینا شروع کیا اور پوسٹ گریجویٹ شعبے سے ہوتے ہوئے رانچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں صدر کے عہدے تک کا سفر مکمل کیا۔رانچی یونیورسٹی کا شعبہ اردو ان کے عہد سربراہی میں صوبہ بہار و جھارکھنڈ کا منفرد و ممتاز ادبی و علمی مرکز بن کر ابھرا۔رانچی یونیورسٹی سے سبکدوش ہونے میں ابھی دو سال کی مدت باقی تھی کہ حکومت بہار نے موصوف کو مارچ ۱۹۹۴ء میں بہار اسٹیٹ یونیورسٹی سروس کمیشن کے چیئرمین کے منصب پر فائز کیا۔ یہاں کے منصب پر فائز کیا۔ یہاں آپ ۱۹۹۸ء تک رہے اور اس درمیان انہوں نے ایک سو سے زیادہ پرنسپلوں کا تقرر کیا اور تقریباً چودہ سو مختلف مضامین کے لکچرروں کا تقرر بھی کیا۔

ان عہدوں کے علاوہ کثیر تعداد میں لکچرر کو ریڈر اور پھر ریڈر سے پروفیسر کے عہدے پر پروموٹ کیا۔ یونیورسٹی سروس کمیشن کی چیئرمین شپ کی مدت ختم ہونے کے فوراً بعد حکومت بہار نے انہیں بہار انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کونسل کے چیئرمین کے عہدے کے لئے منتخب کر لیا۔آپ ۱۹۹۸ء سے ۲۰۰۲ء تک اس عہدے پر فائز رہے اور اپنی فکری و انتظامی صلاحیتوں کا بہترین مظاہرہ کرتے ہوئے کاؤنسل سطح کے تعلیمی نظام نیز امتحانات کے معیار و وقار کو خوب سے خوب تر بنانے کی سعی مشکور کی اور اپنی اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی انجام دیا۔ وہاں سے سبکدوش

ہونے کے بعد مکمل طور پر اردو زبان وادب اور تحقیق وتنقید کی خدمت میں مصروف عمل رہے۔

ان فرائض کی ادائیگی کے دوران آپ نے بین الاقوامی طور پر جانے مانے اردو رائٹر، منفرد نقاد، محقق، ایڈیٹر اور دانشور کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کرلی تھی۔ اردو میں مابعد جدیدیت کے اہم علمبرداروں میں شمار کئے جاتے تھے۔ دودرجن سے زائد کتابیں بھی ہیں اور کئی رسائل کی ادارت سے انہوں نے اپنی صحافتی انفرادیت کا لوہا بھی منوایا۔ انہوں نے ۱۹۵۹ء میں ہی ایک ماہنامہ ''صنم'' جاری کیا، جوتقریباً پانچ برسوں تک نکلتا رہا اور اس مختصر سی مدت میں اس نے نہ صرف بے انتہا مقبولیت حاصل کی بلکہ دو اہم شمارے ''بہار نمبر'' اور ''افسانہ نمبر'' کے نام سے نکالے جو یادگار اور تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ شعبہ اردو رانچی یونیورسٹی سے بھی آپ نے ایک مجلّہ ''نئی قدریں'' نکالا تھا جو آج بھی جدید ادب کی تفہیم میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ پٹنہ سے سہ ماہی ''مباحثہ'' نکالا۔ اس رسالے نے اردو رسائل میں ایک منفرد شناخت قائم کرلی تھی، بالخصوص نئی نسل کا یہ ہر دلعزیز رسالہ تھا۔

وہاب اشرفی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ایک تخلیق کار کی حیثیت سے کیا۔ پہلے تو غزلیں اور نظمیں لکھیں، مگر بہت جلد افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوگئے اور افسانہ نگاری میں بہت کامیاب بھی ہوئے۔ لیکن کچھ ایسے حادثات پیش آگئے کہ موصوف تخلیق سے تنقید کی طرف پوری طرح متوجہ ہوگئے۔ اس سلسلے میں ان کا بیان سنئے:

> ''میں ابتدا میں افسانے لکھتا تھا۔ اتنے افسانے ہوچکے تھے کہ ایک مجموعہ مرتب کیا جاتا، لیکن ایک صاحب کو افسانوں کے تراشے دیئے اور وہ مشرقی پاکستان تراشوں کے ساتھ ہجرت کرگئے۔ ہندوپاک میں شائع افسانوں کو دوبارہ جمع کرنا میرے لئے محال ہے۔ اس حادثے کے بہت گہرے اثرات پڑے، ایک عرصہ تک افسانے نہیں لکھے۔ آخری افسانہ اس وقت لکھا جب جدیدیت کی تحریک جڑ پکڑ چکی تھی اور اشاعت کے لئے 'شب خون' میں بھیج دیا۔ وہ شائع تو ہوا مگر اس رسالے کے آخری صفحات میں۔ ایک اور صدمہ ہوا اور میں نے افسانہ نگاری ترک کردی۔ جہاں تک تنقید کا معاملہ ہے میں نے شاید بی اے کے زمانے میں ہی کلکتہ میں تابان القادری پر ایک مضمون

لکھا تھا جو مسلمان ڈو گلے صاحب کی کتاب ’نقوش تاباں‘ میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ کلکتہ کالج میگزین میں بیخود کلکتوی پر ایک مضمون لکھا تھا جو ابھی حال میں شائع ہونے والے بیخود نمبر میں بھی شامل کیا گیا ہے۔‘‘ (۳۱)

گویا زمانۂ طالب علمی سے جس صنف کی طرف کم توجہ دی وہی ان کا مقدر ٹھہری۔ اسی لئے اُن کی پہلی تصنیف تنقید کی صورت میں ہی منظر عام پر آئی جس کا نام تھا ’’قطب مشتری: ایک تنقیدی جائزہ‘‘ (۱۹۶۷ء)۔ اس کتاب میں انہوں نے ملا وجہی کی مثنوی کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل گفتگو کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہاب اشرفی کی اس تنقیدی کاوش کو پزیرائی حاصل ہوئی اور انہوں نے سنجیدگی کے ساتھ اس بات کا تہیہ کرلیا کہ آئندہ تنقید کے ذریعہ ہی وہ اپنے محسوسات کو گویائی عطا کریں گے۔

وہاب اشرفی کی دوسری تنقیدی کتاب ’’قدیم ادبی تنقید‘‘ (۱۹۷۳ء) ہے جس میں انہوں نے مغرب کے پانچ قدیم نقادوں ارسطو، افلاطون، ہوریس، کوئن، پٹلین اور لانجائنس کو اپنی گفتگو کا موضوع بنایا ہے۔ یہ کتاب خاص اہمیت کی حامل اس لئے ہے کہ موصوف نے نہ صرف ان قدیم نقادوں کے تنقیدی خیالات سے ہمیں آشنا کرانے کی کوشش کی ہے بلکہ اُن کے خیالات کے حوالے سے اپنے تنقیدی تاثرات بھی قلمبند کئے ہیں۔ ’’معنیٰ کی تلاش‘‘ (۱۹۷۸ء) وہاب اشرفی کے ان تنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے جو ملک کے معتبر رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے تھے۔ اس کا ایک مضمون ’’افسانے کا منصب‘‘ جو قدرے طویل ہے اور مسلسل موضوع بحث رہا، موضوع سے پوری طرح انصاف کرتا ہے۔

’’مثنویات میر کا تنقیدی جائزہ‘‘ (۱۹۸۱ء) بھی آپ کی اہم کتاب ہے جس میں بڑی سختی سے میرؔ کی مثنویوں کا احتساب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ انہوں نے واضح طور پر مثنویات میرؔ کی خامیاں اجاگر کی ہیں اور اردو شاعری کے ایک عظیم و معتبر شاعر پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان کا قلم مصلحت اور جانبداری سے پوری طرح محفوظ رہا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی ’’مثنوی اور مثنویات‘‘ (۱۹۸۲ء) ہے جس میں وہاب اشرفی نے اردو کی معروف مثنویات کے ساتھ ہی غیر معروف مثنویات کے متعلق بھی بنیادی معلومات فراہم کردی ہیں۔

’’کاشف الحقائق‘‘ امداد امام اثر کی ایک معرکتہ الآرا تصنیف ہے۔ اسے وہاب اشرفی نے ۱۹۸۲ء میں

تدوین کے جدید اصولوں کی روشنی میں مدون کیا اور ایک مبسوط مقدمہ لکھ کر اس کی اہمیت واضح کی۔ انہوں نے ''کاشف الحقائق: ایک مطالعہ'' لکھ کر امداد امام اثر کی جانب بہ طور خاص لوگوں کی توجہ دلائی اور اس کے مثبت و منفی پہلوؤں پر غیر جانبدارانہ روشنی ڈالی۔

۱۹۸۲ء ہی میں ان کی ایک اہم کتاب ''سہیل عظیم آبادی اور ان کے افسانے'' بھی منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب فکشن کی تنقید میں خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ اپنے ہم عصروں پہ لکھنا بہت پیچیدہ مرحلہ ہے۔ وہاب اشرفی بھی اپنے ہم عصر، لیکن بزرگ ساتھی کے افسانوں پر لکھتے ہوئے وہ بے باکی اور غیر جانبداری نہیں دکھا سکے جو ان کی دوسری کتابوں میں دکھائی دیتی ہے۔ اس میں سہیل عظیم آبادی کے نمائندہ افسانوں مثلاً الاؤ، جینے کے لئے، سادھو اور بیسوا اور بدصورت لڑکی وغیرہ کا تجزیہ کرتے ہوئے انہوں نے متن کی روح میں اترنے کی کوشش کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ سہیل کا فن پریم چند سے مختلف تھا۔

''اردو فکشن اور تیسری آنکھ'' (۱۹۹۵ء) تنقیدی مضامین کا تیسرا مجموعہ ہے جس میں شامل مضامین فکشن سے متعلق وہاب اشرفی کے نقطہ نظر کو واضح کرتے ہیں۔ انہوں نے اس میں فکشن کے بنیاد گزاروں کے ساتھ معاصرین فن کاروں کا بھی جائزہ لیا ہے اور خاص طور سے تقابلی نگاہ ڈالتے ہوئے معاصر فکشن کے امتیازات واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

مضامین کا مجموعہ ''معنی سے مصافحہ'' (۲۰۰۵ء) اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں جہاں ایک طرف سودا اور غالب سے علقمہ شبلی تک کی شاعری پر مضامین ہیں اور قدیم و جدید شعری منظرنامے کا احوال بیان کرتے ہیں وہیں معاصر فکشن کے نمائندہ لکھنے والوں مثلاً جیلانی بانو، احمد یوسف، عبدالصمد، شوکت حیات، شموئل احمد، جابر حسین اور محمود واجد وغیرہ کے فن کا بھی بے باکی سے احاطہ کرتے ہیں۔ اس کتاب کے بعض مضامین بحث طلب ہیں اور ڈسکورس کی فضا قائم کرتے ہیں۔

وہاب اشرفی کی علمی شخصیت کے کئی پہلو تھے۔ وہ ایک ساتھ ناقد، محقق اور تاریخ ادبیات کے ماہر کی حیثیت سے بھی اپنی شناخت قائم کر چکے تھے۔ ان تینوں حصوں میں مختلف ذیلی حصے ہیں لیکن ان کی بنیادی حیثیت ایک ''نقاد'' کی ہے۔ وہاب اشرفی کا اسلوب انتہائی واضح، پیرایۂ اظہار بے حد سلیس، چھوٹے چھوٹے جملوں اور

فقروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس طرح ان کی نثر ایک شاعرانہ شیفتگی کا نقش نظر آتی ہے جو قاری کو اسیر کر لیتی ہے۔ بیان میں کوئی ابہام نہیں کوئی الجھاؤ نہیں۔ ان کے اسلوب میں پختگی اور ادبی رچاؤ ہے جس کے پس منظر میں مطالعہ کی وسعت اور تجربہ کی حدت محسوس کی جاسکتی ہے۔

مذکورہ حقائق کی روشنی میں یہ اعتراف کرنا چاہئے کہ وہاب اشرفی ہمارے عہد کے ایک قدآور نقاد تھے۔ خصوصاً فکشن کی تنقید میں انھوں نے جو کارنامے انجام دیئے ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ ان کی تحریریں اردو تنقید کو کئی جہت سے آشنا کرتی ہیں اور جن کی شخصیت قلم کاروں، فن کاروں اور قائین کو تفہیم ادب کا نیا شعور بخشتے ہوئے انہیں اپنا دوست ہمدرد اور ہم نوا بناتی چلی جاتی ہے۔ انہی ساری یادوں کے ساتھ وہاب اشرفی کا سانحہ ارتحال ۲۰۱۵ء میں ہوگیا۔

☆☆☆

یوسف سرمست

ان کا اصلی نام یوسف شریف الدین ہے، لیکن یوسف سرمست کے قلمی نام سے معروف ہوئے۔ ان کے والد سید قادرالدین تمکین سرمست تھے۔ ان کی پیدائش ۲۸ دسمبر ۱۹۳۶ء حیدرآباد میں ہوئی۔ انہوں نے جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد سے بی اے، ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ۱۹۶۳ء میں وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں لکچرر ہوئے، یہیں ریڈر اور صدر شعبہ اردو بھی رہے اور یہیں سے سبکدوش بھی ہوئے۔ یوسف سرمست کی موت ۲۰۱۹ء میں ہوگئی۔

یوسف سرمست نے پہلا مضمون اس وقت لکھا جب وہ ایم اے فائنل میں تھے۔ اسی زمانہ میں انہوں نے مصحفی پر بھی ایک مضمون قلمبند کیا تھا۔ اس کے بعد وہ مسلسل مضامین لکھتے رہے۔ ''صبا'' اور پاکستان کے بعض رسالوں میں ان کے اہم مضامین شائع ہوئے ہیں، لیکن انہیں شہرت ان کی کتاب ''بیسویں صدی میں اردو ناول'' سے ملی۔ یہ دراصل ان کی پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ تب سے اب تک کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں جیسے ''عرفان نظر''، ''ادب کی ماہیئت، منصب اور تاریخ''، ''پریم چند کی ناول نگاری''، ''تحقیق وتنقید''، ''نظری اور عملی تنقید'' اور ''دکنی ادب کی مختصر تاریخ''، لیکن ان تمام مختلف موضوعات کے باوجود یوسف سرمست ایک فکشن کے نقاد کے طور پر اہم سمجھے جاتے ہیں۔

پریم چند کی ناول نگاری پر ان کی کتاب غیراہم نہیں ہے حالانکہ اس موضوع پر دوسری کتابیں بھی ہیں اور شاید زیادہ وقیع ہیں۔ موصوف نے ادب کے بعض مسائل کی تفہیم کا رول بھی انجام دیا ہے۔ وہ اس کی ماہیئت اور منصب سے بحث کرتے ہوئے ان کے بعض گوشوں کو روشن کرتے ہیں۔ اس طرح نظری اور عملی تنقید کے بعض اہم نکات زیر بحث لاتے ہیں۔

یوسف سرمست میرے نقطہ نظر سے صرف اردو فکشن کے نقاد نہیں انہوں نے دوسرے موضوعات پر بھی بڑی دیدہ ریزی سے اپنے خیالات واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔دیگر موضوعات سے قطع نظر ان کی کتاب ''بیسویں صدی میں اردو ناول'' پر گفتگو مقصود ہے۔

زیر مطالعہ کتاب اصل میں یوسف سرمست کا تحقیقی مقالہ ہے۔موصوف نے اسے سات ابواب پس منظر، بیسویں صدی کا شعور، ربع اول، پریم چند: ایک عہد، ربع ثانی کے ابتدائی دس سال، ترقی پسند تحریک، نصف صدی کے آخری تین سال کی ناول نگاری جیسے ابواب میں منقسم کیا ہے۔خود یوسف سرمست اپنی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''بیسویں صدی میں اردو ناول کے ارتقا پر اب تک کوئی اہم تنقیدی اور تحقیقی کام نہیں ہوا ہے حالانکہ یہی اردو ناول کے شباب کا زمانہ ہے اور اسی عہد میں اردو ناول عالمی ادب کی تحریکات سے متاثر ہوا ہے اور اس نے فکر و فن کی کئی منزلیں طے کی ہیں۔اسی لئے اس کتاب میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اردو ناول نے بیسویں صدی کے ابتدائی پانچ دہوں میں جو ارتقائی منزلیں طے کی ہیں۔ان کا مکمل طور پر تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا جائے۔''(۳۲)

بیسویں صدی میں اردو ناو لکے ارتقا پر انھوں نے جو مقالہ لکھا ہیا س میں ان کا انداز منفرد اور جدا گانہ ہے۔ وہ اس میں پہلے کسی نئی اصطلاح کی نشاندہی کرتے ہیں، پھر مختصراً اس کی وضاحت کرتے ہیں اور ثبوت کے لیے مثالیں فراہم کرتے ہیں۔ یہ مثالیں یوروپی ادب سے بھی ہوتی ہیں اور مشرقی ادب سے بھی۔ مگر خوبیوں کے ساتھ کمزوریوں کی نشاندہی سے بھی نہیں چوکتے اور نہ اپنا توازن کھوتے ہیں۔سنجیدگی، متانت اور اعتدال کے ساتھ اپنی بات پیش کرتے ہیں اور اس انداز سے کہ اس سے نہ کسی کو تکلیف ہو اور نہ مضمون نگار کے اندر احساس برتری پیدا ہو۔

بہر حال وہ ناولوں میں تجربات کی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے شعور کی رو کا ذکر کرتے ہیں، پھر سرریلزم سے اس کے رشتے کی وضاحت کرتے ہیں۔انھیں اس بات کا احساس ہے کہ اردو میں شعور کی رو

پر بہت بحثیں ہوئی ہیں اور ہوتی رہیں گی لیکن انھیں شبہ بھی ہے کہ اردو میں کم ہی ناول اس تکنیک پر پورے اترتے ہیں۔ یہاں ان کی احتسابی نگاہ سخت معلوم ہوتی ہے۔لیکن اسے ان کے تنقیدی رویے کی شدت پر محمول کرنا غلط ہوگا۔ وہ تو محض امر واقعہ سے آگاہ کرنا اپنا فریضہ منصبی سمجھتے ہیں اور خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کر دیتے ہیں۔تاکہ حقیقی صورت حال سامنے آجائے۔

البتہ وہ اردو ناولوں کے ذخیروں سے مایوس نہیں ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اردو میں ناول اور افسانے آج بھی کثیر تعداد میں لکھے جا رہے ہیں۔ان میں کچھ تو فن کی کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں لیکن کچھ چل چلاؤ اور سہل پسندی کے ساتھ لکھے جا رہے ہیں۔لیکن اس سے ناول کی عظمت میں کوئی کمی نہیں آتی ہے۔آج کے بدلتے دور اور تیور سے اندازہ ہوتا ہے کہ مستقبل میں نجی اور ذاتی کوائف کے اظہار کے لیے سب سے موثر ذریعہ ناول ہی قرار پائے گا۔غرض انھوں نے فکشن کی تنقید خصوصاً ناول کی تنقید کے لیے جو کچھ لکھا گیا ہے وہ انھیں تنقید کی دنیا میں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

☆☆☆

قدوس جاوید

قدوس جاوید عصر حاضر کے معتبر نقادوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ان کا اصلی نام بھی یہی ہے ان کے والد کا نام کلیم الدین احمد تھا۔قدوس جاوید اپنے آبائی وطن رانچی (جھارکھنڈ) میں ۱۹۴۷ء میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم اسی شہر میں ہوئی۔اسی شہر سے میٹرک کے بعد آئی۔اے اور بی۔اے ہوئے، لیکن ایم۔اے اردو کی تعلیم کے لئے پٹنہ چلے آئے اور پٹنہ یونیورسٹی سے ایم۔اے ہوئے اس کے بعد ''۱۹۴۷ء کے بعد اردو افسانے'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ کر ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند حاصل کی۔

تحصیل علم کے بعد کشمیر یونیورسٹی سری نگر میں لکچرر، ریڈر اور پروفیسر ہوگئے۔ایک زمانے سے شعروادب سے تعلق رہا ہے۔تنقید نگاری کی طرف ان کا غالب رجحان ہے اور ۱۹۶۶ء سے ہندوستان کے موقر رسالوں میں مختلف ادبی موضوعات پر مضامین لکھتے رہے ہیں۔ان کے تقریباً دو سو مضامین مختلف جرائد و رسائل میں بکھرے پڑے ہیں۔

موصوف نے ادبی رموز کو زندگی کی تعبیرات کے آئینے میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ان کی پہلی کتاب ''ادب اور سماجیات'' ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی۔اس کتاب سے بھی ان کا نقطہ نظر واضح ہوتا ہے سماجی احوال و کوائف سے ادب کا کس طور کا رشتہ ہوسکتا ہے۔اس پر انہوں نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، لیکن ان کا خیال یہ بھی ہے کہ سماجیات کے حوالے سے فن کو بالائے طاق رکھنے کا جواز نہیں۔اس کا احساس ان کی دوسری کتاب ''شعر نثر آہنگ'' کے مطالعے سے ہوتا ہے۔اس میں شعر کی کیفیت اور نثری امور نیز آہنگ پر جدید تصورات کے تحت بحث ملتی ہے، اس لحاظ سے اس کی ادبی اہمیت ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ترقی پسندی سے حالیہ ادب کے نشیب و فراز پر یعنی میلانات اور رجحانات پر ان کی نگاہ

رہی ہے۔ لہٰذا وہ کہیں رُکتے نظر نہیں آتے اور جدید سے جدید تر رویوں کی خبر رکھتے ہیں۔ ادھر انہوں نے مابعد جدیدیت کے تصورات سے گہری دلچسپی لی ہے اور اب تک ان کے ساتھ وقیع مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ بعض بے حد طویل ہیں۔ مابعد جدید افسانے پر بھی انہوں نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ ایک طویل مضمون ہے جو دو حصوں میں شائع ہو چکا ہے۔ جمالیات سے ان کا بطور خاص رشتہ رہا ہے اور ادب میں اس کے کیف و کم کی تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی ایک کتاب ''اقبال کی جمالیات'' ہے۔ اس کی عقبی زمین میں محسوس کیا جا سکتا ہے کہ زندگی، سماج اور ادب کے رشتے میں وہ فنی رموز و نکات کو کیسی اہمیت دیتے ہیں۔ ''اقبال کی جمالیات'' ان کی قابل مطالعہ کتاب ہے جس سے ان کے اپنے تنقیدی شعور کا بھی پتہ چلتا ہے۔

قدوس جاوید کا تحقیقی مقالہ کتابی صورت میں ''جدید اردو افسانہ'' کے نام سے شائع ہوا۔ ان کا یہ تحقیقی مقالہ گراں قدر اہمیت کا حامل ہے۔ ''تقسیم ملک فسادات اور افسانہ'' اور ''آخر شب کے ہم سفر اور سماجی شعور'' بھی ان کی اہم کتابیں ہیں۔ انہیں اردو ناول نگاروں اور افسانہ نگاورں کے علاوہ بنگالی زبان و ادب کے معروف و مقبول فکشن رائٹر شرت چند چٹر جی اور ٹیگور کی کہانیوں کا جائزہ بھی بڑے خوبصورت انداز میں لیا ہے۔ دراصل ایک ہی زمانے کے تین مشہور کہانی کار ''پریم چند'' (۱۹۳۶ء-۱۹۸۰ء) ''شرت چند چٹر جی'' (۱۹۳۸ء-۱۸۷۶ء) اور ٹیگور (۱۹۴۱ء-۱۹۶۱ء) نے کم و بیش ہندوستان کی دیہی زندگی کی عکاسی بڑی خوبی کے ساتھ کی ہے۔ اس تعلق سے قدوس جاوید لکھتے ہیں:

> ''پریم چند، شرت چندر اور ٹیگور تینوں نے ہی اپنے عہد کی زندگی کی تلخ کامیوں اور کرب انگیزیوں کو بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر جھیل کر اپنے غور و فکر، مطالعہ و محاسبہ کی رہ نمائی میں ایسے ادب کی تخلیق کی جو عصری شعور و آگہی سے کچھ اس طرح رشتہ و پیوستہ ہے کہ ان کی تخلیقات کو سامنے رکھ کر انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے نصف اول کو سماجی و سیاسی اور معاشی و تہذیبی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔'' (۳۳)

''متن، معنی اور تھیوری'' کے نام سے پروفیسر موصوف کی کتاب ۲۰۱۵ء میں ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

نے شائع کی ہے۔اس میں شامل مضمون ''افسانے کی شعریات'' میں اردو افسانہ کی ابتداء سے لے کر اکیسویں صدی کی پہلی دہائی تک کے اسرار و رموز کا احاطہ کرتا ہے اور افسانے کی شعریات طے کرتا ہے۔ بقول وہاب اشرفی:

> ''قدوس جاوید کا ذہن جامد نہیں۔ وہ عہد بہ عہد ادبیات کے پیچ و خم کی خبر رکھنا چاہتے ہیں۔'' (۳۴)

قدوس جاوید مغربی ادب کا مطالعہ بھی خوب کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کا ادبی شعور پختہ ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید کشمیر میں مقیم ہیں اور وہ آج بھی پڑھنے لکھنے میں منہمک ہیں۔ میں امید کرتی ہوں کہ یہ قندیل ادب تا دیر تلک روشن رہے گا۔ان کی کتاب ''جدید اردو افسانہ'' فکشن کی تنقید میں بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔اس میں انھوں نے جو انداز اختیار کیا ہے وہ دراصل نئی تنقید کا خاصا ہے۔تنقید و تجزیہ کے لیے متن پر نگاہ اور اس کے فنی اور جمالیاتی پہلوؤں کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ بالخصوص لفظوں کے تخلیقی و جدلیاتی استعمال سریت، علامت، استعارہ اور پیکر تراشی جیسے شاعرانہ پہلوؤں کی تلاش ان کی افسانے کی تنقید کا محور و مرکز بنی رہی ہے۔

ان کا یہ تخلیقی مقالہ جو کہ بعد میں کتابی صورتمیں شائع ہوا جدید اردو افسانہ کی فکری و فنی جہتوں کی افہام و تفہیم کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔اس کو فکشن کی تنقید میں ایک اضافہ تصور کیا جانا چاہیے۔انھوں نے جدید افسانوں کے تجزیے اور تحلیل کے ذریعہ جدید افسانے کی تفہیم کی جو کوشش کی ہیوہ قابل قدر ہے۔ان کے تجزیاتی ذہن، منطقی و استدلالی انداز اور استنباط و استخراج نتایج کی بھرپور صلاحیت نے جدید اردو افسانے کو قارئین کے لیے قابل فہم بنا دیا ہے۔ان کا خیال ہے کہ فنی لحاظ سے افسانے کے واضح خد و خال کچھ بھی نہیں ہیں۔ نہ اس کے لیے سپاٹ سیدھی سادی کہانی کی ضرورت ہے اور نہ ہی باضابطہ ماجرا کی۔ بلکہ افسانوں کی تہ میں اترنے اور اس میں پوشیدہ تہ در تہ مضامین کو سمجھنے کے لیے افسانہ نگار کے درون میں اترنے کی سخت ضرورت ہے۔اس کے بغیر جدید افسانوں کا تجزیہ محال ہے۔

☆☆☆

مرزا حامد بیگ

مرزا حامد بیگ اردو ادب کے مایہ ناز ادیب، معتبر نقاد و محقق افسانہ نگار اور ناول نگار ہیں۔ان کی پیدائش ۲۹، اگست ۱۹۴۹ء کو کراچی، پاکستان میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم و اسکولی تعلیم سندھ سے حاصل کی۔۱۹۷۲ء میں ایم اے امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور فلمی دنیا میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے طور پر کام کرنے لگے۔اسی اثنا میں اورینٹل کالج، لاہور اور جامعہ پنجاب میں بطور لکچرر (اردو) اپنی خدمات دینے لگے اور تحقیقی مقالہ بھی لکھتے رہے۔۱۹۸۶ء میں انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی۔

مرزا حامد بیک وقت مختلف جہتوں پر کام کرتے نظر آتے ہیں۔وہ ایک ہی وقت میں ناول نگار، افسانہ نگار، محقق اور ادبی تنقید نگار کی حیثیت سے معروف ہیں۔ترجمے سے بھی گہری دلچسپی ہے اس لئے ان کی دلچسپیاں متنوع رہی ہیں، لیکن افسانے کی تنقید میں ان کا خاص طریقے سے نام آتا رہا ہے۔ان کا بہت اہم رول رہا ہے۔

یوں تو مرزا حامد بیگ کا ادبی سفر افسانہ نگاری سے شروع ہوا ہے۔ان کی افسانہ نگاری ایک خاص اسلوب وترکیب کی پروردہ ہے جو پرانے اسلوب سے گریز کرتے ہوئے ایک ہی جملہ میں ایک ہی بات کہنے کا پرانا رویہ اختیار نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ ہر جملہ یکے بعد دیگرے کئی ایمیجز کے ساتھ ماحول کے کئی عناصر کو آگے بڑھاتا ہے۔ افسانے کے نقاد کی حیثیت سے حامد بیگ کی دو کتابیں ''اردو افسانے کی روایت'' اور ''افسانے کا منظر نامہ'' ان کی تنقید نگاری کے کیف کو نمایاں کرتی ہیں۔

ایک طرف تو وہ افسانہ کی عقبی زمین کو ایک خاص پس منظر میں دیکھتے ہیں تو دوسری طرف ''اردو افسانے کی روایت''، جو ۱۹۰۳ء سے ۱۹۹۰ء تک پر مشتمل ہے ایک اہم کتاب ہے۔یہ اردو افسانے کی ایسی جامع تاریخ ہے جس میں پرانا ڈھانچہ منہدم کر کے نیا منظر نامہ تشکیل پاتا دکھائی دیتا ہے۔صاحب کتاب نے اس کتاب میں اردو

کے اولین افسانہ نگاروں کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ اردو افسانے کے مختلف ادوار بھی قائم کئے ہیں۔کتاب کے پیش لفظ میں اکادمی ادبیات، پاکستان کے سکریٹری افتخار عارف رقمطراز ہیں:

> ''ممتاز افسانہ نگار اور صاحب نظر نقاد ڈاکٹر حامد بیگ کی کتاب 'اردو افسانے کی روایت' (۱۹۰۳ء تا ۱۹۹۰ء) ہماری اس اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے، جو اردو زبان کے مختصر افسانوی ادب سے متعلق اردو دنیا اور عالمی سطح پر محسوس کی جاتی ہے.......... یہ اردو افسانے کی ایک ایسی جامع تاریخ اور انتھالوجی ہے، جس میں محض رسمی اور اکتسابی تحقیق وتنقید پر اکتفانہیں کیا گیا۔نتیجے کے طور پر اس کتاب میں آپ کو پرانا تعمیر شدہ تحقیقی اور تنقیدی ڈھانچہ منہدم ہوتا اور نیا منظر نامہ تشکیل پاتا دکھائی دے گا۔'' (۳۵)

پروفیسر موصوف نے صوفیانہ ماحول اور صوفی ازم سے بھی متاثر ہیں۔ان کی دلچسپی صوفی ازم کے خدوکال سے رہی ہے وہ صوفی اور صوفیانہ عوامل کو تحقیقی نظر سے بھی دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ان کی کتاب ''ترجمہ کا فن'' ان کی عمدہ تجربات ومشاہدات کا نمونہ ہے۔ترجمے کی اہمیت وافادیت اور اس کی ضرورت پر روشنی ڈالی ہے۔اس کتاب میں کچھ تحقیقی کاوش بھی ملتی ہے۔

انہیں ہرفن مولا کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔کیونکہ خداداد صلاحیت کے مالک نابغہ ذہن پروفیسر موصوف جب سفرنامہ کی جانب رجوع ہوئے تو سفرنامے کی تاریخ قلمبند کردی۔گویا مرزا حامد بیگ ایک متنوع ادبی ذہن رکھتے ہیں اس ضمن میں ان کی ترجیحات کافی وسعت رکھتی ہیں۔حامد بیگ کئی اہم ادبی اعزازات سے بھی نوازے جاچکے ہیں۔ انہیں پاکستان رائٹرز گلڈ ایوارڈ (۱۹۸۴ء)، نیشنل بک کونسل آف پاکستان ایوارڈ دوبار (۹۳-۱۹۹۱ء) اور حکومت پاکستان کی طرف سے حسن کارکردگی پر تمغہ بھی مل چکا ہے۔

مرزا حامد بیگ کا شمار فکشن کے اہم ناقدین میں ہوتا ہے۔وہ کسی بھی فکشن پارے سے متعلق اپنی رائے اس وقت تک قائم نہیں کرتے جب تک کہ اس کے اطراف وجوانب کا بخوبی مطالعہ نہ کرلیں۔ان کا بنیادی اور ذیلی تنقیدی رجحان مماثل ہے۔کیوں کہ یہ ایک طرف افسانے کی سماجی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہیں اور اس کے موضوع،

کہانی اور کردار کو ہندوستانی سماج کے مطابق قرار دیتے ہیں تو دوسری طرف زبان و بیان اور اسلوبیات کو بھی خاصی اہمیت دیتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تنقید میں بت شکنی کی روایت قائم نہیں کی بلکہ نہایت سنجیدگی سے مدلل انداز میں اردو افسانوں کے تجزیے کیے ہیں جوان کی زندہ دلی اور نرم مزاجی کے آئینہ دار ہیں۔

انھوں نے اپنی کتاب میں افسانوں کی تنقید اور تجزیے کے وقت زیادہ تر مشرقی اصول تنقید اور مشرقی ناقدین کی آرا سے استفادہ کیا ہے لیکن کہیں کہیں مغربی حوالے بھی مل جاتے ہیں جو بہت زیادہ نہیں ہیں۔ وہ افسانے کی دنیا اور اس کے کردار کو غیر حقیقی اور ماورائی ماننے کو تیار نہیں ہیں اور افسانہ نگار سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے قارئین کو ہر واقعہ اور حادثہ سے آگاہ کرے۔ انھوں نے افسانے کے موضوعات، کردار، طرز بیان اور تکنیک کا جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے افسانے کے فلسفے کو تکنیک کے ذیل میں سمجھا ہے اور تکنیک پر کم اور اس کی فکر کی زیادہ نمائندگی کی ہے۔ یہی وہ نقطہ امتیاز ہے جوان کو ان کے ہم عصروں سے ممتاز کرتا ہے۔

☆☆☆

علی احمد فاطمی

ترقی پسند تحریک کا ایک فعال، متحرک اور معتبر نام علی احمد فاطمی ہے۔ وہ ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ ہیں جہاں علم وادب کی قندیلیں پہلے سے روشن تھیں خصوصاً ان کی والدہ عابدہ خاتون جونپور کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ پروفیسر علی احمد فاطمی کی پیدائش ضلع الہ آباد کے موضع لال گنج کے ایک سادات گھرانے میں یکم جنوری ۱۹۵۴ء کو ہوئی۔ ان کے والد علی شیر فاطمی عربی و فارسی کے علم دوست تھے ساتھ ہی حکمت اور شاعری سے گہرا شغف رکھتے تھے۔ ان کے گھر کا ماحول دینی اور ادبی دونوں تھا اسی لئے پروفیسر علی احمد فاطمی کی تربیت علمی، ادبی و صوفیانہ ماحول میں ہوئی۔

ابتدائی تعلیم الہ آباد کے مختلف اسکولوں اور اعلیٰ تعلیم الہ آباد یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ۱۹۶۸ء میں ہائی اسکول ۱۹۷۰ء میں انٹرمیڈیٹ اور ۱۹۷۲ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ تحریری و تقریری مقابلوں میں اول آنے پر ممتاز ناقد سید احتشام حسین نے اردو سے ایم۔ اے کرنے کا مشورہ دیا تو فاطمی صاحب تاریخ سے اردو کی طرف آ گئے اور ۱۹۷۴ء میں ایم۔ اے کی ڈگری امتیازی نمبروں سے حاصل کی۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد پروفیسر سید محمد عقیل رضوی کی زیر نگرانی ڈی۔ فل کا مقالہ ''عبدالحلیم شرؔر بحیثیت ناول نگار'' لکھ کر ڈاکٹریٹ کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی۔

اس درمیان وہ انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ ہوئے اور اپنی بہترین کارکردگی اور متحرک شخصیت کی بدولت الہ آباد شاخ کے سکریٹری بنا دیئے گئے۔ ۱۹۷۹ء میں ڈی۔ فل کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۸۰ء میں سینٹ جانس کالج، آگرہ میں بحیثیت اردو لکچرر ملازم ہو گئے۔ اس کے بعد جون ۱۹۸۳ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں بطور لکچرر تقرر ہو گیا اور پھر مسلسل کامیابی و ترقی کے زینے طے کرتے ہوئے ڈاکٹر علی احمد فاطمی ۱۹۹۳ء میں ریڈر اور

۲۰۰۳ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں پروفیسر ہو گئے۔

علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، وامق جونپوری، غلام ربانی تاباں، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر اجمل اجملی اور اپنے استاد محترم عقیل رضوی صاحب کی صحبتوں اور رہنمائی میں ان کی پہچان با قاعدہ اور باضابطہ ایک ترقی پسند ادیب اور ناقد کی حیثیت سے ہوئی۔ چند برسوں بعد وہ صوبائی انجمن اور اب ڈاکٹر قمر رئیس کے بعد کل ہند انجمن ترقی مصنفین کے جنرل سکریٹری کے عہدے پر فائز رہے۔علی احمد فاطمی کے بارے میں ان کے استاد محترم سید محمد عقیل رضوی نے اپنی کتاب ''جدید ناول کا فن'' میں لکھتے ہیں:

> ''میرے شاگردوں میں ڈاکٹر علی احمد فاطمی اور ڈاکٹر فخر الکریم صدیقی نے ناول اور اس کے مختلف مسائل پر اچھے کام کئے ہیں اور فکشن پر بڑی اچھی نظر رکھتے ہیں۔ فاطمی کا کام عبدالحلیم شرر پر پہلا مکمل اور اہم کام ہے جو ناول کی تنقید میں ایک اہم اضافہ ہے اور پہلا ہونے کی وجہ سے اسے ہمیشہ اولیت حاصل رہے گی۔فخر الکریم نے ناول میں خاندانی زندگی پر ایک نئے ڈھنگ کا کام کیا ہے۔''(۳۶)

پروفیسر علی احمد فاطمی نے کئی ادبی بین الاقوامی سفر بھی کئے ہیں۔۱۹۸۵ء کی لندن میں ترقی پسندوں کی جوبلی کانفرنس ۱۹۹۸ء میں تاشقند اور ۱۹۹۹ء میں جوش اکیڈمی ولٹریری سوسائٹی کی دعوت پر کینڈا اور پھر لندن اور اس کے بعد کراچی کے عالمی جوش سیمینار میں شرکت کی۔گزشتہ چالیس سالوں میں فاطمی صاحب نے اپنا ادبی سفر بڑی تیزی سے طے کیا ہے اور آج ہندوستان ہی نہیں بیرون ممالک کا اردو طبقہ بھی ان کی تحریروں اور تقریروں سے بخوبی واقف ہے۔لاتعداد مضامین اور بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں ان میں بہت سی کتابوں پر ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔فکشن کی تنقید کے تعلق سے ان کی اہم کتابیں یہ ہیں:

(۱) عبدالحلیم شرر بحیثیت ناول نگار — ۱۹۸۶ء

(۲) نئی تنقید نئے اقدار — ۱۹۹۹ء

(۳) پریم چند نئے تناظر میں — ۲۰۰۶ء

(۴) ہم عصر اردو ناول: ایک مطالعہ — ۲۰۰۷ء

علی احمد فاطمی کی علمی، ادبی، تنقیدی اور تحقیقی کتابوں کی فہرت سے مجھے ان کے تبحر علمی کا اعتراف ہے اور موقع بہ موقع ان کی کتابوں کا مطالعہ بھی درپیش رہا ہے۔ پروفیسر موصوف بچپن سے ہی ذہین وفطین تھے اور کم عمری میں ہی عربی فارسی اور اردو کی کتابیں پڑھ لی تھیں، لیکن باضابطہ طور پر ان کی کتابوں کی آمد ۱۹۷۸ء میں ''بیس نئی کہانیوں'' (ترتیب) کے نام سے شروع ہوئی۔ شروعاتی دور میں انہوں نے کتابوں کی ترتیب دی پھر ۱۹۸۶ء میں ان کی کتاب ''عبدالحلیم شرر: بحثیت ناول نگار'' کے نام سے اشاعت پذیر ہوئی۔ اس مقالہ پر انہیں الہ آباد یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری تفویض کی۔

موضوع کی مناسبت سے یہ کتاب انفرادی اہمیت کی حامل ہے اور اس زمانے میں لکھے جارہے تحقیقی مقالوں میں اسے انفراد حاصل ہے کیونکہ علی احمد فاطمی نے عبدالحلیم شرر کے ناولوں کا خصوصی ذکر کرتے ہوئے ان کے مؤرخانہ حیثیت کا تعین پیش کیا ہے۔ اس کے فنی تقاضے وعلمی حیثیت، اردو میں تاریخی ناول کا تصور اور ان کا سفر۔ لہٰذا ان سارے سنجیدہ موضوعات کا بغور مطالعہ کیا ہے اور اس پر مدلل بحث کی ہے۔ یہ مقالہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد لکھے جانے والے مقالوں میں اپنی نوعیت کا پہلا مقالہ ہے جس پر پروفیسر علی احمد فاطمی نے قلم فرسائی کی اور دیدہ ریزی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ کتاب کے ابتدائیہ میں لکھتے ہیں:

> ''چوتھا باب غیر متوقع طور پر ایک اضافی باب ہے۔ اس باب میں شرر کے تاریخی ناولوں کے جائزہ سے قبل تاریخ اور ناول کے رشتے۔ تاریخی ناول کے فنی تقاضے، اس کی تشکیل وتعمیر پر باتیں کی گئی ہیں۔ اردو میں اس موضوع پر مواد کے فقدان کی وجہ سے بطور خاص اس بحث کو پیش کیا گیا اور انگریزی و ہندی کتب سے استفادہ کیا گیا۔ جس میں خاصی مشکل تو پیش آئی، لیکن اپنی نوعیت کی منفرد اور معنی خیز بحث ہونے کی وجہ سے............ابلاغ وترسیل کا تار نہ ٹوٹنے پائے لہٰذا اس باب کو من وعن اس مقالے میں پیش کیا جارہا ہے تا کہ تاریخی ناول کی افہام وتفہیم پر کوئی حرف نہ آسکے۔'' (۳۷)

''ترقی پسند تحریک: سفر در سفر'' (۲۰۰۶ء) علی احمد فاطمی کی عمدہ کتابوں میں سے ایک ہے۔ ''ترقی پسند

تحریک سفر در سفر'' میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ ترقی پسند ادب اور تحریک دونوں کی اہم شخصیات کا محاکمہ کیا جائے۔اسی لئے ''ترقی پسند تحریک: سفر در سفر'' میں ۳۶-۱۹۳۵ء میں جب سجاد ظہیر نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد سے لے کر رفتہ رفتہ احتشام حسین، آل احمد سرور، محمد حسن، قمر رئیس، عابد سہیل، احمد جمال پاشا، رتن سنگھ وغیرہ جیسے مشاہیر ادب کی خدمات کو پیش کرتے ہوئے دورِ حاضر کے ترقی پسند رجحانات پر روشنی ڈالتے ہوئے ترقی پسندی کی آواز دھیمی کیوں پڑتی جا رہی؟ کے جواب میں سبط حسن کی باتوں کو اپنی زبان میں یوں نقل کیا ہے:

> ''سچ یہ ہے کہ جب اس کی ضرورت تھی تو فطری طور پر ادب نے اپنے آپ
> میں اسے جذب کر لیا اور اب تو وہ پوری ادبی فضا میں تحلیل ہو چکی ہے، لیکن
> جہاں ہمیں نئے تقاضوں کے تحت فکری تبدیلی برتنا چاہئے تھا وہ نہیں برتی
> چنانچہ اس کا ردعمل ہوا۔'' (۳۸)

پریم چند شناسی کے طور پر ایک اہم کتاب ''پریم چند: نئے تناظر میں'' ہے۔ پریم چند کے افسانوں اور ناولوں کو بیسویں صدی کے شروعاتی دور سے ہی پڑھا اور سمجھا جاتا رہا ہے۔ البتہ علی احمد فاطمی بھی پریم چند کے ذی وقار قارئین میں شامل رہے ہیں اور پریم چند کے ادبی فن پاروں کو ہر دور میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اتنا کچھ سمجھنے کے باوجود مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ علی احمد فاطمی نے اس کتاب کے دو تین مضامین کو چھوڑ کر سبھی مضامین ۲۰۰۶-۲۰۰۵ء کے درمیان میں لکھے ہیں۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صف اول کا ادیب اور روزِ اول سے استفادہ کرنے والا قاری جواب ناقد کی صف میں سب سے آگے کھڑا ہے وہ پختہ عمر میں پریم چند کو بصیرت افروز مشاہدے اور تجربے کے ساتھ یاد کرنے پر مصر ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اردو افسانہ اور ناول اپنے ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہوا ترقی کے اس منزل پر کھڑا ہے، جہاں سے اس کی دیواریں ہل نہیں سکتیں۔ باوجود اس کے پریم چند نے جن موضوعات خصوصاً ہندوستان کی دیہی وقصباتی تہذیب، اس کی سماجی ساخت اور طبقاتی و تہذیبی مسائل کو جس قدر نزدیک سے سمجھا ہے، غالباً اردو کے کسی اور فنکار کے یہاں ممکن نہیں ہے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے پریم چند کی نگارشات میں بنیادی مسائل کے علاوہ بیسویں اور اکیسویں صدی کے نئے نئے مسائل جو ابھر کر سامنے آ رہے ہیں ان سبھی مسائل کو پریم چند کے ادب میں تلاش کرنے کی شعوری کوشش کی ہے۔ اس شعوری

کوشش کے پیچھے پریم چند کا پیغام ''ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا'' کارفرما ہے۔ اس تناظر میں علی احمد فاطمی کا بیان کچھ اس طرح ہے:

''ان مضامین میں جستہ جستہ ان امور کی طرف اشارے کئے گئے ہیں کہ مضامین میں بس اشارے ہی کئے جا سکتے ہیں۔ نیز دور حاضر کے بعض مسائل کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر خواتین، دلت، اور ذات پات کے مسائل کو۔ اسی لئے میں نے اس کتاب کا نام 'نئے تناظر' رکھا ہے۔'' (۳۹)

پریم چند نے اپنے افسانوں میں خوبصورت عورتوں کے مقابلے میں بدصورت معمولی عورتیں، بوڑھی عورتیں، بیوہ اور ابھاگن عورتوں کو اردو افسانوں کا عنوان بنایا ہے۔ ان کے افسانوں کے عنوان ملاحظہ فرمایئے۔ بڑے گھر کی بیٹی، راجپوت کی بیٹی، بیٹی کا دھن، سوتیلی ماں، بوڑھی کاکی، نئ بیوی، مالکن، مس پدما، بدنصیب ماں، ابھاگن، ستی وغیرہ تانیثی تصورات سے علاقہ رکھتے ہیں۔ پریم چند کا ذہن اور قلم ان کو صرف عورت کے طبقہ کا ہی نہیں بلکہ پورے سماج کا بزرگ اور خاندان کا اٹوٹ حصہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ افسانہ ''بوڑھی کاکی'' پر تبصرہ کرتے ہوئے علی احمد فاطمی لکھتے ہیں:

بوڑھی کاکی میں تو تین نسل کی عورتیں ہیں۔ بوڑھی کاکی، جوان روپا اور بٹیا لاڈلی۔ پوری کہانی تینوں ربط وتسلسل میں گندھی ہوئی ہے۔ پوری کہانی میں پھسلتی پھرتی تو روپا ہے مگر مرکزی کردار ہے اپاہج کمزور بوڑھی کاکی۔ ایک بے وقعت کردار جسے پریم چند نے مرکزیت دے کر صرف اس گھر کو نہیں بلکہ پورے سماج کو کردار بنا کر اس کے رسم ورواج کو برہنہ کر کے آدمی کی ایک ایسی دلدوز تصویر پیش کی ہے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔'' (۴۰)

علی احمد فاطمی کا ادبی سفر صرف تنقیدی اور تحقیقی نگارشات تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ان کی صحافتی زندگی کا محاسبہ کیا جائے تو ایک نیا گوشہ سامنے آئے گا۔ انہوں نے شعبہ اردو الہ آباد سے ادبی مجلّہ کے طور پر کارواں، نیا سفر و رجوش بانی کے نام سے رسالے نکالتے رہے۔ ابھی ان کا ادبی سفر جاری ہے اور میں دعا کرتی ہوں کہ ان کا سایہ تادیر قائم رہے۔

☆☆☆

اعجاز علی ارشد

صوبہ بہار کے اہم اور خاص ادباء اور شعراء میں پروفیسر اعجاز علی ارشد کا نام لیا جاتا ہے۔ ان کا آبائی وطن شہر عظیم آباد ہے۔ ان کی پیدائش ۱۹۵۴ء کو اسی شہر میں ہوئی۔ نام اعجاز علی ارشد تجویز پائی۔ آگے چل کر انہوں نے اپنا قلمی نا بھی یہی اختیار کیا۔ ان کے والد محمد علی خاں، پٹنہ یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر تھے۔ ان کی والدہ حسن آرا بھی پڑھی لکھی ذی علم خاتون تھیں۔ لہٰذا ان کے گھر کا ماحول ادبی تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کا سفر پٹنہ سیٹی ہی کے اسکول، کالج اور یونیورسٹی سے مکمل ہوئی۔ ایم اے اردو اور پی ایچ ڈی بھی پٹنہ یونیورسٹی سے ہی کیا۔ انہوں نے مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا سے فارسی میں ایم اے کیا۔

پروفیسر اعجاز علی ارشد بطور اردو لکچرر، بی این کالج، پٹنہ یونیورسٹی میں ۵/جنوری ۱۹۷۶ء کو جوائن کیے۔ ترقی کرتے ہوئے ریڈر، پروفیسر، ڈین فیکلٹی آف ہیومینیٹیز، پٹنہ کالج کے پرنسپل اور مولانا مظہرالحق عربی و فارسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہوئے۔

ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کے نقادوں میں پروفیسر اعجاز علی ارشد کی ایک جگہ ہے۔ وہ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں اور مختلف اصناف میں دلچسپی کے باعث انہیں بیک وقت اردو کے مشفق استاد، معتبر نقاد، اچھے شاعر اور ماہر طنز و مزاح نگار ہیں۔ ان کے کتابوں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ انہوں نے اردو ادب کے مختلف صنفوں پر طبع آزمائی کی ہے۔ تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھنے کے علاوہ ان کا محبوب مشغلہ ظرافت نگاری اور شعر گوئی ہے۔ ظرافت نگاری پر ان کی دو کتابیں ''کرسی اور کرتسی'' اور ''دعوت اور عداوت'' ہیں۔ ''نشاط غم اور دھوپ کا مسافر'' (۲۰۱۵ء) شعری مجموعے ہیں۔ ان کی دوسری کتابیں ''سید عاشور کاظمی: فنکار اور فن''، ''منثورات جمیل مظہری'' (ترتیب مع مقدمہ) ۱۹۷۷ء ''حرف تمنا'' (ترتیب) ۱۹۷۹ء اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''اسلوب و معنی''

(۱۹۸۹ء) ''بہار میں اردو تنقید'' اور ''بہار کی بہار'' (۲۰۰۱ء) (دو جلدیں) ہیں۔ ۱۹۸۴ء علاوہ ازیں اردو فکشن کے تنقید کے زمرے میں ان کی خدمات اردو ادب کے سرمائے میں ۱۹۸۱ء بہت بڑا اضافہ ہے۔ ۲۰۱۷ء جن میں ''توبۃ النصوح: ایک جائزہ'' نذیر احمد کی ناول نگاری، کرشن چندر کی ناول نگاری ''ہم عصر اردو فکشن: چند زاوے'' (۲۰۱۰ء) وغیرہ اہم ہیں۔

اعجاز علی ارشد مختلف اصناف میں دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھنے کے علاوہ ان کی دلچسپی طنز و مزاح سے بھی رہی ہے۔ شاعری بھی ان کی توجہ کا مرکز ہے اور بحیثیت شاعر اپنی شناخت منوانے کا تیور بھی ان کے یہاں موجود ہے۔ پھر بھی میرے نقطہ نظر سے ان کی تنقیدی کاوشیں قابل لحاظ رہی ہیں۔ کرشن چندر کی تفہیم میں ان کی نگارشات کا رول اہم ہے۔ جمیل مظہری کے تفہیم کے باب میں ان کی سعی مستحسن سمجھی جاسکتی ہے۔ نذیر کو جس طرح اور جس تنقیدی بصیرت سے دیکھنے کی کوشش کی ہے قابل قدر ہے۔ عاشور کاظمی پر بھی ان کا نام قابل لحاظ سمجھا جاسکتا ہے۔

''اسلوب و معنی'' (۱۹۸۹ء) پروفیسر اعجاز علی ارشد کا پہلا تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کے دیگر مضامین سے قطع نظر ان کے افسانوں مضامین ''اردو افسانہ اور علامت''، ''گدی کا افسانہ تج دو: تحلیل و تجزیہ''، ''سہیل عظیم آبادی اور ان کی تحریریں: ایک تحقیقی جائزہ'' ہیں۔ یہ تینوں مضامین اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد اہمیت کی حامل ہیں۔ پروفیسر موصوف نے ''اردو افسانہ اور علامت'' میں اردو افسانے میں علامتی اظہار کو موضوع بحث بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اردو افسانے کے تدریجی ارتقا کو ذہن میں رکھا جائے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ علامت اس وقت بھی اس صنف مین اپنا قدم جما رہی تھی جب اس کا چلن عام نہ تھا۔ یوں تو ترقی پسندی علامت کے خلاف سینہ سپر رہی ہے، لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ علامت کے رویے سے بہرہ ور افسانے ترقی پسندی کے دور میں ہی منٹو اور کرشن چندر نے لکھے۔ جنس سے منٹو کا شغف معلوم و معروف ہے اور اس کے دوسرے افسانوں کی طرح 'پھندے' کا موضوع بھی

یہی ہے، مگر یہ افسانہ جنسی دباؤ کی ایک شدید کیفیت کی پیشکش کے باوجود علامت کے کئی پہلو اپنے اندر رکھتا ہے۔'' (۴۱)

پروفیسر اعجاز علی ارشد کی دوسری سب سے اہم کتاب ''کرشن چندر کی ناول نگاری'' ہے۔ پیش نظر کتاب موصوف کی تنقیدی بصیرت اور علم و آگہی کی شناخت کراتی ہے۔ ان سے قبل اردو کے کم و بیش سبھی فکشن ناقدوں نے کرشن چندر کا ناول ''شکست'' کو موضوع بحث بنایا ہے، جب کہ پروفیسر موصوف نے کرشن چندر کے تقریباً سبھی ناولوں کا فرداً فرداً مطالعہ و محاسبہ کیا ہے۔ یہ پوری کتاب کرشن چندر کی شخصیت کی تعمیر، ان کے ذہنی تشکیل اور ان کے اسلوب کا بالاستیعاب مطالعہ پر مبنی ہے۔

''نذیر احمد کی ناول نگاری'' پروفیسر اعجاز علی ارشد کا تحقیقی مقالہ ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے سبھی ناولوں کا مطالعہ پیش کرتے ہوئے ناول کے فن، پلاٹ، تکنیک، کردار نگاری اور ان کے اسلوب نگارش کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ حال ہی میں ان کی ایک اور کتاب ''توبۃ النصوح: ایک تلخیص ایک جائزہ'' کے نام سے شائع ہوئی۔ ''ہم عصر اردو فکشن چند زاویے'' (۲۰۱۰ء کتابی دنیا، دہلی) میں بارہ مضامین شریک اشاعت ہیں، جو خالص فکشن پر مبنی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کا ناولٹ سیتا ہرن، شکیل اختر کی ناول نگاری، عبدالصمد کی ناول نگاری اور عہد حاضر میں لکھے جا رہے ناولوں کا سیر حاصل مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اردو افسانے کے تعلق سے مغرب کے اہم رجحانات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

ان کا خیال ہے کہ ۱۸۵۷ء کی شکست و ریخت کے بعد سرسید احمد خاں کے زیر سایہ قوم اطاعت شعاری اور جدیدیت کی ایک نئی راہ پر چل پڑی۔ سرسید نے سب سے پہلے اپنے مضامین کے ذریعہ تعلیم اور اصلاح کی کوششیں کیں۔ حقیقت نگاری نے داستان کی فضا کو مجروح کیا اور ناول کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا۔ اسی زمانے میں سرسید کے رفیق اور مددگار کی حیثیت سے مولوی نذیر احمد سامنے آئے۔

موصوف کے نزدیک نذیر احمد کی سب سے بڑی انفرادیت یہ ہے کہ ان کی وجہ ہے سے اردو ناول میں عورت اور اس کے مسائل کی تصویر کشی کی گئی۔ اس کے مسائل کو موضوع بحث بنایا گیا۔ ان کا ماننا ہے کہ نذیر احمد کے ناولوں کے مقاصد سیاسی بھی ہیں۔ البتہ تہذیبی و ثقافتی اظہار ان کے ناولوں کا ایک اہم حصہ ہے۔ انھوں نے اسی

معاشرے اور ثقافت کی عکاسی اپنے ناولوں میں زبان کے ذریعہ کی ہے۔ ان کی تنقید میں ثقافت کا تصور صرف رہن سہن سے ماخوذ نہیں بلکہ یہ کسی سماج اور معاشرے کے رسم ورواج، زبان، نفسیات، معاش اور معاشرت سے جاملتا ہے۔ انھوں نے اردو کے خاص خاص ناولوں کا تجزیہ پیش کیا ہے جو فکشن کی تنقید کے باب میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ تنقید کے لیے وہ زبان وبیان صاف، سادہ اور سلیس استعمال کرتے ہیں۔ کہیں کہیں ان کے شاعرانہ ذوق و شوق کی جھلک بھی دیکھنے کو ملتی ہے جسے ہم ان کا طرۂ امتیاز قرار دے سکتے ہیں۔

☆☆☆

ارتضیٰ کریم

اردو فکشن کے معروف ناقدوں میں پروفیسر ارتضیٰ کریم کا نام لیا جاتا ہے۔ان کے والد ماجد کا نام سید شرافت حسین کریم تھا۔وہ ریاست بہار گیا کے رہنے والے تھے۔یہیں ۲۷؍اکتوبر ۱۹۵۹ء کو ارتضیٰ کریم کی پیدائش ہوئی۔ میں گیا میں پیدا ہوئے۔ان کا پورا نام سید علی کریم ہے،مگر وہ ارتضیٰ کریم کے نام سے مشہور ہیں اور اسی نام سے لکھتے بھی ہیں۔ان کی شخصیت اعلیٰ تعلیم وتربیت سے مزین ہے۔

ابتدائی تعلیم کے بعد انہوں نے ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔تحصیل علم کے بعد آپ دہلی یونیورسٹی کے ذاکر حسین کالج میں اردو کے لکچرر ہوئے۔ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو ہوئے۔اردو تحقیق وتنقید، ان کی ادبی خدمات اور تنظیمی صلاحیت کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے حکومت ہند نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان جو ہندوستان کی وزارت ''ترقی انسانی وسائل'' کے زیر اہتمام چلنے والا ایک بڑا ادارہ ہے، کا ڈائرکٹر مقرر کیا۔

ارتضیٰ کریم کی توجہ ابتدا سے ہی اردو فکشن کی تنقید پر رہی ہے۔فکشن کی تنقید پر ان کی متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔انہوں نے قرۃ العین حیدر، انتظار حسین اور جوگندر پال کے سلسلے کی کئی کتابیں مرتب کیں۔''قرۃ العین حیدر ایک مطالعہ'' میں محترمہ کے امور فن کے تعلق سے کئی مضامین کو جگہ دی گئی ہے خود قرۃ العین حیدر نے اپنی بابت چند اہم نکتوں کی وضاحت بھی کی ہے۔

ارتضیٰ کریم نے خود ''میرے بھی صنم خانے'' کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔اسی طرح ''انتظار حسین ایک دبستان'' کے نام سے انتظار حسین کے ناولوں، افسانوں اور ان کی تنقیدی کاوشوں پر بسیط مقالات مرتب کر چکے ہیں، جن میں ہندو پاک کے بڑے بڑے دانشوروں کی نگارشات شامل ہیں۔اس کتاب کی حیثیت بھی دستاویزی

ہے۔''جوگندر پال ذکر، فکر اور فن'' معروف عام کتاب ہے۔ فکشن نگار کے تمام کیف وکم کو یکجا کرنے کی صورت پیدا کر دی گئی ہے۔ جوگندر پال کی افسانوی روش اور ان کے افکار کے تفہیم میں اس کتاب کی بنیادی حیثیت ہے۔ ''جدید تنقید کا منظر نامہ'' بھی ترتیب دی ہوئی ایک کتاب ہے۔اس کتاب میں نقادوں نے اپنے تنقیدی افکار و تفہیم کو ظاہر کیا ہے۔اس طرح جدید تنقید کا منظر نامہ واضح طور پر سامنے آیا ہے۔انہوں نے وہاب اشرفی، محمد ہاشمی اور شمس الرحمٰن فاروقی کے ادبی معرکے کو بھی جگہ دی ہے اور ''بازیافت'' کے عنوان سے مباحث پر روشنی ڈالی ہے۔

موصوف کی تین کتابیں ایسی ہیں جو ان کی تنقیدی بصیرت کی غماز ہیں۔موصوف نے ''اردو فکشن کی تنقید'' میں اس کی چار سو سالہ تاریخ پر ایک نظر ڈالنے کی سعی مستحسن کی ہے۔ یہ ایک اہم مطالعہ ہے جو نو جوان ترقی پسند نقاد کے کوششوں کا نتیجہ ہے۔''اردو فکشن کی تنقید'' (۲۰۱۶ء) فکشن کی تنقیدی روایت اور پس منظر پر لکھی جانے والی پہلی کتاب ہے۔ انہوں نے فکشن کے ضمن میں صرف داستان، ناول اور افسانوں کو ہی نہیں بلکہ ڈرامے، تمثیل اور داستان کو اپنے مطالعے کا حصہ بنا کر اس پر مبسوط اور مدلل طریقہ کار سے بحث کی ہے۔کتاب کے آخر میں اردو فکشن کا اشاریہ بھی شامل کیا ہے۔اس طرح یہ کتاب اردو فکشن کی تنقید پر کام کرنے والوں کے لئے بنیادی کتاب ثابت ہوئی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> یہاں نقد فکشن کے بتدریج ارتقا پر گفتگو ہیاور اردو فکشن کی نثری اصناف تمثیل، داستان، ناول اور افسانے پر لکھی جانے والی اہم تنقیدی نگارشات کا جائزہ لینے کی بھی سعی کی گئی ہے کہ اردو فکشن کی تنقید کا پورا منظر نامہ سامنے آسکے۔(۴۲)

کتاب کے آخر میں ڈاکٹر محمد حسن نیا رتضٰی کریم کے جوکھم بھرے کام کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> آپ کو اولیت کے پھول اور گجرے بھی ملیں گے اور اس کی کوتاہیوں کے کانٹے بھی حصے میں آئیں گے۔ مجھے بڑی مسرت ہے کہ اب اردو میں تنقید پر تنقید کا چلن شروع ہو رہا ہے اور آپ نے اس دور کے آغاز کا کام سنبھالا

ہے اور اس کے خطرات کو اپنایا ہے۔ یہ کام جتنا ضروری ہے اتنا ہی جوکھم کا
بھی ہے کہ اس میں نظر بھی چاہیے اور وسیع النظری بھی۔(۴۳)

عجائب القصص پر بھی انہوں نے ایک تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔عجائب القصص(۱۹۸۷ء)۱۸ویں صدی کی داستان ہے جسے شاہ عالم ثانی نے تصنیف کی تھی۔ اس کا تنقیدی مطالعہ پیش کرتے ہوئے ۱۸ویں صدی کے دوسرے نثر نگاروں کا بھی جائزہ لیا ہے البتہ اس دور کے ادیبوں کا تقابلی مطالعے پر مبنی یہ کتاب اردو فکشن کی تنقید کے لیے سرمایہ افتخار ہے اور اس پر کام کرنے والوں کے لیے معاون و مددگار بھی۔اس کے متعلق کتاب کے نگاہِ اولیں میں گویا ہیں:

یہ کام اس اعتبار سے اہم ہے کہ اٹھارہویں صدی عیسوی میں جب کہ اردو
نثر اپنی ارتقا کی ابتدائی مراحل میں تھی۔شاہ عالم ثانی نے عجائب القصص لکھ
کر یا لکھوا کر اس کی ترقی و ترویج میں ایک اہم نثری تصنیف میں اضافہ کیا
۔اس کے مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ شاہی آداب اور مختلف
موقعوں پر شاہی رسومات کے انداز کیا ہوتے ہیں۔(۴۴)

''مابعد جدیدیت اور پریم چند'' (۲۰۰۷ء) میں ارتضیٰ کریم نے مابعد جدیدیت کے تناظر میں پریم چند کے فن پاروں کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔''آزادی کے بعد اردو افسانہ'' (۲۰۰۳ء،۲۰۰۲ء) دو جلدوں میں ترتیب دی گئی ہے۔اس کی فہرست سازی میں گوپی چند نارنگ اور اسلم جمشید پوری جیسی قد آور شخصیات کی شمولیت عمدہ ترتیب سازی کی ضمانت ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم کا ادبی سفر ہنوز جاری و ساری ہے۔نو واردان علم و ادب کو آپ سے بہت ساری امیدیں وابستہ ہیں۔

☆☆☆

اسلم جمشید پوری

اسلم جمشید پوری دور حاضر کے معروف ادیب و ناقد ہیں۔ان کی پہچان فکشن نگار، تنقید نگار، بچوں کے ادیب کے طور پر ہے۔ان کا آبائی وطن اتر پردیش ہے، مگر والد کی ملازمت جمشید پور میں ہونے کی وجہ سے وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ان کی پیدائش ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۷ء میں جمشید پور میں ہی ہوئی۔انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد رانچی یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔انھیں بچپن سے ہی پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔ان کے شوق و ذوق کی آبیاری میں ان کے والد نے بڑا کردار ادا کیا ہے۔ان کے والد زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن وہ ادب سے شغف رکھتے تھے۔ان کے پاس ادب کی کتابیں مثلاً افسانوی مجموعات، ادبی رسالوں اور ناولوں کا ذخیرہ موجود تھا۔لہذا انہوں نے اردو کی وہ سبھی کتابیں چھوٹی عمر میں ہی پڑھ لی تھی۔ پڑھنے کے اسی جوش و جذبے نے انھیں اعلی تعلیم کے لیے اکسایا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ایم اے(اردو ۱۹۹۴ء اور پولٹیکل سائنس ۱۹۹۷ء)امتیازی نمبروں سے مکمل کیا۔ پروفیسر عظیم الشان صدیقی کی نگرانی میں ''آزادی کے بعد اردو افسانہ فکری وفنی جائزہ'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ۲۰۰۰ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

پروفیسر موصوف کو پڑھنے کے ساتھ پڑھانے کا شوق بچپن سے ہی تھا۔وہ اپنے ہم جماعت کو بھی وقت نکال کر پڑھاتے تھے۔لہذا وہ درس و تدریس کے رموز و اوقاف سے بخوبی واقف تھے۔اپنی مادر علمی میں ۱۹۹۸ء سے ۲۰۰۲ء تک مہمان لکچرر کے طور پر وابستہ تھے ہی کہ ان کی مستقل تقرری چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے استاد کے طور پر ہوگئی۔ بحالی کے ساتھ ہی صدر شعبہ اردو کے سربراہ ہوگئے۔

صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میں شعبہ اردو انھوں نے ہی قائم کیا ہے۔شعبہ اردو کو صرف نصابی درس و تدریس تک ہی محفوظ نہیں رکھا ہے۔انھوں نے اس ادارے کو اپنے افعال و

کردار سے مثالی بنا دیا ہے۔جس سے میرٹھ کی ادبی فضا سیراب ہو رہی ہے۔انہوں نے ایم اے اردو کا نصاب جدید عصری تقاضوں کے عین مطابق ترتیب دیا ہے یعنی اس میں موجودہ دور کے موضوعات مثلاً ترجمہ نگاری، اسکرپٹ رائٹنگ، انفارمیشن ٹکنالوجی، میڈیا اور کمپیوٹر کو شامل کیا ہے تاکہ اردو کی ترویج واشاعت کے ساتھ نوجوان نسل کو روزگار مل سکے اور ان کے اندر خود اعتمادی پیدا ہو سکے۔

یہاں وہ نصابی سرگرمیوں کے علاوہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر سیمینار، سمپوزیم، بحث ومباحثہ اور مذاکرے کا انعقاد کراتے رہتے ہیں۔ مذہبی اور سماجی نکات پر ان کی گہری نگاہ رہتی ہے۔ جسے وہ ادب سے جوڑ کر نئے نئے ادبی امکان پیدا کرتے ہیں جو اپنے آپ میں اچھوتا اور نیا ہوتا ہے۔ ان کے اس نئے موضوعات اور اسباق کے اختراع کی پذیرائی چہار سو ہوتی ہے۔ نیز اردو ادب کو دوسرے ادب مثلاً ہندی، سنسکرت، میتھلی اور انگریزی ادب سے جوڑ کر اس کی خصوصیت، مشابہت اور مماثلت پر بھی ادبی محفلیں سجاتے ہیں۔

اسلم جمشید پوری کی شخصیت ایک فعال کردار کی ہے۔ان کی تنظیمی اور ادبی صلاحیت کا لوہا ادبی حلقوں میں ہر کس و ناکس نے مان لیا ہے۔ ان کا شاید ہی کوئی سیمینار اور سمپوزیم اپنے شہر، ملک، اور جامعات تک سمٹتا ہے۔اسلم صاحب کا مشن نئی نسل کی آبیاری اور برسر روزگار بنانا ہے۔اس کے لیے انھوں نے نئے شاعروں اور ادیبوں کو ایک پلیٹ فارم مہیا کیا ہے۔شعبہ اردو میں ہر چھوٹے بڑے موقعوں پر مختلف موضوعات اور ادبی شخصیات پر نشستیں ہوا کرتی ہیں۔ ان کے زیادہ تر پروگرام بین الاقوامی سطح کے ہوتے ہیں۔اس سے کئی فائدے ہیں۔ملکی اور غیر ملکی تجربہ کار اور کہنہ مشق ایڈمنسٹریٹو شخصیات سے روبرو ہو کر بہت کچھ سیکھنے، نئے اور پرانے قلمکاروں کو سننے اور سنانے کا موقع ملتا ہے۔

وہ قابل تعریف اور مبارک باد کے مستحق ہیں کہ وہ ہر دو سال پر شعبہ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کے یوم تاسیس کے موقع پر بین الاقوامی سیمینا ادبی فنکشن کے طور پر منعقد کراتے ہیں۔ان کا یہ ادبی فنکشن کئی جہتوں سے رنگا رنگ پروگرام کا گلدستہ ہوتا ہے۔ جہاں داستان، ناول، افسانہ، افسانچہ، ڈرامے، شاعری جیسے دوسرے اصناف پر کھل کر گفتگو ہوتی ہے۔اس کے علاوہ کتابوں کا ایگزیوشن و پینٹنگ بھی ان کی دلچسپی کا حصہ بنتے ہیں۔حتی کہ کووڈ میں بھی شعبہ اردو کے یوم تاسیس کے موقع پر چہار روزہ بین الاقوامی ویبینار کا انعقاد کرایا تھا۔ یہ

ویبینار گزشتہ دنوں اپنے طرز کی پہلی اور سب سے بڑی ادبی محفل تھی جہاں تقریباً بارہ (۱۲) غیر ملکی اور تینتیس (۳۳) ہندستانی یونیورسٹیوں کے اسکالرز نے حصہ لیا۔ابھی حال ہی میں انھوں نے ''آیوسا (AYUSA)'' نامی ایک تنظیم قائم کی ہے جس کے تحت نوجوان اسکالرز کو مواقع فراہم کئے جاتے ہیں۔

ایک قلم کار کے طور پر اسلم جمشید پوری کا کینوس کافی وسیع ہے۔اب تک ان کی ڈیڑھ درجن سے زائد کتابیں تصنیف ، تالیف اور ترتیب ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کتابوں میں ناول ، افسانے، تنقیدی مضامین، ہندی کہانیوں اور بچوں کی کہانیوں کے مجموعے اور تراجم شامل ہیں۔موصوف کے دیگر نگارشات سے قطع نظر ان کی تنقیدی آراء پر گفتگو مقصود ہے۔اسلم جمشید پوری کو تنقید کے میدان میں قدم رکھے زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے۔لیکن انھوں نے بڑی تیزی سے اس میدان میں بھی اپنا نام ثبت کرالیا ہے۔افسانوی ادب کی تنقید پر ان کی نگاہ گہری ہے۔کم وقفے میں انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔زبان وہی لکھتے ہیں جو تنقید کے لیے موزوں اور مناسب ہو۔ان کا تنقیدی شعور پختہ اور بالیدہ ہے۔وہ واضح اور مدلل انداز میں کسی بھی فنپارے کا تنقید و تجزیہ کرتے ہیں۔آدھے درجن کے قریب ان کی تنقیدی کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔جدید اردو افسانہ: بدلتی قدریں، جدیدیت اور اردو افسانہ، ترقی پسند اردو افسانہ اور اہم افسانہ نگار (تحقیق وتنقید)، اردو افسانہ: تعبیر و تنقید (تحقیق وتنقید)، اردو فکشن: تنقید و تجزیہ، اردو فکشن کے پانچ رنگ (تحقیق وتنقید)، عصمت شناسی (ترتیب)، تجزیے (تنقید) جیسی کتابیں دستاویزی حیثیت کی حامل ہیں۔

ترقی پسند اردو افسانہ اور اہم افسانہ نگار (تحقیق وتنقید) اسلم جمشید پوری کی فکشن تنقید پر عمدہ کتاب ہے۔ یہ کتاب خالص ترقی پسند تحریک، ترقی پسند اردو افسانہ و افسانہ نگاروں پر مشتمل ہے۔ناقد موصوف نے ترقی پسند تحریک کو تین ضمنی عنوانات ''پس منظر، انگارے کی اشاعت، ترقی پسند تحریک۔ ابتدا اور فروغ نیز کفن کا کردار'' کے نام سے منقسم کر کے اس پر سیر حاصل مطالعہ پیش کیا ہے۔ترقی پسند تحریک اور اس کی غرض وغائیت کیا ہے؟ اس کے فروغ میں انگارے نے کس طرح حرارت انگیزی کا رول ادا کیا؟ اس کی ابتدا کیسے اور کس طرح فروغ ہوا؟ افسانہ ''کفن'' فن اور موضوع دونوں اعتبار سے ایک اہم افسانہ ہے۔ یہ ایک جانب پریم چند کی حقیقت نگاری کو نئی سمت و رفتار عطا کرتا ہے تو دوسری طرف اس تحریک کو کفن کے کرداروں نے کس طرح مضبوط اور مستحکم

بنیاد فراہم کیا۔ اس کے متعلق اسلم جمشید پوری نے لکھا ہے:

''یہ کہانی اپنے موضوع کے اعتبار سے بھی اپنے عہد کو نیا جہاں عطا کرتی ہے۔ گاؤں کے ایک چمار خاندان کے تین افراد اور تین نسلوں کی کہانی، پریم چند کی فنی مہارت کے سبب اس قدر وسیع کینوس اختیار کر لیتی ہے کہ آفاقیت کی حدوں کو چھو لیتی ہے۔ اس چھوٹی سی کہانی میں اپنے عہد کی سماجی اور اقتصادی تصاویر کا بخوبی نظارہ کیا جا سکتا ہے۔'' (۴۵)

اسی کتاب کے دوسرے باب ''ترقی پسند اردو افسانہ'' کے تحت اسلم جمشید پوری کا بیان ملاحظہ فرمائیے:

''اس نے منصوبہ بند طریقہ سے 'ادب برائے زندگی' کے اصول پر عمل شروع کیا۔ کہانی اور افسانوں میں اصلاحی پہلوؤں کو زیادہ مدنظر رکھا جانے لگا۔ اب امن و امان، جنگ، انقلاب، آزادی کی جدوجہد، اجتماعیت وغیرہ موضوعات افسانے کا موضوع بننے لگے۔ افسانے کا دامن وسیع ہوتا گیا۔ صدہا برس سے چلا آ رہا جاگیردارانہ نظام جو مظلوموں اور دبے کچلے عوام کا خون چوستا آ رہا تھا۔ افسانے کے ذریعے اس کی صحیح منظر کشی کا سلسلہ شروع ہوا۔'' (۴۶)

ترقی پسند تحریک نے اردو کی تقریباً ہر صنف کو متاثر کیا، لیکن اردو افسانہ نے سب سے زیادہ اثرات قبول کیے۔ 'ترقی پسند اردو افسانہ' حقیقت نگاری اور رومان پسندی کی روایت 'ادب برائے ادب' کے خلاف 'ادب برائے زندگی' کے اصول پر عمل پیرا تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ بدلتے وقت کے ساتھ حالات بدلتے چلے گئے۔ روز بروز ملک گیر اور عالمی سطح پر پہلی عالمی جنگ، روس کا انقلاب، جلیانوالہ باغ کا قتل عام، جنگ آزادی کی آگ کے بلند ہوتے شعلے جیسے نئے نئے مسائل نے اردو افسانوں کے دامن کو وسیع کر دیا۔ ترقی پسند افسانہ زندگی کی اسی حقیقت کو اس کے مقصد سے جوڑ کر پیش کرتا ہے اور کسانوں، مزدوروں و مظلوموں کے انقلابی شعور کو اجاگر کرتا ہے۔

اسلم جمشید پوری کی فکشن تنقید کا عمدہ نمونہ پیش کرنے والی دوسری کتاب ''اردو فکشن کے پانچ رنگ'' کو

عرشیہ پبلیکیشنز، دہلی نے ۲۰۱۷ء میں پہلی اور ۲۰۲۰ء میں دوسری بار شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں داستان، ناول، ناولٹ، افسانہ اور افسانچہ کے آغاز و ارتقا اور اس کی روایت کا بالاستعیاب مطالعہ پیش کیا ہے۔ داستان کو چھوڑ کر باقی کے چار افسانوی صنف پر تنقیدی و تحقیقی مضامین شامل کئے ہیں۔ اس دور کے مشہور داستان (سب رس اور باغ و بہار)، ناول، افسانے اور افسانچوں کے تجزیے پیش کیے ہیں۔ کتاب کے پیش لفظ میں اپنی عمدہ تحریری کاوش کا اعتراف کرتے ہوئے رقم کرتے ہیں:

''یوں یہ مضامین کا ہی مجموعہ ہے لیکن میں نے س کی ترتیب پر بھی خاص توجہ صرف کی ہے اور کوشش کی ہے کہ فکشن کی تنقید پڑھنے والوں کو یہ مسلسل کتاب کا لطف دے۔ خصوصاً طالب علموں کو فکشن کی تنقید کے حوالے سے کچھ نیا پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔'' (۴۷)

اسلم جمشید پوری نے فکشن کے پانچوں رنگ کے متعلق مختلف تنقیدی اور تحقیقی مضامین کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ اس کے پیچھے ان کا مقصد کا فرما ہے کہ بیک وقت فکشن کی سبھی صنفوں پر معیاری اور سنجیدہ مضامین کی کمی ہے۔ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ ان سبھی صنفوں کا عروج و زوال زمانے کے بدلتے حالات و مسائل پر منحصر ہے۔ جسے فکشن کے طالب علموں کو سمجھنے میں آسانی ہو سکے۔ اس کی وضاحت انھوں نے مثال کے ساتھ دی ہے۔ عینی آپا کی ناولٹ نگاری کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قرۃ العین حیدر کے ناولٹ زندگی کے مرقع ہیں۔ مصنفہ کا تجربہ اور مشاہدہ زندگی کا ایسا فلسفہ پیش کرتا ہے کہ وہ ہماری صحیح سمت رہنمائی کرتا ہے۔ زندگی کے یہ فلسفے برسوں کی تخلیقی ریاضت، عمیق مطالعہ اور گہرے مشاہدے سے وجود میں آتے ہیں۔ ناول سیتا ہرن ہو یا چائے کے باغ یا پھر اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو۔ ان کے اختتام زندگی کے ایسے فلسفوں سے معمور ہے۔ (۴۸)

مذکورہ عبارت کی تفہیم و افہام کے لئے ضروری ہے کہ ناولٹ کے اس عبارت کو ذہن میں رکھا جائے۔

''ابھی دن باقی ہے۔ پھر رات ہوگی۔ پھر صبح ہوگی۔ ایک اور دن ایک اور رات۔ سلسلہ روز وشب نقش گر حادثات۔ دن اور رات کا حساب رکھنے کی غلطی کبھی نہ کرنا۔ وقت کا حساب کوئی کوئی نہیں لگا سکا ہے۔ تجھ کو پرکھتا ہے یہ۔ مجھ کو پرکھتا ہے یہ۔ سلسلہ روز وشب صیرفئ کائنات۔ دن اور رات کا حساب۔ زندگی کوئی تمہاری ڈوکومنٹری فلم ہے کہ لے کے ساری زندگی لونگ مڈکلوز میں سمیٹ دو۔''(۴۹)

قرۃالعین حیدر کا افسانوی کینوس (ناول، ناولٹ اور افسانہ) کافی وسیع اور وقیع ہے۔ قرۃالعین حیدر کو ان کی سیر وسیاحت اور تعلقات عام وخاص نے زندگی کا باریک مطالعہ، انسان کے اعمال وحرکات وسکنات و جذبات کا تجزیہ، انسان کے نفسیات کو سمجھنے میں مدد کرتا ہے۔ ان کی کہانیوں کے بیشتر مرکزی کردار عورت ہوتی ہے۔ ان کے کردار ایک خاص طبقے کے انٹلکچول ہوتے ہیں۔ ان کے کرداروں میں زمیندار، راجے رانیاں، پروفیسر، انجنیئر، ڈاکٹر، سول سروس کے عہدے دار ہوتے ہیں۔ نچلے متوسط طبقے کے افراد بھی سماجی ترقی کی سیڑھیاں چڑھنے اور گرنے میں منہمک نظر آتے ہیں۔ مذکورہ بالا عبارت میں ''سیتا ہرن'' کی میر چندانی بھی سماجی ترقی کی انہی سیڑھیوں کے چڑھنے اترنے میں منہمک ہے۔ جو زندگی کے ادھیڑ بن، عروج وزوال کو وقت کے مضبوط دھاروں سے جوڑ کر غیر محفوظ زندگی کو تسلی دینے پر آمادہ ہے۔

اسلم جمشید پوری نے اپنی فکشن کی تنقید میں زبان و بیان متوازن استعمال کی ہے۔ وہ تجزیے کے وقت جذباتی نہیں ہوتے اور ہر بات کو مدلل بیان کرتے ہیں۔ یہی انفرادیت ان کو اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے۔

☆☆☆

شہاب ظفر اعظمی

شہاب ظفر اعظمی نئی نسل کے معتبر تنقیدی نگاروں میں سے ایک ہیں۔ وہ اپنے اسی نام سے لکھتے پڑھتے ہیں۔ ان کی پیدائش یکم اپریل ۱۹۷۲ء کو جھارکھنڈ میں اپنی خالہ کے گھر ہوئی۔ ایک مرتبہ کا معاملہ ہے کہ استاد کے ساتھ شعبہ اردو، پٹنہ یونیورسٹی میں کچھ رسمی باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ دوسرے طلباء اور طالبات بھی وہاں موجود تھے۔ بات ان کے نام سے نکلی کہ آپ کے نام میں ''اعظمی'' ٹائٹل ثبت ہے اور آپ ضلع گیا بہار کے رہنے والے ہیں۔ تبھی انہوں نے اس بات کی صراحت کی کہ:

> ''ریاست اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ کے قصبہ، مبارک پور میں میرے جد اعلیٰ رہتے تھے۔ میرا آبائی وطن مبارک پور، اعظم گڑھ ہے۔ گیا میرا نانیہال ہے۔ میرے والد مولانا عبدالبر اعظمی یہیں مقیم ہوگئے۔ ان کے ساتھ خاندان کے دوسرے افراد بھی آگئے۔ لہٰذا یہیں سے ہم سبھی بھائی بہنوں کی پرورش و پرداخت ہوئی اور یہیں کے ہو رہے۔''(۵۰)

ایک اور سب سے اہم بات جسے میں بتا دینا چاہتی ہوں کہ فکشن سے ان کی رغبت کب کیسے اور کہاں ہوئی اس تعلق سے وہ بتاتے ہیں:

> ''جب میں طالب علمی (چھوٹے درجے) کے دور سے گزر رہا تھا اس زمانے سے تھوڑی اجرت پر کتابیں ملتی تھیں۔ لوگ اپنی پسند کی کتابیں منگا کر فرصت کے اوقات میں پڑھتے تھے۔ میری پھوپھی بھی پڑھنے لکھنے سے مطلب رکھا کرتی تھیں اور خوب پڑھتی تھیں۔ (اسکول اور کالج کی تعلیم نہیں تھی) ان کی

کتابوں کی فراہمی کا ذریعہ میں ہوا کرتا تھا۔ کتابوں کو دکان میں پہنچانے سے قبل میں اپنے گھر والوں سے چھپ چھپ کر رات میں ٹمٹماتی روشنی (لالٹین اور موم بتی) میں پڑھتا تھا۔ اصل میں فکشن سے لگاؤ اور رغبت وہیں سے آئی۔" (۵۱)

بہر کیف! استاد محترم سے گفت وشنید اور اہم واقعات سے روبرو ہونا ہماری خوش بختی ہے اور میری تحقیق کا ایک چھوٹا سا حصہ بھی۔ اسی لئے میں نے اپنی ذاتی معلومات کو آپ تک پہنچانے کی معمولی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کی ابتدائی تعلیم جامعہ شرقیہ، عماد پور میں ہوئی پھر آپ مدرسے میں داخل کرائے گئے۔ مدرسے کی تعلیم سے فارغ ہوکر اعلیٰ تعلیم کے لئے آپ جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی چلے گئے۔ اسی درمیان ہائی اسکول، آرہ میں ملازمت اختیار کر لی۔ پروفیسر حسین الحق (مگدھ یونیورسٹی) کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ ابھی مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ آپ University Service Commission سے منتخب ہوکر ۲۰۰۳ء میں شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی میں لکچرر ہو گئے۔

شہاب ظفر اعظمی کا اختصاص یہ ہے کہ انہوں نے فکشن کو اپنا خاص موضوع بنایا ہے اور اسی میدان میں اپنا زیادہ سے زیادہ وقت صرف کرتے ہیں۔ ان کا شمار فکشن کی نظریاتی اور عملی تنقید کے نہایت عمدہ نمونے پیش کرنے والے ناقدوں میں ہوتا ہے۔ ان کی تحریریں اور ان کے افکار انہیں پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر قمر رئیس، وارث علوی، شمس الرحمٰن فاروقی، وہاب اشرفی، شمیم حنفی، سید محمد عقیل، مہدی جعفر، اسلم آزاد، اعجاز علی ارشد، ابوالکلام قاسمی، خورشید احمد، علی احمد فاطمی، ارتضیٰ کریم، صغیر فراہیم اور اسلم جمشید پوری جیسی قدآور شخصیات کی صف میں کھڑا کرتے ہیں۔

یوں تو شہاب ظفر اعظمی کی نگاہ فکشن کے علاوہ ادب کے دوسرے اصناف پر بھی رہتی ہے، لیکن ان کی اساس اور پہچان فکشن کے اسلوبیاتی مطالعے پر مبنی ہے۔ افسانوی ادب کے سبھی اجزاء پلاٹ، کردار، منظر، پس منظر و زبان و بیان پر خود کو مرکوز کرتے ہوئے اس کے اسلوب پر سنجیدگی، غیر جانبداری اور تعمیری نقطہ نظر ان کے سامنے ہوتا ہے۔ ان کی سنجیدگی اس بات کی طرف توجہ مبذول کراتی ہے کہ وہ متن کو صرف ناقد کی نظر سے نہیں دیکھتے ہیں، بلکہ مصنف کے وژن، اس کے تجربات واحساسات وجذبات کی پیشکش کی گہرائی و گیرائی کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے تنقیدی تجزیے میں متن کا مرکزی خیال اور مصنف کے زاویہ نگاہ کی آمیزش ہوتی ہے۔ ان کا یہی اسلوب ان کے ہم عصروں میں

انفراد بخشتا ہے۔

ان کی کتاب ''اردو ناول کے اسالیب'' چار سو صفحات پر مشتمل عمدہ تنقیدی جہات کا مجموعہ ہے۔ موصوف نے ناول کے آغاز وارتقاء کا احاطہ کرتے ہوئے مختلف ادوار کی مناسبت سے پانچ ابواب میں منقسم کر کے ہر ایک دور کے اہم ناول نگاروں اور ناولوں کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ اردو ناول ترقی پسند تحریک کے بعد، جدیدیت اور مابعد جدیدیت جیسے نظریات ورجحانات کے حامل ناول نگاروں جیسے عبدالصمد، پیغام آفاقی، الیاس احمد گدی، سید محمد اشرف، غضنفر، ساجدہ زیدی، محمد علیم، کوثر مظہری، شفق، آچاریہ شوکت خلیل اور شاہد اختر کے فن پاروں کو تنقیدی پیمانے پر پرکھتے ہیں۔ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کی تنقیدی صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے پروفیسر وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

> ''اردو ناول کے اسالیب، تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے نئے تنقیدی جہات سے مملو ہے۔ مجھے شہاب ظفر اعظمی کی ژرف بینی، وژن، قوت استدلال، نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت کا اعتراف کرنا پڑ رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اردو ناولوں کے عمومی جائزے میں اور اس کی تاریخ میں اس کتاب کی اپنی اہمیت ہوگی۔'' (۵۲)

تاریخ ادب اردو، جلد دوم میں وہاب اشرفی نے مختصر مگر جامع تبصرہ کرتے ہوئے بہت اچھی بات کہی ہے:

> ''مجھے مسرت ہوئی کہ شہاب ظفر اعظمی نے اسالیب کے پس منظر میں ناولوں کا تجزیہ کرنا چاہا ہے جس میں ابتدائی ناولوں کے علاوہ جدید ناولوں پر بھی بھرپور نگاہ ڈالی گئی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس میں کوئی قابل لحاظ ناول چھوٹا ہی نہیں ہے، صرف ایک ناول 'ویرگاتھا' (سلیم شہزاد) پر نگاہ نہیں ڈالی گئی ہے۔ میں نے موصوف کی کتاب 'اردو ناول کے اسالیب' کے ضمن میں لکھا تھا کہ ترقی پسند تحریک کے بعد اردو ناولوں کا نیا مزاج اور میلان سامنے آیا ہے۔ مغرب کے اثرات بڑھ گئے ہیں۔ دوسری زبان کے ادب پر لوگوں کی نگاہیں زیادہ گہری اور بسیط ہوگئی ہیں۔ بعض ایسی تکنیک جو پہلے استعمال نہیں ہوئی تھی ترقی پسند تحریک کے بعد کے ناولوں میں وہ تمام چیزیں زیادہ گہرائی سے سامنے آگئی ہیں۔ ایسے میں زمان و مکان،

مسائل و ہیئت کے لحاظ سے ناولوں کا مزاج متنوع ہے اور ظاہر ہے اسالیب بھی۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ عزیز احمد 'ایسی بلندی ایسی پستی' میں جو زبان و اسلوب استعمال کرتے ہیں شموئل احمد 'ندی' میں نہیں یا الیاس احمد گدی کے 'فائر ایریا' یا غضنفر کے 'دویہ بانی' میں زبان ایک الگ نہج اختیار کر لیتی ہے یا مشرف عالم ذوقی کے 'بیان' میں وہ صورت نہیں ہے۔ اس طرح انہوں نے متفرق ذہن، دماغ اور تکنیک، ہیئت اور اسلوب میں جو اختلافات ہیں انہیں سمیٹنے کی سعی کی ہے۔''(۵۳)

حال کے دنوں میں موصوف کی کتاب ''جہان فکشن'' اور ''مطالعات فکشن'' یک موضوعی تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان دونوں کتابوں کے سبھی مضامین اردو کے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کے مطالعے پر مشتمل ہے۔

علاوہ ازیں ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کی مرتب کردہ دو کتابیں ''فرات: مطالعہ و محاسبہ'' اور ''صالحہ عابد حسین: فنی اور فکری جہات'' کے نام سے اردو فکشن کی تنقید میں مزید اضافہ ہیں۔ ان دونوں کتابوں کی ادبی قدر و قیمت اور معنویت اس لحاظ سے اہم ہے کہ ناول ''فرات'' آٹھویں دہائی کے بعد منظر عام پر آنے والی کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس کتاب کی تفہیم و تعبیر میں پرانے لکھنے والوں کے ساتھ نئے قلمکاروں کو شامل کر کے ان کے نقطہ نظر کو پیش کیا گیا ہے۔ اسی سلسلے کی موصوف کی دوسری کتاب ''صالحہ عابد حسین: فنی اور فکری جہات'' میں شامل مضامین سمینار میں پڑھے گئے مقالات ہیں۔ ان دونوں کتابوں کی دستاویزی اہمیت اردو ادب میں مسلم ہے۔

موجودہ عہد کے بہت ہی فعال، متحرک، نئی نسل کی آبیاری کرنے والے استاد، نقاد کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ ہندوستان گیر اور بین الاقوامی سطح پر سمینار، ویبینار اور کانفرنس میں آپ اکثر و بیشتر مقالات پڑھتے ہیں اور موقر رسائل و جرائد میں چھپتے رہتے ہیں۔ آپ کا ادبی سفر ترقی پزیر ہے اور بڑی سرعت سے ہر دن ایک نئے ذہن کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔

☆☆☆

حوالہ جات:

(۱) اردو زبان اور فن داستان گوئی، کلیم الدین احمد، سرفراز قومی پریس لکھنؤ ۱۹۷۲ء، ص ۳۱۔۳۲

(۲) ایضاً، ص ۵

(۳) داستان سے افسانہ تک، وقار عظیم، مکتبہ الفاظ علی گڑھ، ۱۹۸۷ء، ص ۳۸۵

(۴) ہماری داستانیں، وقار عظیم، مکتبہ عالیہ، یوپی ۱۹۶۸ء، ص-۶

(۵) ایضاً، ص-۶

(۶) ترقی پسند ادب کے معمار، مرتب: قمر رئیس، نیا سفر پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۰۶ء، ص ۸۹

(۷) اردو کی نثری داستانیں، گیان چند جین، اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۷ء، ص ۸۸۱۔۸۸۲

(۸) ایضاً، ص ۳

(۹) ممتاز شیریں اردو کی پہلی خاتون نقاد، ابن سلطان، ہماری ویب ڈاٹ کام، پاکستان

(۱۰) معیار، ممتاز شیریں، نیا ادارہ، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص ۹

(۱۱) تکنیک کا تنوع: ناول اور افسانے میں، ممتاز شیریں، اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد، ص ۱۴۔۵

(۱۲) اردو کے پندرہ ناول، اسلوب احمد انصاری، یونیورسل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۳ء، ص ۸۸۔۸۹

(۱۳) ایضاً، ص ۳۰۰

(۱۴) ایک دانشور ایک مفکر، دیویندر اسر، مرتب: نند کشور وکرم، پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز، دہلی، ۲۰۱۳ء، ص ۱۶۹۔۱۷۰

(۱۵) ترقی پسند ادب کے معمار، ص ۲۳۱

(۱۶) ایضاً، ص ۲۳۱

(۱۷) تعریف سے بہت خوش نہ ہو، کام کرتے رہو (مضمون)، علی احمد فاطمی، روزنامہ انقلاب، سنڈے ایڈیشن، ۱۹ جنوری ۲۰۲۰ء، ص ۸

(۱۸) ایضاً، ص ۸

(۱۹) ایضاً، ص ۸

(۲۰) اردو افسانہ روایت اور مسائل، گوپی چند نارنگ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۶ء، ص ۱۲

(۲۱) فکشن شعریات: تشکیل و تنقید، گوپی چند نارنگ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۹ء، ص ۱۴

(۲۲) ترقی پسند ادب کے معمار، قمر رئیس، ص ۳۹۴

(۲۳) ایضاً، ص ۳۹۴

(۲۴) ایضاً ص ۳۹۵

(۲۵) ایضاً، ص ۱۵

(۲۶) ایضاً، ۳۹

(۲۷) افسانہ حقیقت سے علامت تک، سلیم اختر، اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد، ۱۹۸۰ء، ص ۱۰

(۲۸) جدید اردو تنقید اصول و نظریات، شارب ردولوی، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۷ء، ص ۱۱۔۱۲

(۲۹) ترقی پسند ادب کے معمار، قمر رئیس، ص ۳۱۰

(۳۰) قرۃ العین حیدر کا فن، عبدالمغنی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی ۱۹۹۴ء ص-۱۱-۱۲

(۳۱) اردو دنیا بیجخو د نمبر، جنوری ۲۰۰۶ء، ص

(۳۲) بیسویں صدی میں اردو ناول، یوسف سرمست نیشنل فائن پرنٹنگ، آندھرا پردیش، ۱۹۷۳ء، ص ۶

(۳۳) ادب اور سماجیات، پروفیسر قدوس جاوید، ۱۹۸۴ء، ص-۷۷-۷۸

(۳۴) تاریخ ادب اردو، جلد دوم، قدوس جاوید، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص ۳۹

(۳۵) اردو افسانے کی روایت (۱۹۰۳ء تا ۱۹۹۰ء) مرزا حامد بیگ، اکادمی ادبیات، پاکستان ۱۹۹۱ء، ص ۷

(۳۶) جدید ناول کا فن، سید محمد عقیل، الہ آباد، ۱۹۹۸ء، ص-۱۱

(۳۷) عبدالحلیم شرر بحیثیت ناول نگار، علی احمد فاطمی، نصرت پبلشرز لکھنؤ، اشاعت اول ۱۹۸۶ء، ص ۱۳

(۳۸) ترقی پسند تحریک: سفر در سفر'' علی فاطمی، ادارہ نیا سفر، الہ آباد، ۲۰۰۶ء، ص ۱۶

(۳۹) پریم چند نئے تناظر میں، علی احمد فاطمی تخلیق کار پبلشرز، دہلی ۲۰۰۶ء، ص ۱۰

(۴۰) ایضاً، ص ۹۶

(۴۱) اسلوب و معنی، اعجاز علی ارشد، پاٹلی پتر الیتھو پریس، پٹنہ ۱۹۸۹ء، ص-۱۸

(۴۲) اردو فکشن کی تنقید، ارتضیٰ کریم، این سی پی یو ایل، ۲۰۱۶ء، ص ix

(۴۳) ایضاً، ص ۵۳۹

(۴۴) عجائب القصص، ارتضیٰ کریم، لالہ پبلیکیشنز، دہلی ۱۹۸۷ء، ص ۱۱

(۴۵) ترقی پسند اردو افسانہ اور اہم افسانہ نگار، اسلم جمشید پوری، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء، ص ۳۰

(۴۶) ایضاً، ص ۳۳

(۴۷) اردو فکشن کے پانچ رنگ، اسلم جمشید پوری، عرشیہ پبلیکیشنز، ۲۰۲۰ء، ص ۱۱

(۴۸) ایضاً ص ۲۰۷

(۴۹) سیتا ہرن، قرۃ العین حیدر، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۹۸ء، ص ۲۵۶

(۵۰) شہاب ظفر اعظمی سے ایک شخصی گفتگو

(۵۱) ایضاً

(۵۲) اردو ناول کے اسالیب، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی تخلیق کار، پبلشرز، ۲۰۰۶ء، ص ۱۴

(۵۳) تاریخ ادب اردو، جلد دوم، وہاب اشرفی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۰۷ء، ص ۱۱۵۰

☆☆☆

باب ششم

حاصل مطالعہ

اردو فکشن کا تنقیدی سفر سماجی، تہذیبی، ثقافتی اور مذہبی نشیب وفراز سے دو چار رہا۔ اردو فکشن کی تنقید میں کبھی تصوراتی اور تبلیغی فضا حاوی رہی تو کبھی حقیقت نگاری، خارجیت، اجتماعی شعور اور شدید مقصدیت کا بول بالا رہا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف ادوار میں فکشن کی تنقید کا رنگ روپ تبدیل ہوتا رہا۔ ہر زمانے کے اپنے تقاضے اور لوازمات ہوتے ہیں، ان ادبی وفنی تقاضوں اور لوازمات سے اردو فکشن کی تنقید بھی خود کو ہم آہنگ کرتی رہی۔ اردو فکشن کی تنقید کی ہمہ جہت روایت ابتدا سے ہی ارتقا پذیر رہی ہے اور اس کا سفر آج بھی پوری آب وتاب کے ساتھ رواں دواں ہے۔

اردو تنقید کا آغاز باضابطہ طور پر انیسویں صدی کے آخری دہے میں مولانا الطاف حسین حالی کی کتاب ''مقدمۂ شعر وشاعری'' سے ہوا۔ ۱۸۹۳ء میں مقدمہ کی اشاعت ہوئی۔ مقدمہ سے قبل مولوی محمد حسین آزاد کی کتاب ''آب حیات'' منظر عام پر آگئی تھی لیکن اس کی زبان تنقید کی زبان نہیں قرار دی جاسکتی۔ یہ کتاب زیادہ تر اپنے زور بیان اور انشاپردازانہ اسلوب کی وجہ سے قارئین کے درمیان مقبول رہی ہے۔ آب حیات یا مقدمہ شعرو شاعری سے قبل اردو میں تذکرہ نگاری کا دور تھا۔ ان تذکروں میں شاعروں کے سوانحی اشاریے قلم بند کیے جاتے تھے اور شاعروں کی فنی جہت پر روشنی ڈالی جاتی تھی۔ زیادہ تر عروض وبلاغت سے بحث کی جاتی تھی۔

جہاں تک فکشن کی تنقید کا سوال ہے تو اس سلسلے میں ہمیں پہلے تنقیدی نقوش ''خط تقدیر'' میں ملتے ہیں۔ اس کی پہلی اشاعت ۱۸۶۲ء میں ہوئی۔ مولوی کریم الدین نے اس میں قصہ نگاروں سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ اس عہد میں اپنی نوعیت کے بڑے اہم تنقیدی شعور کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ خیالات اس زمانے کے دوسرے ادبی اور سماجی کارگزاروں غالب، سر سید احمد خاں، الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی اور ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ کے خیالات سے قدرِ مشترک ہیں۔ مرزا غالب نے 'بوستانِ خیال' کے ایک نسخے پر تقریظ لکھی۔ اس میں غالب نے اپنے طور پر فن داستان گوئی پر مختصر تبصرہ کیا ہے۔ اس میں غالب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ داستان طرازی کی حد تک تو صحیح ہیں، مگر قصہ گوئی کے اعتبار سے ان کی اہمیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ کیوں کہ جب ان سے قبل کے ادیبوں نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ قصہ تاریخ سے

دلچسپ ہو، ہر انسان کے حسب حال ہوتو پھر غالب کا اسے صرف ''دل بہلانے کے لیے اچھا فن'' کہنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ایسی صورت میں خصوصاً جب کہ خود بوستانِ خیال کا مترجم ہی اصول وضوابط بیان کر رہا ہے اور اسے دل بہلانے کی چیز نہیں سمجھ رہا ہے۔ان باتوں سے قطع نظر فکشن کی ارتقائی صورت کے پیش نظر ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ فکشن کی تنقید ابتدا سے انیسویں صدی کے اختتام تک آتے آتے زبان اور اسلوب کے چٹخارے سے آگے بڑھ کر قصہ میں کردار، تاریخ سے اس کی مماثلت اور مشابہت اور ماحول اور معاشرت کی پیش کش کے ساتھ دلچسپی کی حد تک آ گئی تھی۔

انیسویں صدی کے اختتام تک اردو میں فکشن کی تنقید میں روز افزوں اضافہ اس کے مائل بہ ارتقا ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔اس تعلق سے سجاد حیدر یلدرم کا مضمون ''ناول نویسی'' بہت اہم ہے جس میں ناول کی مقبولیت کے اسباب، اردو ناول کا تجزیہ، ناولوں کی فنی خصوصیات، ناولوں کے موضوعات وغیرہ پر تفصیلی گفتگو ہے اور مضمون نگار نے جگہ جگہ پر انگریزی (مضمون) ادب کے حوالے سے اپنی بات واضح انداز میں کہنے کی کوشش کی ہے۔''ناول نویسی'' جیسے طویل مضمون میں یلدرم نے انیسویں صدی تک کے ناولوں پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے ناول کی حقیقت پسندی اور داستان کی طلسماتی دنیا پر تبصرہ کیا ہے۔ساتھ ہی قصہ کے مختلف معیار اور اقسام کی وضاحت بھی کی ہے۔یہ بڑی بات ہے کہ اس عہد میں جب کہ فکشن کی تنقید کیا خود اردو تنقید کے بال وپر بھی نہ آئے تھے سجاد حیدر یلدرم نے ناول نویسی کے بارے میں سوچا اور اس کی خوبیوں اور خامیوں سے قارئین کو روشناس کرایا۔

مرزا رسوا نے نذیر، شرر اور سرشار کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ کیا اور ان کے کامیاب تجربے بھی ان کی نظر میں رہے ہیں۔رسوا نے پہلی بار فن کے تقاضوں کو محسوس کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ فطرت انسان کے مطالعہ و مشاہدہ کے بغیر ناول کا تصور ہی ممکن نہیں۔وہ ناول کا قصہ، ماحول اور اس کے کردار اپنے ہی آس پاس کے ماحول سے تلاش کرنے پر زور دیتے ہیں۔وہ سماجی تصویر کشی کو بھی ناول کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔انہیں فن اس قدر عزیز ہے کہ ان کا ناول بجائے عوام الناس کے اہل فن میں قدر کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔

نذیر احمد نے اردو ناول کی بنیاد ڈالی اور اسے زندگی کے حقائق سے وابستہ کیا۔سرشار نے بتایا کہ یہ زندگی کا آئینہ ہے، جس میں اس کی تمام وسعتیں اور رعنائیاں منعکس ہیں۔اس زندگی میں ایسے کرداروں کی آب

وتاب ہے جو دل نشیں، انوکھے اور نا قابل فراموش ہیں۔شرر نے اس حقیقت کا انکشاف کیا کہ ناول میں قصہ گوئی کی کچھ حدود ہیں۔ واقعات کو لڑی میں پرونے کے کچھ اصول اور سلیقے ہیں جن کے بغیر کسی قصے کو ناول نہیں کہا جاسکتا۔ رسوا نے ان تینوں کی فنی روایات کا احترام کیا اور اردو میں پہلی بار ایک مکمل معیاری ناول ''امراؤ جان ادا'' کی صورت میں پیش کیا، جس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو ان سے قبل نذیر احمد، شرر اور سرشار کے ناولوں میں ملتی تھیں۔

پریم چند کے نزدیک ادب کا مقصود ومنتہی انسان اور اس کے حوالے سے معاشرے کی اصلاح ہے۔انھیں اپنے قدیم ادب پر بھی آدرش کی چھاپ نظر آتی ہے اور وہ اسے محض دل بستگی کا ذریعہ ماننے کے بجائے اس کا بنیادی مقصد تفریح کے ساتھ ساتھ روح وقلب کی صفائی اور شائستگی قرار دیتے ہیں۔اس مقصد کے حصول کے لیے وہ حرص وطمع پر غلبہ پانے والے ایسے مثبت کرداروں کی تخلیق کو ضروری قرار دیتے ہیں جن کے اندر رذالت، پست جذبات اور نفسانی خواہشوں کو شکست دینے کی قوت وصلاحیت موجود ہو۔وہ ناول میں انسان کے تاریک پہلوؤں، نفسانی خواہشوں اور رسوائیوں کے تفصیلی بیان کو غیر مستحسن سمجھتے ہیں۔ان کے نزدیک ادب کا معیار یہ ہے کہ اس کی تخلیق فن کی تکمیل کے لیے کی جانی چاہیے اور فن کا منصب یہ ہے کہ اس کا کوئی مقصد ہو۔

فکشن کی تنقید پر پہلی مبسوط کتاب عبدالقادر سروری کی ''دنیائے افسانہ'' ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی جس کے چھوٹے چھوٹے بیس ابواب میں سے بیشتر میں ناول کی تاریخ وتنقید سے بحث کی گئی ہے، اور چار ابواب میں مختصر افسانے کی تاریخ، اس کے فن، اس کے مستقبل اور اردو افسانہ نگاروں کی تخلیقات کے تجزیوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہاں سروری نے ''افسانہ'' کو ''فسانہ'' کے معنی میں استعمال کیا ہے جس کا اطلاق بشمول افسانہ، داستان، حکایت، تمثیل اور مثنوی سبھی پر ہوتا ہے۔ یوں اردو ناول کی تنقید میں ''دنیائے افسانہ'' اور عبدالقادر سروری کو علی عباس حسینی اور ان کی کتاب پر زمانی تقدم حاصل ہے۔''دنیائے افسانہ'' اور 'اردو ناول کی تاریخ وتنقید' کے تقابلی مطالعہ کے بعد اگر معیار تنقید پر تبصرہ کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ 'اردو ناول کی تنقید وتاریخ' میں جگہ جگہ 'دنیائے افسانہ' کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

سروری نے ''دنیائے افسانہ'' میں ناول کی تعریف اور اس کی تاریخ بیان کی ہے اور مختلف دلائل سے

ثابت کیا ہے کہ یہ فن بھی فنون لطیفہ میں شامل ہے۔شاعری اور ڈرامے سے اس کا تقابل وتوازن کرنے کے بعد متعدد حوالوں کے ذریعہ اسے شاعری اور ڈرامے سے افضل قرار دیا ہے۔ناول کے عناصر ترکیبی سے بحث کی ہے۔ اعلیٰ ناول کی خصوصیات گنوائی ہیں۔ناول نگار کے فرائض بتائے ہیں، ناول کی قسمیں متعین کی ہیں اور ناول کے منازل ومراحل پر گفتگو کی ہے۔انھوں نے پلاٹ کی روایتی تعریف اور اس کی تقسیم انگریز مصنفوں کے حوالے سے کی ہے لیکن اس سلسلے میں ایک اہم بات انھوں نے یہ لکھی ہے کہ ناول کے پلاٹ میں تھوڑی سی پیچیدگی کا ہونا مستحسن ہے کہ یہ قاری کے دماغ کے لیے محرک کا کام دیتی ہے اور اسے اکساتی ہے کہ جو راز ہائے سربستہ ان کی نظروں کے سامنے سے گزر رہے ہیں وہ ان کے افشا کی کوشش کرے۔

ناول کی تنقید کے حوالے سے پہلی کتاب علی عباس حسینی کی ''ناول کی تاریخ وتنقید'' کے نام سے ۱۹۴۴ء میں منظر عام پر آئی۔اس کے بعد آج تک ناول کے بارے میں سینکڑوں تنقیدی کتابیں لکھی گئیں۔جن کے مصنفین میں احسن فاروقی ،نورالحسن ہاشمی، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر وقار عظیم، سہیل بخاری، پروفیسر عبدالسلام، پروفیسر یوسف سرمست،سید علی حیدر اور ہارون ایوب وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ علی عباس حسینی کی تصنیف ''ناول کی تاریخ وتنقید'' ناول کی تنقید کے حوالے سے پہلی کتاب مانی جاتی ہے جس میں مصنف نے ناول کے فن وفارم سے متعلق مفصل گفتگو کی ہے۔پہلے باب میں قصہ کے آغاز وارتقا کو بیان کیا ہے۔دوسرے باب میں ناول کی تعریف، اس کے اقسام، ناول کے عناصر ترکیبی سے بحث کی ہے۔تیسرا باب انگریزی ناول نگاروں اور ان کے اہم ناولوں کو شامل ہے۔چوتھے باب میں مصنف نے اردو کے عناصر ترکیبی کو بیان کیا ہے اور اسی ذیل میں اردو کے ناول نگاروں پر کچھ گفتگو کی ہے۔

پانچواں باب رتن ناتھ سرشار پر مشتمل ہے اور اس باب میں سرشار کے ناولوں اور ان کے کردار پر بحث کی ہے۔کتاب کے چھٹے باب میں عبدالحلیم شرر اور ان کے تاریخی ناول اور محمد علی طیب کی ناولوں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ساتویں باب میں مصنف نے سجاد حسین، مرزا عباس حسین ہوش، مرزا محمد ہادی رسوا اور راشد الخیری کے ناولوں پر بحث کی ہے اور اسی طرح آٹھویں باب میں منشی پریم چند اور ان کے ناول، بیوہ، بازار حسن، نرملا، میدان عمل، گئو دان پر گفتگو ہے اور نویں باب میں مرزا محمد سعید، فیاض علی، محمد مہدی تسکین، پنڈت کشن پرشاد کول، نیاز فتح

پوری، نواب محمد حسین اور دوسرے ناول نگاروں پر مفصل تبصرہ ہے۔ آخری باب میں علی عباس حسینی نے ''ترقی پسند ناول نویس''اور''دوسرے ناول نگار''،''اردو کے ناول کا مستقبل'' کے عنوانات کے تحت اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اپندر ناتھ اشک، عصمت چغتائی، کرشن چندر، سجاد ظہیر، قیسی رام پوری، عزیز احمد، رشید احمد وغیرہ کے ناولوں کے فن پر اجمالی طور پر تنقید کی ہے۔

محمد احسن فاروقی کی ایک اور کتاب ''اردو ناول کی تنقیدی تاریخ'' بھی ناول کی تنقید کے حوالے سے اہمیت رکھتی ہے جس میں انھوں نے اردو ناول نگاری کے ارتقا کا جائزہ لیا ہے لیکن اس سلسلے میں ان ناولوں کا ہی تنقیدی اور تفصیلی ذکر کیا ہے جو ان کے نزدیک اہم ہیں۔ وہ اردو نثر کی ابتدا اور نثری اصناف، داستان سے ناول کا آغاز اور ارتقا پر گفتگو کرتے ہیں اور میرامن کی باغ و بہار میں ناول کے اجزائے ترکیبی تلاش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مصنف نے کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے جس کے پہلے حصے میں اردو ناول کے اولین نقوش تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور نذیر احمد کے تمثیلی افسانے پر گفتگو کی ہے۔ دوسرے حصے میں سرشار، شرر اور رسوا کی ناول نگاری پر بحث کی ہے اور تیسرے حصے میں جدید ناول کے رجحانات اور ضروریات اور مستقبل پر تبصرہ کیا گیا ہے جو کئی اعتبار سے قابل لحاظ ہے۔

اردو ناول کی تنقید میں عبدالسلام نے اپنی کتاب ''بیسویں صدی میں اردو ناول'' لکھ کر ناول کے تنقیدی سرمایے میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنی اس کتاب میں عمیق مطالعے اور بصیرت سے کام لیتے ہوئے شرر سے لے کر رسوا، پریم چند، کرشن چندر، عصمت چغتائی، عزیز احمد، احسن فاروقی اور قرۃ العین حیدر تک کی ناول نگاری کے مخصوص فن اور فکر کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم کی تصنیف ''اردو فکشن کی تنقید'' جو ۱۹۹۶ء میں پہلی بار منظر عام پر آئی، فکشن کی تنقید من جملہ ناول و افسانے کی تنقید میں اہمیت کی حامل ہے۔ ارتضیٰ کریم نے اردو کے افسانوی ادب کی تنقید کی مختلف جہات کی بھرپور نمائندگی کی ہے لیکن بیسویں صدی کی نصف آخر کی آٹھویں دہائی کے بعد جن ناقدین نے تواتر کے ساتھ ناول کی تنقید کے ایک سے بڑھ کر ایک نمونے پیش کیے ہیں ان میں پروفیسر وہاب اشرفی، گوپی چند نارنگ، عبدالمغنی، وارث علوی، شمیم حنفی، قدوس جاوید، ابوالکلام قاسمی، عتیق اللہ، اطہر جاوید اور علی احمد فاطمی خصوصیت کے

ساتھ قابل ذکر ہیں۔

اردو میں جس طرح ناول کی ابتدا ہو جانے کے بعد بھی داستان پوری آب و تاب کے ساتھ زندہ رہی۔ اسی طرح ناول کے عین فنی عروج کے زمانہ میں مختصر افسانہ پیدا ہوا اور پروان چڑھنا شروع ہوا۔ افسانہ کی پیدائش کے دن وہ ہیں جب ہمارا ناول آہستہ آہستہ فلسفہ، منطق اور نفسیات کی دنیا میں قدم رکھ رہا تھا۔ امراؤ جان ادا اور خواب ہستی کی تخلیق کا دور افسانہ کی پیدائش کا زمانہ ہے، پھر ایک اور بات ہے کہ ناول کہانی کی ایک منفرد اور ممتاز صنف ہونے کے باوجود مدتوں اپنے آپ کو داستان کے سحر و افسوں سے آزاد نہ کر سکا اور ہمارے ابتدائی ناول نگاروں میں سے ہر ایک کے یہاں داستان کے رنگ کی جھلکیاں اور اس کے نور کی کرنیں برابر اپنا جلوہ دکھاتی رہیں۔ یہی صورت مختصر افسانہ کے ساتھ پیش آئی۔ ہمارے مختصر افسانہ کے ابتدائی دور میں واضح طور پر داستان کی دلکش روایت کا عکس جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

افسانے کی تنقید کے سلسلے میں پریم چند کی بعض تحریریں ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ مثلاً ''سوز وطن'' کا دیباچہ یا ''میں افسانہ کیوں لکھتا ہوں'' یا ''میرے بہترین افسانے'' یا ''ہماری قوت بیانیہ کا زوال'' جو ۱۹۰۸ء سے ۱۹۳۳ء کے دوران شائع ہوئے۔ یہ مضامین ابتدائی ضرور ہیں لیکن جہاں پریم چند کی تنقیدی اور فنی بصیرت کا پتہ دیتے ہیں وہیں افسانے کی تنقید کی بنیاد بھی استوار کرتے ہیں۔ پریم چند نے یہ مضامین ایسے زمانے میں لکھے جب اردو افسانہ اپنی تعمیر کی منزلوں سے گزر رہا تھا۔ اردو افسانہ کو فنی اور جمالیاتی اعتبار سے عروج پر پہنچانے کی ذمہ داری خود پریم چند ہی نبھا رہے تھے۔ اس پورے دور میں افسانہ پر داستان نگاری اور قصہ گوئی کے اثرات غالب رہے۔ صرف کرداروں اور واقعات کی پیش کش میں بادشاہوں اور وزیروں، شہزادیوں اور مافوق الفطری مخلوقات اور تصورات، حیران کن واقعات کی جگہ فرضی سماجی کردار اور واقعات لے رہے تھے۔ اردو مختصر افسانہ، قصہ اور کتھا کے دائرے سے پورے طور پر باہر نہیں نکل سکا تھا۔ ایسی حالت میں افسانہ کے بارے میں پریم چند کے خیالات اردو مختصر افسانہ کی تنقید کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

پریم چند نے یہ باتیں اس وقت لکھی تھیں جب ابھی افسانہ کی تنقید کے حوالے سے کوئی باضابطہ کتاب تو کیا مضمون بھی سامنے نہیں آیا تھا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح پریم چند اردو افسانہ کے پہلے معتبر معمار ہیں

اسی طرح انھوں نے افسانہ کی تنقید کی تشکیل کی بھی سنجیدہ کوششیں کیں۔ اردو افسانہ میں نظریاتی، فنی اور جمالیاتی محاسن کے جو ابتدائی عناصر سامنے آئے اس کا اندازہ، اردو کے چند اولین افسانوں یا افسانہ نما تحریروں سے لگایا جاسکتا ہے۔

۱۹۳۵ء تک اردو کے بعض رسائل مثلاً نیرنگ خیال، مخزن، زمانہ، ہمایوں، نگار، ادبی دنیا، اردو، العصر، عالمگیر اور ادیب وغیرہ میں افسانہ اور افسانہ نگاروں کے بارے میں کبھی کبھار تنقیدی مضامین شائع ہوتے رہے لیکن ایسے تنقیدی مضامین کی تعداد پچیس تیس سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس پورے دور میں اکثر ناقدین افسانہ کو مغربی Short Story کی ہیئت وتکنیک کی روشنی میں نہیں بلکہ مشرقی ''فسانہ'' یعنی قصہ یا کتھا کے طور پر دیکھتے تھے۔ اسی لیے اس دور میں افسانے کی تنقید کے نام پر جو کچھ بھی لکھا گیا ان میں داستان، حکایت اور قصہ کی خوبیوں اور خامیوں کو ذہن میں رکھ کر ہی لکھا گیا۔

۱۹۳۵ء تک پریم چند کے علاوہ بھی متعدد افسانہ نگاروں اور دانشوروں نے افسانے کی تنقیدی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک اہم نام پروفیسر عبدالقادر سروری کا ہے جن کی تصنیف 'دنیائے افسانہ' اردو میں فکشن یا افسانوی ادب کے اصول وضوابط مرتب کرنے کی سنجیدہ اور قابل تعریف کوشش ہے۔ حالاں کہ عبدالقادر سروری نے اپنی تصنیف میں مغربی افسانہ نگاروں اور مغربی افسانہ کے امتیازات کی باتیں زیادہ کی ہیں اور وہ یہ مانتے ہیں کہ اردو میں ان کے عہد تک افسانہ کے فن پر زیادہ نہیں لکھا گیا ہے۔

اردو کے انقلابی افسانوں کا مجموعہ ''انگارے'' ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا اور احمد علی کے مغربی افسانوں کے معیار کے افسانوں کا مجموعہ ''شعلے'' ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا لیکن ۱۹۳۰ء کے آس پاس پریم چند کے کئی افسانے شاہکار کا درجہ حاصل کر چکے تھے۔ ان کا غیر معمولی شاہکار ''کفن'' بھی ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔ ''انگارے''، ''شعلے'' اور ''کفن'' کی اشاعت کے بعد اردو افسانہ میں جہاں فنی وتکنیکی، لسانی وموضوعاتی اعتبار سے اجتہادی تبدیلیاں رونما ہوئیں وہیں افسانہ کی تنقید میں بھی نئے امکانات پیدا ہوئے۔ اسی دوران ہندوستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا اور ترقی پسند تحریک کی شروعات ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء کے بعد ایک طرف جہاں حقیقت پسندانہ اور انقلابی افسانے بڑی تعداد میں لکھے جانے لگے خاص طور پر پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، احمد

ندیم قاسمی، غلام عباس، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو اور خواجہ احمد عباس وغیرہ نے شاہکار افسانے تخلیق کیے وہیں وقار عظیم، مجنوں گورکھپوری، علی عباس حسینی، صلاح الدین احمد، احتشام حسین، اختر اور ینوی، ممتاز حسین، محمد حسن عسکری اور احسن فاروقی وغیرہ نے افسانہ کے فنی و جمالیاتی تقاضوں اور امکانات کے حوالے سے مضامین لکھ کر اردو میں افسانے کی تنقیدی روایت کو ایک نیا معیار بھی بخشا اور اس کی رفتار بھی تیز کی۔

۱۹۳۵ء میں ہی مجنوں گورکھپوی کی کتاب ''افسانہ اور اس کی غایت'' منظر عام پر آئی جو آج کے معیار کے مطابق بہت زیادہ اہم تو نہیں ہے پھر بھی مجنوں نے افسانہ میں پلاٹ، واقعات، کردار، عصری زندگی اور زمانہ کی پیش کش اور طرز بیان کی دلکشی وغیرہ کے برتاؤ کے بارے میں جو خیالات بیان کیے ہیں ان سے ان کے تنقیدی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ لیکن چوں کہ مجنوں گورکھپوری ترقی پسند نظریہ کے حامی تھے اس لیے وہ اپنے ماحول اور معاشرہ کے مسائل اور حقائق کی پیش کش کو افسانہ کے لیے لازمی قرار دیتے ہیں۔

اس سلسلے میں کئی نام سامنے آئے ہیں لیکن اردو میں افسانے کی تنقید سے متعلق سید وقار عظیم کی سب سے مقبول اور تفصیلی تصنیف ''داستان سے افسانے تک'' ہے۔ یہ کتاب اردو میں فکشن کی اشاراتی تاریخ کے ساتھ تذکرہ بھی ہے اور تحقیق و تنقید بھی۔ وقار عظیم نے اپنی اس تصنیف میں اردو افسانہ کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے مغرب میں مختصر افسانہ کے آغاز و ارتقا کا جائزہ لیا ہے اور افسانہ سے متعلق مغربی افسانہ نگاروں اور نقادوں کی تعریفوں اور وضاحتوں کی تفصیل درج کرتے ہوئے اردو میں افسانے کی روایت کے حوالے سے تجزیہ و تفہیم اور تشریح و تعبیر کے فرائض بھی انجام دیئے ہیں۔ وقار عظیم نے افسانہ کے لیے مقصدیت اور زندگی کے جھیلے ہوئے حقائق کی ترجمانی کو لازمی قرار دیا۔ اس اعتبار سے وقار عظیم نے پہلی بار، عبدالقادر سروری اور مجنوں گورکھپوری کے مقابلے میں کہیں زیادہ پختہ تنقیدی شعور کا ثبوت دیا ہے۔ اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ وقار عظیم نے اردو میں افسانے کی تنقید کا ایک معیار قائم کیا جسے بعد کے ناقدین پروفیسر قمر رئیس، شکیل الرحمٰن، ممتاز شیریں، جعفر رضا، ش اختر اور کئی دوسرے ناقدین نے بڑی کامیابی کے ساتھ آگے بڑھایا۔

جدیدیت کے رجحان کے تحت اردو میں علامتی افسانہ، تجریدی افسانہ، اینٹی اسٹوری، پلاٹ لس افسانہ وغیرہ پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ حالاں کہ ادب میں تجربہ معیوب نہیں اور نہ ہی روایت سے انحراف کو غلط قرار دیا

جا سکتا ہے بلکہ نئے تجربوں سے ہی ادب آگے بڑھتا ہے،لیکن جدیدیت کے رجحان کے تحت علامت نگاری اور تجریدیت کے نام پر فیشن پرستی زیادہ ہوئی۔اس دوران افسانے کی تنقید، افسانے کی روایت، اردو افسانہ اور جدیدیت، پریم چند کی روایت، افسانہ میں پلاٹ اور کہانی پن کی اہمیت جیسے موضوعات پر سینکڑوں کتابیں اور مضامین لکھے گئے۔اس ضمن میں خاص طور پر''افسانے کی حمایت میں''(شمس الرحمٰن فاروقی)،''افسانہ حقیقت سے علامت تک''(سلیم اختر)،''اردو افسانہ روایت اور مسائل''(گوپی چند نارنگ)،''ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ''(پروفیسر محمد صادق)،''نیا اردو افسانہ: مسائل اور میلانات''(قمر رئیس)،''شناخت''(ڈاکٹر اختر)، ''جدید افسانہ اور اس کے مسائل''(وارث علوی)،''علامتی افسانہ''(مجید مضمر) وغیرہ بنیادی اہمیت کی حامل کتابیں ہیں جن میں افسانے کی تنقید پر قابل ذکر مواد موجود ہے۔

مرزا حامد بیگ نے اپنی کتاب''افسانے کا منظر نامہ''میں اردو افسانے کے ارتقائی سفر کا عہد بہ عہد جائزہ لیتے ہوئے افسانے کے ماضی،حال اور مستقبل پر بھی تبصرہ کیا ہے۔مصنف نے داستان اور افسانہ کے فنی وفکری پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور اس بات کا افسوس کیا ہے کہ آج افسانہ کا رشتہ داستان سے کٹ کر رہ گیا ہے۔وہ داستان کو افسانے کے لیے ایک ایسی کڑی تصور کرتے ہیں جس سے کٹ کر آج اردو افسانہ بھیڑ میں کھوئے ہوئے بچے کی طرح تنہا رہ گیا ہے۔

شمیم حنفی کا نام بھی اردو فکشن بالخصوص افسانے کی تنقید کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔ان کی کتاب ''کہانی کے پانچ رنگ'' ہے جس میں انھوں نے پریم چند، سجاد حیدر یلدرم، سعادت حسن منٹو، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کو اردو افسانے کے پانچ رنگوں سے منسوب کیا ہے۔ان کے مطابق اردو افسانہ اب تک پانچ رجحانات سے گزرا ہے اور مذکورہ پانچوں فن کار اپنے اپنے عہد کے بدلتے ہوئے رجحانات کے نمائندے ہیں۔یہ رجحانات حقیقت پسندی(پریم چند)، رومانیت(سجاد حیدر یلدرم)، ترقی پسند(سعادت حسن منٹو)، جدیدیت (قرۃ العین حیدر) اور مابعد جدیدیت (انتظار حسین) ہیں۔یہ کتاب اردو کے نمائندہ افسانہ نگاروں کی تفہیم کے ساتھ افسانے کے بدلتے رویوں کو سمجھنے میں بھی مددگار ہے۔

اردو افسانے کی تنقید میں شہزاد منظر نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔اس حوالے سے ان کی دو تنقیدی کتابیں

''جدید اردو افسانہ'' اور ''علامتی افسانے کے ابلاغ کا مسئلہ'' شائع ہو چکی ہیں۔ پہلی کتاب میں افسانے کی اہمیت و معنویت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور شاید یہ پہلی کتاب ہے جس میں جدید افسانہ کے فنی اور تکنیکی امتیازات پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ہندوستان اور پاکستان کے نمائندہ جدید افسانہ نگاروں کی خوبیوں اور خامیوں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ مصنف نے اپنی اس کتاب میں صنف افسانہ کے بنیادی امتیازات، روایات اور اجتہادات کے پس منظر میں اپنے خدشات کا بھی اظہار کیا ہے۔ خاص طور پر افسانویت یا کہانی پن کے بارے میں شہزاد منظر نے کھل کر اظہار خیال کیا ہے اور کہا ہے کہ کہانی پن افسانہ کا لازمی جز ہے۔

عصر حاضر کے افسانوں کی تنقید کے حوالے سے پروفیسر صغیر افراہیم کا نام بھی قابل ذکر ہیں جنھوں نے افسانوی تنقید سے متعلق نصف درجن کتابیں تحریر کی ہیں جن میں ''اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل'' اور ''افسانوی ادب کی نئی قرأت'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی پہلی کتاب ''اردو افسانہ ترقی پسند تحریک سے قبل'' میں اردو افسانے کے آغاز سے لے کر ترقی پسند تحریک تک کے افسانوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد حقیقت پسندانہ رجحانات اور رومانی میلانات کے زیر اثر ابھرنے والے افسانہ نگاروں پر خصوصی تبصرہ کیا ہے۔

وہاب اشرفی کا شمار فکشن کے نمائندہ ناقدین میں ہوتا ہے۔ انھوں نے درجنوں کتابیں اردو ادب کے حوالے سے لکھی ہیں لیکن افسانے کی تنقید کے حوالے سے ''اردو فکشن اور تیسری آنکھ''، ''معنی کی تلاش''، ''آ گہی کا منظر نامہ'' وغیرہ قابل لحاظ ہیں۔ اسی طرح افسانے کی تنقید میں سید محمد عقیل کے اردو افسانے پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ''اردو افسانے کی نئی تنقید'' افسانے کی تنقید میں قابل قدر اضافہ ہے جسے ڈاکٹر طاہرہ پروین نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کو دو حصوں میں ترتیب دیا گیا ہے پہلے حصے میں سید محمد عقیل کے نظریاتی مضامین کو جگہ دی گئی ہے جن میں جدید اور جدید تر افسانہ اور افسانہ نگاروں کے مسائل اور کشمکش کو سامنے لایا گیا ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں مشہور افسانہ نگار پریم چند، کرشن چندر، بیدی، عصمت چغتائی، علی عباس حسینی، رشید جہاں اور یلدرم وغیرہ کی شخصیت اور کہانیوں کے تجزیاتی مطالعہ کو پیش کیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو افسانے کی بیشتر تنقید تاثراتی نوعیت کی ہے یا تعریف و تحسین سے عبارت ہے۔ چند نقادوں کو مستثنیٰ کر کے باقی نے موضوعی، شخصی یا شاعری کے پیمانوں پر افسانے کو پرکھا اور معیار متعین

کیے۔ جب فکشن تنقید کا احتساب کر کے آرٹ کے مباحث اور اس کے فنی امکانات کونشان زد کیا گیا تو اندازہ ہوا کہ افسانے کی تنقید نہایت کمزور اور محدود ہے۔

داستان کی تنقید کے ابتدائی نقوش ہمیں ادبی رسائل و جرائد میں مضامین و مقالات کی شکل میں ملتے ہیں۔عبدالحلیم شرر نے اپنے رسالے ''دلگداز'' میں ''ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ'' کےعنوان سے مضامین لکھے جنھیں بعد میں ''گزشتہ لکھنؤ'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع کیا۔انھوں نے اسی رسالے کے شمارہ فروری ۱۹۱۵ء میں داستان کےفن پر بھی ایک مضمون شائع کیا۔اس مضمون میں داستان کی تنقید کے بنیادی نقوش دیکھے جاسکتے ہیں۔

اردو کے چند اہم رسائل و جرائد جن میں داستان کی تنقید کے حوالے سے مضامین شائع ہوئے ہیں ان میں نیرنگ خیال، الناظر،دلگداز، معارف،نگار، ادبی دنیا اور معاصر خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ وہ مضامین جن کو اس سلسلے میں اولیت حاصل ہے ان میں سید محمد قادری کا ''سید حیدر بخش حیدری اور شیرعلی افسوس'' اور غلام محی الدین قادری زور کا ''فسانہ عجائب اور باغ و بہار'' خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔اس کے بعد کے جن ناقدین نے داستان کی تنقید کی ہے ان میں مسعود علی ذوقی،محمد یاسین علی خاں،خواجہ عبدالرؤف عشرت،شاہد احمد دہلوی،محمد تقی خیال اور سید ابوالخیر کشفی کے نام آتے ہیں۔لیکن ان افراد نے باقاعدہ طور پر داستان کی تنقید پر قابل ذکر مواد نہیں چھوڑا ہے۔

عبدالحلیم شرر نے اردو داستانوں کے لیے جو لوازم قرار دئے ہیں وہ بجا ہیں اور تقریباً تمام داستانوں میں موجود ہیں۔ان کی یہ رائے مبنی برصواب ہے لیکن اس رائے سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ صرف لکھنؤ کے داستان گویوں نے انھیں پورے طور پر برتا ہے اور اس میں نام کمایا بلکہ دبستان دلی کے اہم داستان گویوں نے بھی اسے پورے طور پر برتنے کے ساتھ ایسی داستانیں لکھیں جنھیں اردو ادب کی اہم داستانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں داستان کی تنقید میں اہم ناقدین سامنے آتے ہیں۔ان ناقدین میں کلیم الدین احمد،محمد حسن عسکری، گیان چند جین، وقار عظیم، سید ابوالخیر کشفی،ممتاز حسین،مسعود حسین خاں، نیر مسعود، وحید قریشی،محمود الٰہی،عبدالستار دلوی، رفیع الدین ہاشمی،سلیم اختر،سہیل احمد خاں، سہیل بخاری،رشید حسن خاں اور

حنیف نقوی کے نام پیش پیش ہیں۔

اردو فکشن کی تنقید میں ڈرامے کی تنقید بھی اپنی گونا گوں خصوصیات کی وجہ سے قابل توجہ ہے۔انیسویں صدی میں ڈرامے کی تنقید کے کچھ نمونے ہمیں ڈراموں کے دیباچوں وغیرہ میں مل جاتے ہیں۔لیکن ان میں بھی زیادہ تر زبان و بیان سے بحث کی گئی ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ابتدا میں اردو ڈرامے پر تنقید نہ تو فنی نقطہ نظر سے تھی اور نہ ہی تکنیک کے اعتبار سے، بلکہ اکثر ناقدین اس کا اخلاقی پہلو سامنے لانے کی کوشش کرتے اور اسے ایک فن کی حیثیت سے قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے شروع میں ڈرامے کی تنقید میں ایک زبردست انقلاب آیا۔اردو ڈراما نگاروں نے مافوق الفطری عناصر اور ماورائی دنیا کی پیش کش کے بجائے اسے زندگی کی حقیقتوں سے روشناس کرایا۔اس میں مافوق الفطری عناصر کے بجائے حقیقی زندگی کی الجھنوں، پریشانیوں اور سماجی و معاشرتی مسائل پیش کیے جانے لگے۔اس طرح اردو ڈراما حقیقت نگاری سے بہت قریب ہوگیا۔انسانی زندگی اوراس کے مسائل کا ترجمان ہونے کی وجہ سے ڈرامے کی تنقید کا بھی رخ بدل گیا۔اب اس کی خوبیاں اور خامیاں نفس مضمون کے پیش نظر بیان کی جانے لگیں۔اس میں خارجی عناصر کے ساتھ ساتھ داخلی عناصر پر توجہ دی جانے لگی اوراس کے تمثیلی پہلو پر بھی زور دیا جانے لگا۔

ترقی پسند تحریک کے زیراثر جب ڈراموں میں عصری، سماجی، معاشرتی اور سیاسی مسائل پیش کیے جانے لگے تو ناقدین نے اس فن شریف کی طرف توجہ مبذول کی۔بیسویں صدی کے نصف آخر خصوصاً آزادی کے بعد ڈراموں کی تنقید پر لکھا جانے لگا۔اس دوران جن افراد نے ڈرامے کی تنقید پر لکھا ہےان میں عبدالعلیم نامی، بادشاہ حسین، صفدر آہ، احتشام حسین، فصیح احمد صدیقی، قمر رئیس، عطیہ نشاط، اخلاق اثر، محمد شاہد حسین، وقار عظیم، محمد تاتار خان، محمد قاسم، محمد منصور انصاری، شہناز صبیح اور ڈاکٹر فرحانہ وغیر کے نام قابل ذکر ہیں جنھوں نے ڈرامے کے فن، اسلوب اور زبان و بیان سے بحث کی ہے۔

چار جلدوں پر مشتمل عبدالعلیم نامی کی کتاب ’’اردو تھیٹر‘‘ پارسی اسٹیج کے بارے میں معلومات کا خزانہ ہے، لیکن تحقیقی نقطہ نظر سے اس میں بہت سی خامیاں ہیں۔نامی نے اس کتاب میں بہت سی باتیں بغیر کسی حوالے اور

بغیر ثبوت کے لکھ دی ہیں۔انھوں نے اردو ڈراموں کی ببلیو گرافی بھی تیار کی اور اردو تھیٹر کے حوالے سے قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔

ڈاکٹر فصیح احمد صدیقی نے اردو کے یک بابی ڈرامے کی تاریخ تقریباً پندرہ سو صفحات میں مرتب کی ہے۔یہ کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے۔صدیقی نے ڈرامے کی تنقید و تحقیق پر جو خیالات پیش کیے ہیں یا اردو ڈراموں پر جو تبصرہ کیا ہے ان سے اختلاف کی گنجائش تو ہے مگر ان کے اس کام کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ڈرامے کی تنقید پر عشرت رحمانی کی دو کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔''اردو ڈرامے کی تاریخ وتنقید''اور''اردو ڈراما کا ارتقا''۔ دوسری کتاب کو پہلی کتاب کا ہی دوسرا ایڈیشن قرار دیا جا سکتا ہے جس میں معمولی تبدیلی کے بعد دو نئے باب شامل کر دیئے گئے ہیں۔اس کتاب میں انھوں نے ڈرامے کے فن، تکنیک اور اجزائے ترکیبی کے ساتھ اردو ڈرامے کی تاریخ پر جامع بحث کی ہے۔کتاب کے آخر میں بعض اہم ڈراموں کے انتخابات بھی پیش کیے ہیں۔

محمد اسلم قریشی کی کتاب''ڈرامے کا تاریخی وتنقیدی پس منظر''جو مجلس ترقی ادب، لاہور سے ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی تحقیقی نقطہ نظر سے بہت وقیع ہے، اس میں مغربی اور مشرقی دونوں ڈراموں کا احاطہ کیا گیا ہے۔اس میں ہر بات کے لیے مستند حوالے موجود ہیں۔کتاب کے مطالعے سے اسلم قریشی کے مطالعے کی وسعت اور تنقیدی شعور وبصیرت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔اس کتاب میں انھوں نے ڈرامے کی تنقیدی تاریخ پیش کی ہے اور ڈرامے کے منظر اور پس منظر پر استدلالی بحث کی ہے۔اس کتاب کی اہمیت اس وجہ سے بھی اور بڑھ جاتی ہے کہ اس میں انھوں نے تاریخ کے ذیل میں صحتمند تنقید سے بھی بھرپور کام لیا ہے۔بعض مقامات پر انھوں نے بعض ڈراموں کی خوبیوں کا جی کھول کر تذکرہ کیا ہے لیکن اس بات کا بھی خیال کیا ہے کہ جہاں کہیں ان ڈراموں میں خامیاں اور کمیاں در آئی ہیں ان سے صرف نظر بھی نہیں کیا ہے۔

پروفیسر سید حسن کی کتاب''بہار کا اردو اسٹیج اور اردو ڈراما''پہلی بار مئی ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی۔اس کتاب میں مصنف نے بہار کے اردو ڈرامے اور تھیٹر کی تاریخ بہت کامیابی کے ساتھ پیش کی ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے محمود میاں رونق، الف خاں حباب، حسینی میاں ظریف اور سید مہدی حسن احسن لکھنوی کی ڈراما نگاری پر مختلف وقتوں میں لکھے اپنے مضامین بھی شامل کر دیے ہیں۔ان کی شمولیت سے کتاب کی اہمیت دو چنداں ہوگئی ہے۔

ابراہیم یوسف نے ''اردو کے اہم ڈراما نگار'' کے نام سے تین جلدوں میں ایک کتاب تصنیف کی۔ ان کی دوسری تصنیف ''اندر سبھا اور اندر سبھائیں'' ہے جس میں انھوں نے چار اندر سبھاؤں کی ترتیب دی ہے۔ اس کے مقدمے میں ان سب کا موازنہ بھی کیا ہے۔ اس دور کے ڈراموں پر تنقید لکھنے والوں میں احتشام حسین، مسیح الزماں اور محمد حسن کے نام قابل ذکر ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ڈرامے میں بھی عصری مسائل پیش کیے جانے لگے۔ سماجی، معاشرتی اور سیاسی مسائل اردو ڈرامے کا موضوع بنے۔ ترقی پسند ناقدین نے بھی اردو ڈرامے میں تفریحی عناصر کی جگہ سماجی مسائل اور فکر کی گہرائیوں کی طرف توجہ کی اور انھیں سماجی نقطہ نظر سے جانچا اور پرکھا۔ لیکن ان ناقدین کے یہاں صحتمند تنقید کا فقدان ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان ناقدین نے ڈرامے کے کسی ایک پہلو کو لیا ہے اور اسی پر سارا زور صرف کر کے اس ڈرامے کے متعلق اپنی رائے پیش کر دی ہے۔

احتشام حسین نے بھی ڈراموں کی تنقید میں حصہ لیا لیکن ان کی تنقید سائنٹفک ہے۔ یہ پہلے نقاد ہیں جنہوں نے مارکسی نظریات پر سائنٹفک تنقید کی بنیاد استوار کی۔ سائنٹفک تنقید سے مراد یہ ہے کہ جس طرح سائنس کسی چیز کے تجزیہ کے وقت اس کے ہر پہلو کو سامنے رکھتی ہے، اسی طرح سائنٹفک تنقید بھی ادب کے مطالعہ کے وقت اس کے ہر پہلو کو مدنظر رکھتی ہے، نیز تنقید کی بنیاد سماجی، نفسیاتی، جمالیاتی، تاثراتی، مادی وجدلیاتی حقیقتوں پر رکھی گئی ہے۔ یہی سبب ہے کہ احتشام حسین ڈراموں کے مطالعے کے لیے ہر قسم کے علم سے مدد لینا ضروری سمجھتے ہیں مثلاً تاریخ، نفسیات، سیاسیات، عمرانیات اور سائنس وغیرہ اور وہ ادب کو سماجی، تاریخی، تہذیبی، معاشی، اخلاقی اور معاشرتی، قدروں کا آئینہ سمجھ کر اس کا تجزیہ کرتے ہیں، ادب کی غایت ان کے یہاں اجتماعی اور سماجی ہے، جو کہ زندگی کو فلاح و بہبود، حسن و مسرت اور دلکشی اور شادمانی عطا کرنے کے لیے ہے۔

ان کے بعد اردو ڈراما نگاری پر لکھنے والوں میں عطیہ نشاط، قمر اعظم ہاشمی، نثار احمد فاروقی، ظہور الدین، ابراہیم یوسف، محمد حسن اور شمیم حنفی وغیرہ کے نام اہم ہیں جنھوں نے ڈراموں کے حوالے سے متوازن اور سلجھی ہوئی گفتگو کی ہے۔ ان افراد نے ڈرامے کے فن اور اس کی تاریخ نیز ڈراموں کی عملی تنقید کے بھی اچھے نمونے پیش کیے ہیں۔ ڈرامے کی تنقید پر آج بھی رسالوں میں مضامین دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ لیکن جس قدر افسانے اور ناول کی تنقید لکھی جا رہی ہے، ڈرامے کی تنقید اس سے محروم ہے۔ کیوں کہ اب آہستہ آہستہ ڈراموں سے دلچسپی بھی کم

ہوتی جارہی ہے۔جب لوگ ڈراموں کو دلچسپی سے پڑھیں گے ہی نہیں تو اس پر لکھنا تو اور بھی مشکل ہے۔بہر صورت ڈرامے کی تنقید کا مستقبل بہت تابناک نہیں ہے۔

یہی حال تمثیل کی تنقید کا بھی ہے۔اب تمثیل کی تنقید سے متعلق مضامین رسائل وجرائد میں گاہے بہ گاہے دیکھنے کو ملتے ہیں۔اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اب تمثیل کی تخلیق ہی ختم ہوگئی ہے تو ایسی صورت میں تمثیل پر تنقید کی تخلیق کارے دارد۔تمثیل کی تنقید پر چند اہم لکھنے والوں میں مولوی عبدالحق، گیان چند جین، ڈاکٹر منظر اعظمی اور غلام رسول مکرانی وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

اردو فکشن کے چند اہم ناقدین میں جن پر اس مقالے میں تفصیلی بحث کی گئی ہے پروفیسر کلیم الدین احمد، وقار عظیم، سید احتشام حسین، گیان چند جین، ممتاز شیریں، دیویندر اسر، سید محمد عقیل، پروفیسر گوپی چند نارنگ، قمر رئیس، ڈاکٹر سلیم اختر، شارب ردولوی، شمس الرحمٰن فاروقی، وہاب اشرفی، یوسف سرمست، عبدالمغنی، قدوس جاوید، مرزا حامد بیگ، علی احمد فاطمی، اعجاز علی ارشد، ارتضیٰ کریم اور شہاب ظفر اعظمی شامل ہیں۔

کلیم الدین احمد کی تنقید کا اصل محور انگریزی کے اخبارات ورسائل تھے۔انھوں نے اگرچہ اپنے تنقیدی رویوں میں مغربی تنقید کے اصول ونظریات سے استفادہ کیا ہے لیکن اس سے اردو فکشن کی تنقید میں ایک نئی تجزیاتی روش سامنے آئی اور فن پاروں کے متن اور الفاظ کی سطح تک گفتگو کرنے کا ایک نیا باب روشن ہوا۔وقار عظیم نے بھی افسانہ ناول اور داستان کی تنقید پر کچھ بنیادی کام کیے ہیں۔ان کی اہم کتابوں میں ''ہمارے افسانے''، ''افسانہ نگاری''، ''داستان سے افسانے تک'' اور ''ہماری داستانیں'' ہیں جن سے فکشن کی تنقید کے نئے تیور سامنے آئے۔

سید احتشام حسین بنیادی طور پر ایک ترقی پسند نقاد کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ان کی تنقید پر مشرقی طرز تنقید کا گہرا اثر ہے۔ان کی تنقیدی کتابوں کے مطالعے سے ان کے وسیع مطالعہ اور نظری اور عملی تنقید میں ان کے منطقی اور توضیحی طرز تنقید کا اندازہ ہوتا ہے۔گیان چند جین کی کتاب ''اردو کی نثری داستانیں'' ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔اردو داستانوں کے بالاستیعاب مطالعہ کے لیے اس کتاب کی اہمیت وانفرادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ممتاز شیریں ایک سنجیدہ نقاد کے طور پر جانی جاتی ہیں۔ان کی اہم تنقیدی کتاب ''مغربی افسانے کا اثر اردو افسانے پر'' انہیں فکشن کی تنقید میں شہرت وعظمت دلانے کے لیے کافی ہے۔دیویندر اسر نئی نسل

کے ان ناقدین میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے نفسیات کے ساتھ وجودیت، سریلزم اور دیگر ادبی تحریکوں سے براہ راست اثر قبول کیا ہے۔ جب وہ نفسیات کا مطالعہ پیش کرتے ہیں تو صرف اس کے افادی پہلوؤں کو ہی پیش نظر نہیں رکھتے بلکہ جدید ذہن کی کشمکش اور اس کی الجھنوں کا بھی تجزیہ کرتے ہیں۔ سید محمد عقیل کی فکشن کی تنقید کے حوالے سے نمائندہ کتاب ''جدید ناول کا فن'' ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے نہ صرف اردو فکشن بلکہ مغربی فکشن پر ان کی گہری نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ عالمی صورت حال کے حوالے سے عالم کاری کے گہرے شعور کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں۔ ورنہ اس سے قبل ان کا مطالعہ تاریخی اور تہذیبی حوالوں سے ہی ہوا کرتا تھا۔

گوپی چند نارنگ فکشن کی تنقید کے حوالے سے ایک اہم نام ہے۔ انھوں نے اپنے مخصوص تنقیدی نظریات وتصورات کی وجہ سے فکشن کی تنقید میں قابل رشک مقام حاصل کرلیا ہے۔ ان کے تنقیدی افکار ونظریات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے حالی اور شبلی کے تصورات کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنی تنقید میں لسانیات، اسلوبیات اور ادبی تھیوری پر خصوصی توجہ صرف کرتے ہیں۔ قمر رئیس کا اصل میدان پریم چند اور فکشن کی تنقید ہے۔ ان کی تحریروں میں اعتدال وتوازن موجود ہے۔ وہ اپنی ذاتی پسند و ناپسند کی بنیاد پر فیصلہ نہیں صادر کرتے بلکہ اپنی باتوں کو مدلل اور سلجھے ہوئے انداز میں بیان کرتے ہیں۔

سلیم اختر کی اردو میں کئی حیثیتیں ہیں۔ وہ مایہ ناز نقاد، نامور افسانہ نگار، ماہر لسانیات، ماہر اقبالیات اور ادبی مورخ کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ان کی تنقید کا دائرہ کافی وسیع ہے لیکن افسانے کی تنقید کے حوالے سے ان کی اہم کتاب ''افسانہ حقیقت سے علامت تک'' اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد ہے۔ پروفیسر شارب ردولوی تنقید کی دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہیں۔ ان کا اصل میدان مرثیہ کی تنقید ہے، البتہ وہ دیگر موضوعات پر بھی مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ موصوف تنقید کو محض عیب جوئی اور نکتہ چینی نہیں قرار دیتے بلکہ تخلیق میں پوشیدہ خصوصیات کا پتہ لگا کر اس کی صحیح قدر و قیمت متعین کرتے ہیں۔

فکشن کی تنقید کے حوالے سے ایک اہم ترین نام شمس الرحمٰن فاروقی کا ہے۔ ان کی کتاب ''افسانے کی حمایت میں''، فکشن کی تنقید کی بوطیقا قرار دی جاسکتی ہے۔ لیکن اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے فاروقی صاحب افسانے کو شاعری سے کمتر خیال کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں افسانہ اتنی گہرائی اور باریکی کا متحمل نہیں ہوسکتا جو

شاعری کا وصف ہے۔ وہ بیانیہ کا محتاج اور وقت کے چوکھٹے میں اسیر ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کسی واقعے کے بغیر افسانہ نہیں لکھا جا سکتا۔ انہوں نے افسانے کو اسلوبیات اور لسانیات کے اعتبار سے بھی جانچا اور پرکھا ہے۔ ان کے تنقیدی رویے بڑی حد تک معروضیت کے مقتضی ہیں۔

علی احمد فاطمی، اعجاز علی ارشد، ارتضی کریم اور شہاب ظفر اعظمی نے بھی فکشن کی تنقید کے حوالے سے قابل ذکر نمونے پیش کیے ہیں۔ ''عبدالحلیم شرر بحثیت ناول نگار''، ''پریم چند نئے تناظر میں''، ''ہم عصر اردو ناول ایک مطالعہ'' (علی احمد فاطمی)، ''ہم عصر اردو فکشن: چند زاویے'' (اعجاز علی ارشد)، ''اردو فکشن کی تنقید'' (ارتضی کریم)، ''اردو ناول کے اسالیب''، ''جہان فکشن'' اور ''مطالعات فکشن'' (شہاب ظفر اعظمی) فکشن کی تنقید پر اہم کتابیں ہیں۔ مندرجہ بالا ناقدین سے ابھی فکشن کی تنقید کے حوالے سے مستقبل میں اور بھی کتابوں کی تصنیف و تالیف کی امید کی ہے۔ مذکورہ ناقدین نے فکشن کی افہام وتفہیم کی قابل قدر کوشش کی ہے اور فکشن کی تنقید کو نئے آفاق سے روشناس کرایا ہے۔ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل میں فکشن کی تنقید کے مزید امکانات روشن ہوں گے اور اس باب میں فکشن کے ناقدین بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے۔

اس مجموعی جائزے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بیسویں صدی کی پہلی دہائی تک فکشن کی تنقید نے جو سفر طے کیا اس میں وہ زندگی کی حقیقت کی ترجمانی سے مشروط ہے۔ اس دوران فکشن کی تنقید مجموعی طور پر انہی خطوط پر گامزن رہی، لیکن بیسویں صدی کے ربع آخر میں ثقافتی سطح پر مابعد جدیدیت کے ظہور میں آنے سے جہاں تخلیقی سطح پر موضوعات کی بوقلمونیت اور رنگا رنگی ادب کا شناخت نامہ بن گئے اور بیانیہ اسلوب کی آمد نے ایک بار پھر ادب کے قارئین کو متاثر کیا اور تنقیدی اصول کی راہیں مواد اور ہیئت دونوں کے اعتبار سے ہموار ہوئیں۔ ان دونوں کا آپس میں جان وتن کا سا رشتہ قائم ہو گیا۔ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا، لیکن فن پارے کے فہم وادراک اور اس کی قدر و قیمت کا تعین کرنے کے لیے نقاد انہیں الگ الگ کر کے دیکھنے پر مجبور ہے۔

☆☆☆

کتابیات

موجودہ مقالے کی تسوید میں جن کتب، رسائل و جرائد اور اخبارات سے استفادہ کیا گیا ہے، ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

- آج کل ڈراما نمبر، دہلی، جنوری ۱۹۵۹ء، جدید اردو ڈراما اور اس کے بعض مسائل، (احتشام حسین)
- آج کل، نئی دہلی، نومبر ۲۰۰۷ء، قرۃ العین حیدر نمبر
- آج کا اردو ادب، ابواللیث صدیقی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۷۵ء
- آزادی کے بعد دہلی میں اردو افسانہ، قمر رئیس، دہلی اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۰ء
- آئینہ جہاں (اول، دوم، سوم، چہارم) ڈاکٹر جمیل اختر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰٦ء تا ۲۰۰۷ء
- ادب اور زندگی، مجنوں گورکھپوری، اردو گھر، علی گڑھ، ۱۹٦۵ء
- ادب اور سماجیات، پروفیسر قدوس جاوید، ۱۹۸۴ء
- ادبی تخلیق اور ناول، احسن فاروقی، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹٦۳ء
- ادبی دنیا (رسالہ)، لاہور، ماہ فروری ۱۹۳۰ء
- ادب کلچر اور مسائل، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۸ء
- اردو ادب کی تحریکیں، انور سدید، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۸ء
- اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، سید احتشام حسین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰٦ء
- اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار، ڈاکٹر نیلم فرزانہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۲ء
- اردو افسانہ روایت اور مسائل، گوپی چند نارنگ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۲ء
- اردو افسانہ، تجزیہ، حامد کاشمیری، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۲۰۰٦ء
- اردو افسانے کا بدلتا مزاج، ڈاکٹر اشرف جہاں، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۰ء
- اردو افسانے کی روایت، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، اکادمی ادبیات، پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء

● اردو افسانے میں حقیقت نگاری، ڈاکٹر رونق جہاں، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
● اردو افسانے کی نئی تنقید، سید محمد عقیل احمد، انجمن تہذیب نو، الہ آباد ۲۰۰۶ء
● اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش، انور سدید، اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد، ۱۹۹۷ء
● اردو تھیٹر کل اور آج، انیس اعظمی رمخمور سعیدی، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۹۵ء
● اردو جرنل، ۱ تا ۱۰، مرتبہ شہاب ظفر اعظمی، شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی، ۲۰۱۰ تا ۲۰۱۹ء
● اردو دنیا، نئی دہلی، اکتوبر ۲۰۰۷ء
● اردو ڈراما نگاری کے ارتقا میں بہار کا حصہ، محمد قاسم، گلستان ادب پبلی کیشنز، ۱۹۷۷ء
● اردو ڈرامے کی تاریخ و تنقید، عشرت رحمانی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۷ء
● اردو میں ڈراما نگاری، سید بادشاہ حسین، شمس المطابع، حیدر آباد، ۱۹۳۵ء
● اردو زبان اور فن داستان گوئی، کلیم الدین احمد، لکھنؤ ۱۹۶۵ء
● اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ، سلیم اختر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۱۴ء
● اردو کا پہلا ایک بابی ڈراما (تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی جائزہ)، فصیح احمد صدیقی، علومی بک ڈپو، بمبئی، ۱۹۷۲ء
● اردو فکشن اور تیسری آنکھ، پروفیسر وہاب اشرفی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۴ء
● اردو فکشن، پروفیسر آل احمد سرور، یونیورسٹی پبلی کیشنز ڈویژن، علی گڑھ، ۱۹۶۹ء
● اردو فکشن کی تنقید، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، تخلیق کار پبلشرز، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء
● اردو فکشن کی مختصر تاریخ، فرمان فتح پوری، ایم آر پبلی کیشنز، دہلی ۱۹۹۹ء
● اردو کے پندرہ ناول، اسلوب احمد انصاری، یونیورسل بک ہاؤس، علی گڈھ، ۲۰۰۳ء
● اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، خلیل الرحمٰن اعظمی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۷ء
● اردو نثر کا فنی ارتقا، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۳ء
● اردو کی نثری داستانیں، گیان چند جین، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۷ء

● اردو ناول کی تاریخ وتنقید، علی عباس حسینی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۴ء

● اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، ڈاکٹر احسن فاروقی، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ، ۱۹۸۶ء

● اردو ناول اور تقسیم ہند، عقیل احمد، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۷ء

● اردو ناول بیسویں صدی میں، عبدالسلام، اردو اکادمی سندھ، کراچی، ۱۹۷۲ء

● اردو ناول پریم چند کے بعد، ڈاکٹر ہارون ایوب، اردو پبلشرز، لکھنؤ، ۱۹۷۸ء

● اردو ناول آزادی کے بعد، ڈاکٹر اسلم آزاد، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۱۳ء

● اردو ناول نگاری اور اردو ناول نگاری کی تاریخ وتنقید، سہیل بخاری، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۶۶ء

● اردو ناول کا سفر، پروفیسر ناز قادری، مکتبہ صدف، مظفر پور، ۲۰۰۱ء

● اردو ناول کا تنقیدی جائزہ (۱۹۸۰ء کے بعد)، ڈاکٹر احمد صغیر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۵ء

● اردو ناول کے اسالیب، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، تخلیق کار پبلشرز، لکشمی نگر، دہلی، ۲۰۰۶ء

● اردو ناول کے بدلتے تناظر، ڈاکٹر ممتاز احمد خان، اردو اکیڈمی پاکستان، ۲۰۰۷ء

● اردوئے معلیٰ، اگست وستمبر ۱۹۰۵ء

● اسلوب ومعنی، اعجاز علی ارشد، پاٹلی پترا لیتھو پریس، پٹنہ ۱۹۸۹ء

● اصلاح النساء، رشیدۃ النساء، احمد برادرز، کراچی، ۲۰۰۰ء

● افسانوی ادب تحقیق وتجزیہ، عظیم الشان صدیقی، نیو پبلک پریس، دہلی، ۱۹۸۳ء

● افسانہ حقیقت سے علامت تک، سلیم اختر، اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد، ۱۹۸۰ء

● افسانے کا منظر نامہ، مرزا حامد بیگ، اردو رائٹرس، گلڈ الہ آباد، ۱۹۸۳ء

● افشائے راز، مرزا ہادی رسوا، ۱۸۹۶ء

● الشجاع، کراچی، جولائی ۱۹۶۲ء

● انتخاب طلسم ہوشربا، محمد حسن عسکری، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۵ء

● اندر سبھا اور اندر سبھائیں، ابراہیم یوسف، لکھنؤ، ۱۹۸۰ء

● ایک دانشور ایک مفکر، دیویندر اسر، مرتب: نند کشور وکرم، پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزر، دہلی، ۲۰۱۳ء
● ایوان اردو، نئی دہلی، اکتوبر ۲۰۰۷ء، گوشہ قرۃ العین حیدر
● ایوان اردو، نئی دہلی، جنوری ۲۰۰۸ء قرۃ العین حیدر نمبر
● باغ و بہار، مرتب: قمر الہدیٰ فریدی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۷ء
● برصغیر میں اردو ناول، ڈاکٹر خالد اشرف، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۴ء
● بوستانِ خیال، میر محمد تقی خیال، تقریظ مرزا غالبؔ، ۱۸۹۴ء
● بہار کی بہار، اعجاز علی ارشد، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
● بہار میں اردو ناول، آصفہ واسع، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۰۷ء
● بیسویں صدی میں اردو ناول، ڈاکٹر یوسف سرمست، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۹۵ء
● پریم چند نئے تناظر میں، علی احمد فاطمی، تخلیق کار پبلشرز، دہلی ۲۰۰۶ء
● پریم چند کا تنقیدی مطالعہ: بحثییت ناول نگار، قمر رئیس، سرسید بک ڈپو، علی گڑھ، ۱۹۵۹ء
● تاریخ ادب اردو، جلد دوم، قدوس جاوید، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
● تذکرہ غوثیہ، مولانا گل حسن شاہ قادری، گنج شکر اکیڈمی، لاہور، سنہ ندارد
● تذکرہ خوش معرکہ زیبا، شمیم انہوی، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، سنہ ندارد
● ترقی پسند ادب کے معمار، مرتب: قمر رئیس، نیا سفر پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۰۶ء
● ترقی پسند اردو ناول، ڈاکٹر انور پاشا، پیش رو پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء
● ترقی پسند ادب، پروفیسر قمر رئیس، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۶ء
● ترقی پسند تحریک اور اردو ناول، ڈاکٹر ریاض احمد، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۷ء
● ترقی پسند تحریک: سفر در سفر، علی فاطمی، ادارہ نیا سفر، الہ آباد، ۲۰۰۶ء
● تعریف سے بہت خوش نہ ہو، کام کرتے رہو (مضمون)، علی احمد فاطمی، روزنامہ انقلاب، سنڈے ایڈیشن، ۱۹ جنوری ۲۰۲۰ء

- تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران، مشتاق احمد وانی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۷ء
- تکنیک کا تنوع: ناول اور افسانے میں، ممتاز شیریں، ارود رائٹرس گلڈ، الہ آباد، ۱۹۹۷ء
- تلاش وتوازن، قمر رئیس، ادارہ بخرم پبلی کیشنز، دہلی، ۱۹۶۸ء
- تنقید کے بنیادی مسائل، مرتبہ: آل احمد سرور، ناشر اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۹۸ء
- جدید اردو تنقید اصول ونظریات، شارب ردولوی، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۷ء
- جدیدیت کے بعد، گوپی چند نارنگ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۵ء
- جدید ناول کا فن، سید محمد عقیل، الہٰ آباد، ۱۹۹۸ء
- خبر نامہ لکھنؤ، اپریل ۱۹۸۳ء
- داستان امیر حمزہ، خلیل علی خاں اشک، علمی پرنٹنگ پریس، لاہور، سنہ ندارد
- داستان سے افسانے تک، سید وقار عظیم، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۳ء
- داستان کا فن، اطہر پرویز، اردو گھر علی گڑھ، ۲۰۲۰ء
- دل گداز (رسالہ)، عبدالحلیم شرر، فروری ۱۹۱۵ء
- دنیائے افسانہ، عبدالقادر سروری، مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد، ۱۹۲۷ء
- ڈراما اکبر، محمد حسین آزاد، دیباچہ از نبیرہ آزاد، کریمی پریس، لاہور، سنہ ندارد
- روشنائی، کراچی، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۸ء
- زبان وادب، بہار اردو اکادمی، پٹنہ، جولائی ۲۰۱۱ء
- زمانہ (ماہنامہ)، کانپور، زمانہ پریس کانپور، ماہ جون ۱۹۳۸ء
- سب رس، ملا وجہی، مرتب: قمر الہدیٰ فریدی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۷۷ء
- شاد عظیم آبادی اوران کی نثر نگاری، وہاب اشرفی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۱ء
- صورۃ الخیال، شاد عظیم آبادی، مرتبہ: اختر اورینوی، اردو مرکز عظیم آباد، پٹنہ، سنہ ندارد
- طلسم ہوش ربا، راہی معصوم رضا،

● عبدالحلیم شرر بحیثیت ناول نگار، علی احمد فاطمی، نصرت پبلشرز لکھنؤ، اشاعت اول ۱۹۸۶ء

● عجائب القصص، شاہ عالم ثانی، مرتبہ راحت افزا بخاری مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۵ء

● عصمت چغتائی بحیثیت ناول نگار، فرزانہ اسلم، سیمانت پرکاشن، دہلی، ۱۹۹۶ء

● فسانۂ عجائب، رجب علی بیگ سرور، لالہ رام نرائن لال، الہ آباد، ۱۹۲۸ء

● فکشن شعریات: تشکیل وتنقید، گوپی چند نارنگ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۹ء

● فکشن کی بازیافت، ڈاکٹر ہمایوں اشرف، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۲۰۱۷ء

● فکشن کی تنقید کا المیہ، وارث علوی، جے کے آفسیٹ پرنٹرس، دہلی ۱۹۹۲ء

● فن افسانہ نگاری، وقار عظیم، ناشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی ۱۹۹۴ء

● قرۃ العین حیدر کا فن، عبدالمغنی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء

● کتاب نما، نئی دہلی، ستمبر ۲۰۰۷ء

● کسوٹی، اختر اورینوی، رام نرائن لعل بینی پرشاد مادھو، الہ آباد ۱۹۶۳ء

● کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی، انشاء اللہ خاں انشاء، جامعہ مکتبہ، دہلی

● لکھنو کا شاہی اسٹیج، سید مسعود حسن رضوی ادیب، کتاب نگر، دین دیال روڈ لکھنؤ، ۱۹۵۶ء

● متن ومعنی، شہاب ظفر اعظمی، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۱۴ء

● مرأۃ العروس، ڈپٹی نذیر احمد، کتب خانہ نذیریہ، دہلی، سنہ ندارد

● مطالعات فکشن، شہاب ظفر اعظمی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۸ء

● مضامین پریم چند، مرتبہ: عتیق احمد، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۱ء

● معیار، ممتاز شیریں، نیا ادارہ، سرکلر روڈ، لاہور ۱۹۶۳ء

● ممتاز شیریں اردو کی پہلی خاتون نقاد، ابن سلطان، ہماری ویب ڈاٹ کام، پاکستان

● ناول کا فن اور نظریہ، ڈاکٹر محمد یٰسین، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۲۰۰۲ء

● ناول کی تاریخ وتنقید، علی عباس حسینی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۷ء

● ناول کیا ہے؟ محمد احسن فاروقی ونورالحسن ہاشمی، دانش محل لکھنؤ، ۱۹۵۱ء

● ناول نویسی، سجاد حیدر یلدرم، معارف، اکتوبر ۱۸۹۸ء

● نیا افسانہ، نئے دستخط، مرتبہ: نشاط شاہد، معیار پبلی کیشنز، ۱۹۸۰ء

● ہندو پاک میں اردو ناول، ڈاکٹر انور پاشا، پیش رو پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء

● ہماری داستانیں، وقار عظیم، مکتبہ عالیہ، یوپی ۱۹۶۸ء

● ہم عصر اردو فکشن چند زاویے، اعجاز علی ارشد، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۱۰ء

● ہم عصر اردو ناول: ایک مطالعہ، مرتبین: قمر رئیس، علی احمد فاطمی، ایم آر، پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۰۷

☆☆☆

ISSN - 2582 - 3612

مظفرپور

سہ ماہی

ساغرِ ادب

یو۔جی۔سی۔کیئر لسٹ جرنل

جلد : ۴ شمارہ : ۱۳

(اپریل تا جون ۲۰۲۲ء)

مدیرِ اعلیٰ (اعزازی)

پروفیسر سید آلِ ظفر

سہ ماہی ساغرِ ادب مظفرپور

Vol. : 04, Issue : 13
April to June 2022

مدیر اعلیٰ (اعزازی) پروفیسر (ڈاکٹر) سید آلِ ظفر

RNI No. BIH URD / 2019 / 78036
ISSN - 2582 - 3612

Vol. : 04, Issue : 13
April to June 2022

Quarterly

SAGHAR E ADAB

Muzaffarpur

(UGC CARE - List Journal)

Chief Editor (Honorary)
Prof. (Dr.) Syed Alay Zafar
UNIVERSITY DEPTT. OF URDU
B. R. A. BIHAR UNIVERSITY
MUZAFFARPUR - 842 001 (BIHAR)
MOB. +91 94300 84261, +91 90062 53903

NO BRANCH Ph.: 2303206
سونے اور چاندی کے گارنٹی شدہ زیورات
خزانہ جوئیلرس
مرادپور، پٹنہ ۴
Khazana
JEWELLERS
MURADPUR, PATNA - 4
پروپرائٹر: محمد صابر و محمد یٰسین
With best Compliments from
Namaz-e-Eidain

فہرست

رشحات قلم	ارباب قلم	صفحہ نمبر
اداریہ	پروفیسر سید آل ظفر	۷
حمد باری تعالیٰ	بیکل اُتساہی	۱۰
نعت پاک	پروفیسر عبدالمنان طرزی	۱۱
علامہ واقف عظیم آبادی کی نعتیہ شاعری	پروفیسر فاروق احمد صدیقی	۱۳
پرویز شاہدی کی شاعری پر ایک نظر	پروفیسر ابو منور گیلانی	۱۷
شہرت کی بلندیوں کو چھوتا شاعر: منظر بھوپالی	پروفیسر عزیز اللہ شیرانی	۲۱
اردو صحافت کا مجاہد اول: مولانا باقر دہلوی	پروفیسر عباس رضا نیر	۲۶
شعور تقدیس ہنر کا استعارہ: ترنم ریاض	ڈاکٹر زین رامش	۳۸
سرسید کا تصور تعلیم	پروفیسر محمد تنویر یونس	۴۷
بڑا ہے درد کا رشتہ	ڈاکٹر محمد طاہر	۵۱
مجھ کو بہت عزیز ہیں مشکل پسندیاں۔ شہود عالم آفاقی	ڈاکٹر نصرت جہاں	۵۶
اخبارات میں سرخیوں کی اہمیت	ڈاکٹر عبدالرشید منہاس	۶۳
اردو زبان کی دلفریبی اور ترقی کے مراحل	ڈاکٹر داؤد احمد	۶۸
رشید حسن خاں کے تحقیقی وتنقیدی رویوں کا مطالعہ	ڈاکٹر مجاہد الاسلام	۷۵
شانتی رنجن بھٹاچاریہ کی تنقیدی بصیرت	ڈاکٹر محمد فاروق اعظم	۸۴
یم چند کے اولین نقاد: پروفیسر احتشام حسین	ڈاکٹر رضوانہ شمسی	۹۱
لامہ سید سلیمان ندوی کی ''رحمت عالم'': ایک مطالعہ	ڈاکٹر محمد سراج الدین	۹۷
ردو نظم کی ایک معتبر آواز: ارتضیٰ رضوی	ڈاکٹر بسم اللہ خان	۱۰۲
نہار راجوروی کی غزلوں میں تلمیحاتی شعور	ڈاکٹر محمد آصف ملک	۱۰۷
سن اخلاق اور خدمت خلق: شیخ شرف الدین یحییٰ منیری	ڈاکٹر محمد عرفان احمد	۱۱۳
امیر خسرو کی مشترکہ تہذیب دور حاضر کی ضرورت	ڈاکٹر شاہ باز عامل	۱۱۸
[illegible]	ڈاکٹر سرفراز احمد خان	۱۲۵

۲۴	پروفیسر لطف الرحمٰن کی غزلیہ شاعری کے فکری وفنی ابعاد	ڈاکٹر احمد علی جوہر	۱۳۸
۲۵	انوکھے لہجے کا شاعر: سردار شفیق	ڈاکٹر نظام الدین احمد	۱۴۵
۲۶	سید سلیمان ندوی کی اسلوب نگاری: ایک جائزہ	ڈاکٹر عاطف عمران	۱۴۹
۲۷	اختر انصاری بحیثیت غزل گو	ڈاکٹر نور جہاں بیگم	۱۵۶
۲۸	''طلسم ہوش ربا: تنقید وتلخیص'' پر ایک نظر	ڈاکٹر نثار احمد	۱۶۰
۲۹	انتظار حسین ایک معتبر تخلیق کار مترجم اور صحافی	ڈاکٹر حامد رضا صدیقی	۱۶۴
۳۰	کنول ڈبائیوی کا حسن تغزل	ڈاکٹر وصی احمد شمشاد	۱۷۰
۳۱	عبدالشکور آہ اوران کا عہد: ایک طائرانہ نظر	ڈاکٹر محمد منور عالم	۱۷۴
۳۲	طلحہ رضوی برق کی رباعی نگاری	ڈاکٹر مقصود انصاری	۱۷۸
۳۳	مابعد جدیدیت اور وہاب اشرفی کی انفرادیت	ڈاکٹر محمد حیدر علی	۱۸۲
۳۴	بولتی آنکھیں: ایک مطالعہ	ڈاکٹر عشرت صبوحی	۱۸۶
۳۵	میراث الادب: انور سجاد فکر وفن کے آئینے میں	ڈاکٹر صالحہ صدیقی	۱۹۰
۳۶	یعقوب یاور کا فن ناول کے آئینے میں	ڈاکٹر رعنا کوثر	۱۹۶
۳۷	سعادت حسن منٹو ایک بے باک افسانہ نگار	ڈاکٹر مسرت حمزہ لون	۲۰۰
۳۸	اردو افسانوں کے اہم نسوانی کردار پر طائرانہ نظر	ڈاکٹر محمد اسلم	۲۰۸
۳۹	حفیظ میرٹھی کی غزل گوئی کا اختصاص	ڈاکٹر شبنم پروین	۲۱۴
۴۰	مشرف عالم ذوقی کی ناول نگاری	ڈاکٹر نسرین آرا	۲۱۹
۴۱	اردو ہم سب کی زبان	ڈاکٹر ثانیہ ناز	۲۲۴
۴۲	ناول ''میرے بھی صنم خانے'': ایک جائزہ	ڈاکٹر قیام الدین انصاری	۲۲۸
۴۳	عصمت کے افسانوں کے معاشرتی، سماجی وتہذیبی.....	ڈاکٹر گلشن آرا	۲۳۶
۴۴	ممتاز شیریں اوران کی تنقیدی بصیرت	ڈاکٹر مسرت جہاں	۲۴۳
۴۵	فکر اقبالؒ اور کارل مارکس	ڈاکٹر ظفر اقبال نحوی	۲۵۱
	(گوشۂ ریسرچ اسکالرس)		
۴۶	ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کے افسانوں میں سماجی برائیوں کی عکاسی	شبیر احمد	۲۵۶
۴۷	نیر مسعود کا افسانہ ''مارگیر'': ایک تجزیاتی مطالعہ	آصفہ زینب	۲۶۱
۴۸	ناول ''ایوان غزل'' کا تنقیدی مطالعہ	نور افشاں پروین	۲۷۰

ڈاکٹر مسرت جہاں

ممتاز شیریں اور ان کی تنقیدی بصیرت

ممتاز شیریں نے بطور نقاد، افسانہ نگار، مترجم، مرتب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون شہرت پائی۔ ان کی تخلیقی اور تنقیدی کامرانیوں سے اردو ادب کی ثروت میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ مغربی ادب پر گہری نگاہ کے باوجود اپنی ادبی روایات کی پاسدار تھیں۔ اردو میں افسانوی ادب کی تنقید میں ممتاز شیریں کا نام منفرد اہمیت کا حامل ہے۔ افسانہ نگار کے طور پر انھوں نے نسائیت کے تصور کو وسیع کیا۔ 'آئینہ' اور 'کفارہ' ان کے نمائندہ افسانے ہیں۔ مترجم کے طور پر بھی اپنی شناخت قائم کی ہے۔ انگریزی ناول The Pearl by John Steinbeck کا اردو ترجمہ 'درشہوار' کے نام سے کیا۔ 'نیا دور' کو مرتب کرنے کے ساتھ ساتھ فسادات (۱۹۴۷ء) سے متعلق افسانوں کا ایک مجموعہ مرتب کیا۔ انگریزی مضامین اور افسانے بھی لکھے ہیں۔

ممتاز شیریں کی پیدائش ۱۲ ستمبر ۱۹۲۴ء کو اپنے آبائی وطن بنگلور میں ہوئی۔ ان کے والد قاضی عبدالغفور اپنے عہد کے ممتاز عالم تھے۔ وہ عربی اور فارسی زبان کے ماہر تھے۔ ان کا ننہیالی خاندان بھی روشن خیال اور تعلیم یافتہ تھا۔ نانا، نانی نے ان کی اخلاقی اور مذہبی تعلیم وتربیت پر خاص توجہ دی اور والد کے زیر سایہ ادبی تربیت ہوئی۔ ممتاز شیریں ایک ذہین وفطین طالبہ تھیں۔ انھوں نے تیرہ برس کی عمر میں میٹرک کا امتحان دیا۔ ۱۹۴۱ء میں مہارانی کالج، بنگلور سے بی۔ اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ اس کے بعد ان کی شادی صمد شاہین کے ساتھ ۱۹۴۲ء میں ہوئی جو پیشے سے وکیل تھے۔ وہ ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے حکومت پاکستان کے بیورو آف ریفرنس اینڈ ریسرچ میں جوائنٹ ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ممتاز شیریں کی طرح صمد شاہین بھی ادبی مزاج رکھتے تھے اور دونوں ایک دوسرے کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ ان کے مزاج کی ہم آہنگی اور خوشگوار زندگی نے ادب کی تنقیدی اور تخلیقی خدمات میں نمایاں کارنامہ انجام دیا۔ ۱۹۴۴ء میں اپنے شوہر کے ساتھ مل کر بنگلور سے ادبی مجلہ 'نیا دور' نکالا کرتی تھیں۔ ہندوستان سے پاکستان جانے کے بعد وہاں سے بھی 'نیا دور' نکالنے کا فیصلہ کیا اور یہ سلسلہ ۱۹۵۲ء تک جاری رہا۔ یہ رسالہ ممتاز شیریں کی تنقیدی بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ممتاز شیریں کو زمانہ طالب علمی سے ہی سنجیدگی، فہم و فراست، تدبر و بصیرت اور وسیع مطالعہ کا شوق تھا۔ اپنے اسی شوق کے سبب وہ ہر دل عزیز طالب علموں میں

شمار ہوتی تھیں۔ اعلی تعلیم حاصل کرنے کے شوق اوران کے علمی مذاق نے نئے نئے راستے نکالے۔ پاکستان سے انگریزی میں ایم۔ اے کرنے کے بعد انھوں نے برطانیہ جا کر آکسفورڈ یونیورسیٹی سے جدید انگریزی تنقید میں اختصاصی مہارت حاصل کی۔ انگریزی ادب کے نابغہ روزگار نقادوں اور ادیبوں سے اکتساب فیض کیا اور عمیق مطالعہ میں منہمک رہیں۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ آکسفورڈ یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کریں مگر بعض ناگزیر حالات ومسائل کے باعث اپنا نصب العین حاصل نہ کرسکیں۔

ممتاز شیریں ایک مستعد اور فعال تخلیق کار تھیں۔ انھوں نے اپنے تخلیقی ادب کی شروعات ۱۹۴۲ء میں کی۔ ان کا پہلا افسانہ 'انگڑائی' ادبی مجلّہ 'ساقی' دہلی میں شائع ہوا تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور ادبی حلقوں میں زبردست پذیرائی ہوئی۔ آئینہ، گھنیری بدلیوں میں، اپنی نگریا، رانی، شکست وغیرہ ان کے معروف افسانے ہیں۔ ان سبھی افسانوں میں انھوں نے جنس، محبت اور ازدواجی زندگی کی نیرنگیوں کو وسیع پیمانے پر پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے ازدواجی زندگی کی لبریز محبت، غریبوں کے دکھ درد، مفلوک الحال لوگوں کی مصیبت زدہ زندگی میں شوہر بیوی اور بچوں کے پیار کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور اسے شدت کی حد تک محسوس کیا ہے۔ ان کا آپسی پیار اور امید افزا باتیں ایک کرن کی مانند ہیں جو تاریکی میں اجالا پیدا کرتی ہیں اور زندگی قابل برداشت بن جاتی ہے۔ بقول ممتاز شیریں ''اکثر کسی مقصد یا شعوری کوشش سے زیادہ احساس یا وجدان میرے افسانوں کا محرک ہوتا ہے۔'' (اپنی نگریا از ممتاز شیریں، مکتبہ جدید لاہور نومبر ۱۹۴۸ء، ص۔ ۲۳۴)، انھوں نے انسان کی اسی نفسیاتی کیفیات، اس کے الجھاوے اور تحلیل نفسی کو محسوس کیا اور اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ ان کا یہی طریقہ کار قاری کو مسحور کر دیتا ہے۔ اسی لیے ان کے اسلوب کو علمی وادبی حلقوں نے ہمیشہ سے ہی قدر کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔

ممتاز شیریں کے تبحر علمی کا اندازہ ان کی تخلیقی اور تنقیدی تصانیف سے لگایا جا سکتا ہے۔ افسانوی مجموعوں میں 'اپنی نگریا، حدیث دیگراں، میگھ ملہار، ظلمت نیم روز' (فسادات کے افسانے)، شیریں کتھا (آپ بیتی، افسانے، مترجم افسانے، خطوط)، ان کی تنقیدی کتابوں میں 'معیار، منٹو نوری نہ ناری، تکنیک کا تنوع ناول اور افسانے میں، مغربی افسانے کا اثر اردو افسانے پر' وغیرہ ہیں۔ انھوں نے اپنی تخلیقی اور تنقیدی کامرانیوں سے اردو دنیا کو حیرت زدہ کر دیا، رنگ، خوشبو اور حسن وخوبی کے تمام استعارے ان کے توانا اور ابد آشنا اسلوب میں سمٹ آئے ہیں۔ ان کی تحریریں قلب اور روح کی عمیق گہرائیوں میں اتر جانے والی اثر آفرینی سے لبریز ہیں۔ ناول 'درشہوار' کے ناشر عنایت اللہ لکھتے ہیں :

> ''ممتاز شیریں افسانہ نگار بھی ہیں اور افسانوں کی ناقد بھی۔ وہ تخلیق اور تنقید دونوں کے سربستہ رازوں سے واقف ہیں۔ اسی لیے ان کے افسانوں میں

حسن کی دلکشی اوران کی تنقیدوں میں نظر کی وسعت ہے۔''

(درشہوار از ممتاز شیریں، ص۔۶)

ممتاز شیریں کی کتاب ''معیار'' کئی اعتبار سے اردو ناقدوں، ادیبوں اور طالب علموں کے لیے مشعل راہ ہے۔اس کے سبھی مضامین افسانوی ادب پر مشتمل ہیں۔کسی مضمون یا مقالے پر تنقیدی قلم اٹھانا مشکل کام ہوتا ہے اور تنقید کے معیار پر بات کرنا تو اس سے بھی زیادہ مشکل۔مصنفہ نے اسی مشکل امر کو اپنی کتاب کا موضوع بنایا ہے۔اس کتاب میں معیار تنقید کے تعلق سے اہم نکات پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔اس کے عناوین 'ناول اور افسانہ میں تکنیک کا تنوع، رجحانات کا دائرہ، مغربی افسانے کا اثر اردو افسانے پر، ترقی پسند افسانہ' منٹو کا تغیر اور ارتقا، سیاست ادیب اور ذہنی آزادی' وغیرہ جیسے موضوعات کو شامل کیے گئے ہیں۔زیر مطالعہ کتاب کے بیان سے واضح ہے کہ وہ کسی بھی بڑے یا چھوٹے فن کار یا فن پارے کا تجزیہ اس کے سابقہ یا وراثتی نام ونمود پر نہیں کرتی ہیں، بلکہ وہ اصل متن کا جائزہ اپنی وسعت نظر سے لینے کے بعد ہی اعلیٰ یا ادنیٰ ہونے کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ان کی تنقید کی خاص بات یہ بھی ہے کہ وہ بے جا تعریف سے اجتناب کرتی ہیں اور جہاں ضرورت محسوس ہوتی ہے وہاں فراخدلی کا مظاہرہ بھی کرتی ہیں۔کتاب کے پیش لفظ میں محمد حسن عسکری نے ان کی تنقیدی نگارشات کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے :

> ''تنقید کے یہ مختلف فرائض ادا کرتے ہوئے ممتاز شیریں نے پچھلے پندرہ سال کی ادبی سرگرمیوں میں نہایت نمایاں حصہ لیا ہے۔ان کی تنقید ایک دور کے نمائندے کی حیثیت رکھتی ہے۔لہٰذا اس دور کی ادبی تاریخ ان کے تنقیدی مضامین کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکے گی۔''

(معیار تنقید، ص۔۱۱)

ممتاز شیریں کا مقالہ 'تکنیک کا تنوع۔ناول اور افسانہ میں' طویل اور پر مغز ہے۔سینتالیس صفحے پر منحصر یہ مضمون مواد و معیار کا مرقع ہے۔موضوع کے ساتھ گفت وشنید اور اس کا حق ادا کرنے کے لیے انھوں نے اردو ادب کے تقریباً سبھی معروف افسانہ نگاروں کا بالاستیعاب مطالعہ پیش کیا ہے۔اردو ادب کے ان جدید افسانوں کے تقابل میں انگریزی ادب کے فن پاروں کو بھی مطمح نظر رکھا ہے۔ہمارے یہاں کا ادبی سرمایہ چاہے تخلیق کا ہو یا تنقید کا یا پھر تحقیق ہو۔ان سب کا بیش تر حصہ مغربی ادب سے مستعار ہے۔اس لیے ادب کی تعریف وتنقیص کا معیار بھی مغربی ادب پر منحصر ہے۔البتہ انھوں نے اپنی گفتگو حقیقت پسند اور ترقی پسندانہ موضوعات جیسے افسانہ شکوہ شکایت، حرامجادی، ہماری گلی، آنندی، دیمک، آپا، برہمچاری، دوفرلانگ لمبی سڑک، ایک لاکھ ستانوے ہزار، چیچک کے داغ، تلاش، یہ بھی وہ بھی، قید خانہ، ان داتا، ناک کاٹنے

والے، گرہن، کالا دیو، صاحب خوں، بادشاہ دیو، غالیچہ، زندگی، لال دھرتی، پرواز کے بعد، ایں دفتر بے معنی اور لیکن گومتی بہتی رہی، اور آخری کوشش وغیرہ کو اپنے مطالعے کا حصہ بنایا ہے۔

بے شک آج کا ادب کلاسیکی ادب سے مختلف ہے۔ کلاسیکی ادب میں اشرافیہ طبقات یا اعلیٰ عہدوں پر مامور بادشاہوں، نوابوں، وزیروں، رئیسوں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی خوشحال اور فارغ البال زندگی کی آرام و آسائش اور سہولیات کا عمل دخل داستانوں، تمثیلوں اور ناولوں میں کثرت سے موجود ہے۔ ان کہانیوں میں عشق و محبت کی داستان اور رومان پسندی، جذباتیت اور مثالیت اس طرح کے ادب کا محور و مرکز ہوتا ہے۔ وہ ادب حقیقی زندگی سے کوسوں دور عام قاری کے لیے تفنن طبع کا ذریعہ تھا اور ادب برائے ادب تک محدود تھا۔ جب کہ آج کا ادب، ادب برائے زندگی پر مبنی ہے۔ حقیقی اور سچی زندگیاں ہمارے ادب کا حصہ ہیں۔ عام لوگوں کی رسائی اور معاشرے میں رونما ہونے والے واقعات و سانحات کے ساتھ شجر ممنوعہ سمجھے جانے والے موضوعات پر بھی کھل کر لکھا جانے لگا۔ اس نوع کی کہانیوں سے ہمارے ادب کو کئی جہتوں میں فائدہ ہوا ہے۔ زندگی کے بہت سارے پہلو جو احاطہ ادب سے خارج سمجھے جاتے تھے اب ادب کے دامن میں سمیٹ لیے گیے ہیں۔ اسی لیے زندگی میں درپیش وہ سبھی معاملات و مسائل اور تہہ داری آج کے افسانوں اور ناولوں کے موضوعات بنتے ہیں۔ اسی تبدیلی کے تحت وہ کہتی ہیں :

> ”جب سے افسانہ اپنے مخصوص دائرے سے باہر نکل آیا ہے اس میں بلا کا تنوع، وسعت اور قوت آ گئی ہے۔ افسانوی ادب متمول اور آزاد ہو گیا ہے۔ ساری پابندیوں کو توڑ کر زندگی کی ساری وسعتوں اور پیچیدگیوں کو اپنے آپ میں سمو لینا چاہتا ہے۔“
>
> (معیار تنقید، از ممتاز شیریں، ص۔ ۴۱)

’منٹو نوری نہ ناری‘ ممتاز شیریں کی تخلیقی تنقید کا عمدہ نمونہ ہے۔ خود ممتاز شیریں نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ عملی اور تخلیقی تنقید کے سب سے اچھے نمونے منٹو پر میرے متفرق مضامین ہیں۔ (ناقد اور کہانی کار، ابوبکر عباد، ص ۲۲۳)۔ ۱۹۴۲ء کے بعد ممتاز شیریں کا تخلیقی و تنقیدی عمل پختگی کی حد تک پہنچتی ہے۔ ان کا ادبی ذوق بھی پروان چڑھنے لگا۔ ایک طرف وہ زندگی کی حقیقتوں، اس کے خیر و شر، سفید و سیاہ، نیکی و بدی اور پیچیدہ نفسیاتی کیفیات سے گزرتے ہوئے نت نئے تجربات حاصل کر رہی تھیں۔ دوسری طرف فسادات پر لکھے جا رہے انسان کی اکہری اور سطحی تعریف سے غیر مطمئن اور ہیجانی کیفیت کے بے میل تصورات سے نبرد آزما تھیں۔ اپنے اندر کی آواز اور ذہنی خلفشار کا مداوا انھیں منٹو کے افسانوں میں نظر آیا۔ اور منٹو ان کا نمائندہ افسانہ نگار بن گیا۔ ایک انٹرویو میں منٹو پر کتاب لکھنے کی وجوہات بیان کرتی ہیں :

''منٹو ایک سچا اور بے باک فن کار تھا۔ ایک آگ تھی جس میں وہ مسلسل تپتا رہتا تھا۔ منٹو کے افسانوں میں بلا کی جان تھی اور ان کا تاثر ہر سطح کے پڑھنے والے قبول کرتے ہیں۔ یوں تو میں نے بہت سے افسانہ نگاروں کا اپنے مضامین میں جائزہ لیا ہے۔ لیکن منٹو کو ایک کتاب کا موضوع اس لیے بنایا ہے کہ میری نظر میں منٹو آج بھی ہمارا نمائندہ اور بہترین افسانہ نگار ہے۔''

(منٹو نوری نہ ناری، مرتبہ آصف فرخی، ص۔ ۶ تا ۷)

ممتاز شیریں متنوع ادبی، لسانی، تہذیبی اور مذہبی کتابوں کے مطالعے سے بہرہ ور تھیں۔ انھوں نے آسمانی صحیفہ 'انجیل' کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ تخلیق کائنات کے دن سے لے کر آدم خاکی کے عروج وزوال کی روایات سے آشنائی نے زندگی کے تنوع اور اس کی گرہوں کے متعلق ان کے اوپر تہدار اور پیچیدہ مسائل کے زیر و بم، نشست و برخاست، بلندی و پستی، شعوری و لاشعوری طور پر نیکی و بدی، جنسی حیوانیت، عریانیت، سماجی دہشت گردی اور ہولناک واقعات کے بہت سے راز افشاں ہوئے تھے۔ اسی لئے حیات انسانی اور اس کے پیچیدہ مسائل کے حل کی واضح تصویر ان کے ذہن وخیال میں موجود تھی، ساتھ ہی منٹو کے نفسیاتی افسانوں کو وسیع تناظر میں سمجھنے کے لیے انھوں نے مغربی مفکرین فرائڈ، ہیولاک ایلس سے لے کر کنسے رپورٹ، سیموں و بوارکی، دوسری جنس اور کولن ولسن تک کو پڑھا اور سمجھا۔ کیونکہ منٹو کے افسانے جنسی نفسیات کے مطالعے کے لیے بہت اچھا مواد فراہم کرتے ہیں۔ لٰہذا مصنفہ کا ارادہ تھا کہ کسی ایک مرکزی شبیہ کو لے کر، چاہے وہ پنڈورا کی طرح دیومالائی ہو یا مریم کی طرح مذہبی روایات کا جزو، اس کے تلازمے منٹو کے افسانوں میں تلاش کیے جائیں۔ بقول صمد شاہین:

''کتاب کی ترتیب میں وہی التزام رکھا گیا تھا جس طرح انجیل میں ابتدائے آفرینش سے لے کر زوال آدم خاکی تک حکایت انسانی میں واقعات اور روایات کا سلسلہ ہے۔'' (منٹو: نوری نہ ناری، مرتبہ آصف فرخی، ص ۸)

ممتاز شیریں نے کتاب کا عنوان 'منٹو: نوری نہ ناری' تجویز کرنے کے بعد اس کے بیشتر حصے لکھ دئے تھے۔ اپنے منصوبے کے تحت صرف دو باب نہیں لکھے جا سکے تھے۔ وہ باب 'بنیادی گناہ۔ جنس' ہے اور دوسرا باب 'ادب میں انسان کا تصور' ہے۔ ان دونوں باب کے تعلق سے چند باتیں تفصیل طلب ہیں۔ کتاب کی ترتیب کے وقت ممتاز شیریں کے مسودات کی چھان پھٹک کے درمیان ایک مسودہ پر درج عنوان 'بنیادی گناہ' ملا جو بڑی حد تک اقتباسات پر مشتمل تھا، جسے مرتب نے ضمیمہ کے طور پر شامل کیا ہے۔ دوسرے باب کی کہانی بھی کچھ اسی طرح ہے۔ ان کے مسودات میں ایک نامکمل مقالہ بغیر عنوان کے ملا، جسے مرتب موصوف نے عنوان درج کر کے مطبوعہ کتاب میں آخری باب کے طور پر' ادب میں انسان کا تصور' کے نام

سے شامل کیا ہے۔قرین قیاس ہے کہ موصوفہ کو ان دونوں مقالوں میں وہ تخلیقی شان نظر نہیں آئی ہوگی جیسا ان کے ذہن و خیال میں موجود رہا ہوگا۔ان مقالوں کو شائع نہ ہونے کے پس پشت شاید یہی وجہ رہی ہوگی۔البتہ ان کی کتاب کا خاکہ اور مطبوعہ مضامین کی فہرست کے تقابل سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنفہ کے ارادے اور تکمیل شدہ اجزا میں صرف دو ابواب کا فرق ہے، جس کی حسرت پوری نہ ہو سکی اور وہ دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ یہاں پر موصوفہ کے منصوبہ ابواب کی ترتیب کو ایک نظر میں دیکھنے کی کوشش ضروری معلوم ہوتی ہے :

۱۔ یہ خاکی اپنی فطرت میں:.................... معصیت، معصومیت

۲۔ بنیادی گناہ: جنس

۳۔ ترغیب گناہ: حوا

۴۔ کفارہ گناہ: مریم

۵۔ دوسرا گناہ: قابیل

۶۔ آخری باب۔ جسے مرتب نے 'ادب میں انسان کا تصور' کے نام سے شامل کیا ہے۔

ممتاز شیریں نے منٹو کے نفسیاتی موضوعات کو مذہبی روایات اور اساطیر سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔محولہ بالا ابواب کی روشنی میں ممتاز شیریں نے انسان کی جبلی ضرورتوں (جنس) اور اس کے پھیلاؤ یا اس کی ترغیب (حوا)، پھر کفارہ گناہ (مریم) کے علاوہ ترقیاتی زندگی میں مختلف تمناؤں کے فروغ یا تکمیل میں خلل پیدا کرنے والے دوسرے گناہ کی شکل میں قابیل کے جنگ، تشدد، حرص و ہوس کے عمل دخل کو منٹو نے اپنے افسانوں میں انسان کے متنوع رویوں میں پیش کیا ہے۔جسے ممتاز شیریں نے جا بجا مثال کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ان ابواب میں ایک طرح کا تسلسل بھی برقرار ہے۔ایک باب دوسرے باب سے اس طرح منسلک ہے کہ یہ ایک دوسرے کے بغیر نامکمل معلوم ہوتے ہیں۔مثال کے طور پر دوسرے باب (ترغیب گناہ: حوا) کا خاتمہ جس مکالمے پر ہوتا ہے تیسرے باب (کفارہ گناہ: مریم) کا آغاز اسی مکالمے سے ہوتا ہے۔ملاحظہ فرمائیں :

''یہ پنڈورا تھی جو اپنی کاسکٹ میں سیاہ پردوں والی برائیاں ساتھ لے آئی جن سے انسان پر تاریکی اتری۔''

''اور یہ حوا تھی جس نے اس 'بنیادی گناہ' کی طرف پہلا قدم اٹھایا جو ''انسان کی افتاد'' کا باعث ہوا۔''

(منٹو: نوری نہ ناری، مرتبہ آصف فرخی، ص۔۸۴)

تیسرے باب (کفارہ گناہ: مریم) کا آغاز ان جملوں سے ہوتا ہے :

''یہ پنڈورا تھی جو اپنی کاسکٹ میں کالے پردوں والی برائیاں دکھ اور مصیبتیں ساتھ لے آئی جن سے انسان پر تاریکی اتری۔ اور یہ حوا تھی جس نے اس بنیادی گناہ کی طرف پہلا قدم بڑھایا جو انسان کی افتاد کا باعث ہوا۔''

(منٹو: نوری نہ ناری، مرتبہ آصف فرخی، ص۔۸۵)

باب (کفارہ گناہ: مریم) کا کلیدی جملہ سنئے:

''لیکن پنڈورا اپنی کاسکٹ کی تہ میں ایک ننھی سی سنہری اور روشن چیز بھی لے آئی۔ انسان کے لیے امید کا نایاب اور نادر تحفہ! اور مریم نے حوا کے گناہ کا کفارہ ادا کیا۔ مریم جس کی نسائیت پاکیزگی، تقدس اور مامتا سے مرکب ہے۔''

(منٹو: نوری نہ ناری، مرتبہ آصف فرخی، ص۔۸۵)

دراصل ان کے اسلوب کا یہی خاصہ ہے، جو عملی تنقید کے ساتھ تخلیقی تنقید کی بھرپور غمازی کرتی ہے۔ منٹو نے جس زمانے میں لکھنا شروع کیا تھا وہ زمانہ مثالیت، جذباتیت اور رومانیت کے خلاف ردعمل تھا۔ لکھنے والے اس حد تک حقیقت پسند ہو گئے تھے کہ اصلیت کو عریاں صورت میں دیکھنا اور دکھانا چاہتے تھے۔ اصلیت پر پڑے سارے پردوں کو بے نقاب کرنے پر آمادہ تھے۔ خواہ اس کے اندر غلاظت، گندگی اور بدصورتی ہی نظر آئے۔ البتہ ۱۹۳۶ء کے بعد نئے ادب کی تحریک میں قنوطیت، یاسیت اور تلخی اس دور کے ادب کا خاصہ بن چکی تھی۔ افسانہ نیا قانون، ہتک، ٹھنڈا گوشت، موذیل، کھول دو اور کالی شلوار وغیرہ ان کے اسی دور کی یادگار ہیں۔ ان کے اوپر فحش نگاری کا الزام لگایا گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے افسانوں میں بلا کی جان ہے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا وہ خلوص اور ایمانداری سے لکھا ہے۔ منٹو نے جیسے جیسے انسان کے مختلف رویوں کا مطالعہ کیا تھا ویسے ویسے حیات انسانی کے متنوع تصورات کو ادب میں پیش کیا ہے۔ منٹو کا انسان ارتقا پذیر ہے۔ منٹو کا انسان صرف پریم چند کے سادہ انسان یا پھر اقبال کے انسان کامل تک ہی محدود نہیں ہے۔ اس کا انسان پہلے فطری انسان تھا جو فطری جبلتوں کے مطابق آزادانہ زندگی بسر کرنا چاہتا ہے افسانہ۔ مگر سماج کی مروجہ اقدار اور اخلاقی بندشیں فطری جبلتوں کے آگے روک لگا دیتی ہیں اور فطری انسان گھٹن اور کجروی کا شکار ہو جاتا ہے۔ منٹو کا شکست خوردہ فرسٹریٹیڈ انسان گناہ اور گندگی میں گھرا ہوا نظر آتا ہے۔ اب وہ فطری انسان نہیں بلکہ نامکمل انسان کا تصور ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ افسانہ ٹھنڈا گوشت اور بابو گوپی ناتھ اس کی بہترین مثال ہے۔ منٹو کا ایک انسان وہ بھی ہے جو سماج کے گرے ہوئے کریہہ چہروں کے لیے اپنے دل میں محبت رکھتا ہے۔ انسان ضبط نفس سے ایک روحانی بلندی حاصل کرتا ہے۔ وہ اصول پرستی اور پاکبازی کی خاطر جسمانی لذتوں کو قربان کر سکتا ہے، اور اپنی فطری حیوانی جبلتوں پر فتح پا کر بلند ہو سکتا ہے۔ نیکی اور ضبط

نفس سے انسان کو ایک روحانی کیف ملتا ہے۔ بے راہ روی اور گناہ کا احساس انسان کو ایک مسلسل روحانی کرب واضطراب میں مبتلا رکھتا ہے۔ منٹو نے اپنے آخری دور کے ایک افسانے ''باسط'' میں انسان کو اس شبیہ میں دکھایا ہے۔ ممتاز شیریں نے لکھا ہے :

''سعیدہ اس افسانے میں ایک تڑپتی ہوئی روح ہے۔ اپنے گناہ کے بعد وہ جس کرب واذیت سے گزری ہے اس اذیت کی آگ اس کے گناہ کو جلا کر اسے کندن بنانے کے لیے کافی ہے۔''

(منٹو: نوری نہ ناری، مرتبہ آصف فرخی، ص۔۴۱)

محولہ بالا عبارت کی روشنی میں منٹو کا کردار سعیدہ کے اندر ایک فطری انسان کا مادہ موجود ہے جو اپنے گناہ کے کرب واذیت میں مبتلا ہے۔ اسے یہ بھی خوف ہے کہ اگر اس کے گناہ کی خبر باسط کو ہو جائے تو وہ معاف نہیں کرے گا۔ دنیا کا کوئی بھی انسان اس گناہ کو معاف نہیں کر سکتا ہے اور نہ ہی اسے شوہر کے گھر میں پناہ مل سکتی ہے۔ مگر اسے اپنے گناہ کی پاداش کے خوف نے اس کے لیے ہمدردی کا راستہ کھول دیا تھا اور باسط نے اسے یہ کہہ کر معاف کر دیا کہ ''زیادہ رونا اچھا نہیں سعیدہ۔۔۔۔ جو خدا کو منظور تھا ہو گیا۔'' سعیدہ کی روح کے زخم کو مندمل کرنے والا اس کا شوہر باسط ہے۔ باسط کا یہ ایثار غیر معمولی ہے کہ اس نے اپنی پسند کو ماں کی خوشی کے لیے، اپنے آپ کو، اپنی ذات کو دوسروں کے لیے قربان کیا۔ دراصل منٹو کے باسط میں انسان کا قد بڑھ گیا ہے، یعنی دنیا میں ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جو بے لوث محبت اور جاں نثاری کا جذبہ رکھتے ہیں۔ ممتاز شیریں نے منٹو کے اسی انسانی تصورات واخلاقیات کو محسوس کیا تھا۔ کتاب کے مرتب آصف فرخی نے ممتاز شیریں کی منٹو شناسی کے اعتراف میں درست فرمایا ہے، جسے انکار نہیں کیا جا سکتا:

''منٹو کے مطالعے میں ان کا سفر جو نفسیاتی تاویلات سے آگے بڑھ کر علم الاساطیر تک جا پہنچا، جدید اردو تنقید میں ایک منفرد مثال ہے۔''

(منٹو: نوری نہ ناری، مرتبہ آصف فرخی، ص۔۱۷)

Dr. Musarrat Jahan
Research Scholar
Supervisor - Dr. Shahab Zafar Azmi
Deptt. of Urdu
Patna University
Patna (Bihar)
Mob.- 89690 42640

REGISTERED WITH R.N.I. No. UPURD/94426/24/1/2010-TC

Tabreek -e- Adab

A Peer Reviewed, Referred Literary And Research Journal
Urdu Quarterly Issue 57
ISSN 232
Vol.
Apr - Ju

URDU ASHIANA
157 Afaq Khan Ka Ahata, Manduadih Bazar, Varanasi-221103 (U.P.)

آہ...... سیما بجیا جی! آپ کو اللہ نے اتنی جلدی اپنے پاس بلا لیا۔
اللہ آپ کو غریق رحمت کرے اور درجات بلند فرمائے۔ آمین ثم آمین!

فہرست

1۔ دورِ آزادی	مولانا، میدالدین خاں	7
2۔ آیا ہے بلاوا مجھے دربارِ نبی ﷺ سے	نجمہ عثمان	14
نعت۔ ڈاکٹر شمس کمال انجم 19 عارف باللہ	بشیر احمد بشیر (ابن نشاط)	20

مضامین

1۔ آخری ترقی پسند؟ ایک خواب	عارف نقوی	21
2۔ نثر کا فن (آخری قسط)	پروفیسر آفتاب احمد آفاقی	28
3۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی کی فیض شناسی	پروفیسر قدوس جاوید	37
4۔ یادیں (ڈاکٹر مغیث الدین فریدی)	پروفیسر شیخ عقیل احمد	45
5۔ 2021 کا فکشن اور فکشن تنقید (مکمل مضمون)	پروفیسر اسلم جمشید پوری	49
6۔ فلسفہ انسانیت کا استعارہ: ٹیگور اور اقبال	پروفیسر وزیر احمد	92
7۔ تکرجنگ: نسوانی نفسیات کا آئینہ	پروفیسر محفوظہ جان	99
8۔ حیات وکائنات کا عکاس: خالد حسین	ڈاکٹر ندیم احمد ندیم	103
نظمیں: پروین شیر، فاروق نازکی، نجمہ عثمان، ایاز رسول نازکی، شبنم عشائی۔ شیخ سجاد پونچھی		106

مضامین

1۔ نادم ۔۔ منفرد اسلوب کا شاعر	ڈاکٹر نصرت بشیر	113
2۔ رابندر ناتھ ٹیگور کے قومی اور تعلیمی افکار کی عصری معنویت واہمیت	ڈاکٹر نہال احمد انصاری، ڈاکٹر فائزہ الطاف	122
3۔ مرزا داغ دہلوی: شخصیت اور شاعری	ڈاکٹر راغب دیشمکھ	131
4۔ فارسی ادب کی طویل ترین مثنوی "بحر العرفان" ایک جائزہ۔ ڈاکٹر طارق احمد مسعودی		135
5۔ شیخ العالم کے فلسفے میں قدریاتی پہلو اور تعلیم وتربیت سے ان کی مطابقت	مرزا غیب منان	140
6۔ مجروح رشید کا تنقیدی شعور: تجزیہ	ڈاکٹر محمد یونس ذار	146
7۔ پریم چند اور کرشن چندر کی تخلیقی صلاحیتوں اور احساسات		

8۔ اکیسویں صدی میں اردو ادب کے مسائل	ڈاکٹر رئیس احمد ایتو	173
غزلیں: اسلم عمادی، پون کمار، طاہرہ رباب الیاس، عمر فاروق، مظفر افتخاری، ضررو صفی		177

مضامین

1۔ کرشن چندر کی افسانہ نگاری کا تجزیہ	ڈاکٹر سنجیو کمار	183
2۔ قدیم اردو شاعری کا نیا استعارہ ۔۔۔ انورایرج	ڈاکٹر قسیم اختر	188
3۔ دور حاضر میں فارسی زبان کا مستقبل اور ہماری ذمہ داریاں	ڈاکٹر محمد لطیف	194
4۔ ریاستی حصولیابی میں تعمیراتی طرز رسائی کا کردار	محمد راغب بابر	201
5۔ نذیر کے ناولوں میں رچرڈسن اور ڈیفو کا رنگ	ڈاکٹر سورج کمار	207
6۔ کشمیری زبان میں غیر افسانوی نثر	ڈاکٹر نصرت بشیر	212
7۔ محفوظہ جان: عصر حاضر کی مشہور کشمیری شاعرہ	ڈاکٹر حمیرہ جان	218
افسانے: 1۔ مسافر۔ عبدالغنی شیخ 2۔ بڑی حویلی کا چھوٹا دروازہ	وحشی سعید	224
3۔ ہماری ادھوری کہانی۔ نور شاہ 4۔ دہائی اس کی	۔فریدہ نثار احمد انصاری	

مضامین

1۔ ترجمے کی اہمیت، اغراض ومقاصد	ڈاکٹر عبدالرشید منہاس	236
2۔ بلراج بخشی: ایک منفرد افسانہ نگار	ڈاکٹر نصیب علی	245
3۔ کورونا دور میں اساتذہ کے ترتیب وتدریسی طریقہ کار کا جائزہ، ڈاکٹر اشونی، روش انجم		254
4۔ وددربھ میں اردو شاعری اور چند قدیم مشہور شعرا	ڈاکٹر راغب دیشمکھ	261
5۔ سوم ناتھ زتشی کی افسانہ نگاری	ڈاکٹر قیصر احمد ملک	267
6۔ شہاب ظفر اعظمی کی تنقیدی بصیرت: متن اور معنی کے تناظر میں	ڈاکٹر مسرت جہاں	272
7۔ جان ایلیا: ایک مطالعہ	ڈاکٹر روزینہ اختر	283
دوہے	یعقوب تصور	286
رباعی	سید محمد نور الحسن نور نوابی عزیزی	287

مضامین

Doctoral Fellowship for women,Dept.of Urdu Patna University)

Recommended by:Prof.Shahab Zafar Azmi(HOD Urdu Patna University,Patna)cell-8863968168

ڈاکٹر مسرت جہاں (پوسٹ ڈاکٹرل فیلو شعبہ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ)

شہاب ظفر اعظمی کی تنقیدی بصیرت: متن اور معنی کے تناظر میں

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی اردو فکشن کی تنقید کا ایک شناسا نام ہے۔ آپ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں درس و تدریس کے ساتھ نئی نسلوں کی آبیاری اور رول ماڈل کا ایک فعال اور متحرک نمونہ ہیں۔ اپنی گوناگوں مصروفیات کے علاوہ پڑھنے لکھنے کا ذوق و شوق رکھتے ہیں۔ نیز شعبہ کے جرنل کی ادارت کی ذمہ داری بھی انہیں کے سپرد ہے۔

اردو فکشن کی تنقید کے حوالے سے موصوف کی کتابیں ''اردو ناول کے اسالیب، جہانِ فکشن اور مطالعات فکشن'' کے نام سے منظر عام پر آچکی ہیں۔ یہ بھی کتابیں یک موضوعی اور افسانوی ادب کی مبادیات اور تنقیدی نظریات کو پیش کرتی ہیں۔ افسانوی ادب سے شغف اور اس کے تہذیبی اخلاقی، تعلیمی، سیاسی، سماجی، معاشرتی حالات کے مطمح نظر ان کی تحریریں نظریاتی اور عملی تنقیدی بصیرت کی جلوہ فرمائیاں ہوتی ہیں۔ سن ۲۰۱۴ء میں ان کی ایک کتاب ''متن اور معنی'' کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کی نوعیت مذکورہ کتابوں کی طرح یک موضوعی نہیں ہے۔ ''متن اور معنی'' اپنی گوناگوں تحقیقی، تنقیدی اور تاثراتی خصوصیات کے ساتھ تقریباً ڈھائی سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں شامل سبھی اکیس مضامین مختلف صنفوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مواد کے اعتبار سے متن کی معنویت، اس کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے مباحثہ، مطالعہ اور مکالمہ جیسے تین ضمنی عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے۔

مباحثہ کے تحت ان تحریروں کو جگہ دی گئی ہے جو ہر زمانے میں موضوع بحث رہے ہیں یا پھر یہ کہا جائے کہ ان تحریروں کی جانچ پڑتال اور بازیافت کی گئی ہے جو متعلقہ شاعر و ادیب کے یہاں شاذ و نادر ہی پائے جاتے ہیں۔ مباحثہ کے ضمن میں ''راجا رام نرائن موزوں کی اردو شاعری مجاز کا غزلیہ آہنگ، دیار ہندی میں فیض، پرویز شاہدی کی نظمیں: رومان اور انقلاب کا آمیزہ، جہاں

دیگر کا شاعر: شمیم قاسمی، صوفی مزاج غزل گو: قدسی مصباحی، خیالِ موسم اور جاوید ندیم'' ہیں۔ یہ سبھی مضامین تحقیقی اور معلوماتی ہیں اور اپنے اندر معلومات کا خزانہ سمیٹے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی جن شاعروں کے کلام کو اپنے ضابطہ تحریر میں لاتے ہیں اس کے متعلق پوری تفصیلات کو یکجا کر دیتے ہیں۔ راجا رام نرائن موزوں کا اردو شاعری کا سرمایہ بہت مختصر ہے شاید یہی وجہ ہے کہ اکثر نقادوں نے انہیں قابل اعتنا نہیں سمجھا۔ وہ فارسی کے صاحب دیوان شاعر ہیں۔ اگر چہ ان کے مزاج کی ہم آہنگی اور اردو زبان و ادب کے تئیں جوش وجذبے نے انھیں اردو شاعری کی طرف بھی مائل کیا۔ ان کی اردو شاعری کا سرمایہ دس بارہ اشعار سے زیادہ نہیں ہے۔ اس میں سے بھی زیادہ تر اشعار ایسے ہیں جو مشکوک ہیں۔ انہیں میں سے ایک شعر ہے

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانا مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

مذکورہ بالا شعر اکثر تذکرہ نگاروں اور نقادوں کے درمیان بحث کا موضوع رہا ہے۔ قاضی عبدالودود اور عطا کاکوی نے اس شعر کے تعلق سے کئی شبہات ظاہر کئے ہیں، مگر تلاش بسیار کے بعد فصیح الدین بلخی، اختر اور ینوی اور جمیل جالبی نے منشی عیوض رائے کی کتاب 'آفتاب مسرت' میں مذکورہ شعر کی زمین میں موزوں کے تین اور اشعار ملنے کی وجہ سے تسلیم کرتے ہیں کہ مذکورہ شعر راجا رام نرائن موزوں کا ہی ہے۔ گویا موزوں ایک ادب دوست اور علم پرور شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے بارے میں شہاب ظفر اعظمی لکھتے ہیں:

''موزوں نے اردو اشعار اگر چہ کم کہے ہیں، مگر یہی کم اشعار بہار میں اردو کے غیر مسلم شعرا کی تاریخ میں انھیں اولیت بخشتے ہیں۔ بہار کے غیر مسلم شعرائے اردو کی کوئی بھی تاریخ لکھی جائے وہ راجا رام نرائن موزوں سے ہی شروع ہوگی۔'' (متن اور معنی، ص ۱۶)

اس کا دوسرا اہم مضمون ''مجاز کا غزلیہ آہنگ'' ہے، چونکہ اسرار الحق مجاز اپنی ۴۴ سالہ زندگی میں شعری حسن کاری کے ساتھ نظموں اور غزلوں کی طرف مائل رہے۔ تناسب آدھے آدھے کا رہا ہے۔ مگر وہ ذہنی طور پر غزل کے شاعر تھے اور انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز غزلوں سے ہی کیا ہے۔ باوجود اس کے اردو کے ناقدوں نے ان کی تخلیق کے صرف ایک ہی پہلو پر غور و فکر کیا۔ اس کی وجہ آگرہ سے علی گڑھ کی منتقلی اور علی گڑھ کے ماحول اور ملک گیر سطح پر چل رہے اشتراکیت اور ترقی پسند تصورات کی تیز تر انقلاب تھی، جس نے ان کے مزاج اور لب و لہجے میں نئے رنگ و روپ کی تبدیلی پیدا کی اور وہ انفرادی فکر کے ساتھ نظمیں اور غزلیں کہنے لگے، مگر علی گڑھ کے علمی، ادبی اور

یاسی گلیاروں میں تواتر کے ساتھ لکھی جانے والی اشتراکی نظموں نے خوب دھوم مچائی۔ان کی نظموں میں موزونیت کے علاوہ نظم کی دوسری بڑی خاصیت یہ ہے کہ پوری نظم کے اندر ایک ہی طرح کے خیالات ونظریات کی ترجمانی ہوتی ہے اور موضوع کو کھل کر بیان کرنے کا بھر پور موقع ملتا ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ اردو کے ناقدوں نے ان کی غزلوں کی طرف توجہ مبذول نہیں کی۔اس یک طرفہ رویے کے برعکس شہاب ظفر اعظمی نے مجاز کے غزلیہ آہنگ اور لب و لہجے کو مطالعے کا حصہ بنا کر مجاز کی تخلیقی شان کو قوت بخشی ہے۔

'دیار ہندی میں فیض' شہاب ظفر اعظمی کی تنقیدی صلاحیتوں کا بہترین آئینہ دار ہے۔اس میں انہوں نے ہندوستان اور ہندی داں طبقے میں فیض کی مقبولیت پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔فیض صرف اردو داں حلقے میں ہی مقبول ومعروف نہیں ہیں بلکہ ہندی داں طبقہ بھی فیض کی شعر گوئی کو سراہتا ہے۔ان کے شعری مجموعے اردو کے علاوہ ہندی، پنجابی، انگریزی اور روسی زبان میں بھی ترجمہ ہوئے۔جس اعداد وشمار کے ساتھ ان کے شعری کلام اردو میں چھپتے رہے،اس سے کہیں زیادہ مقدار میں ہندی رسم الخط میں ان کی کتابیں منظر عام پر آتی رہتی ہیں۔اس کا بین ثبوت آج ان کی وفات کے بعد بھی صد سالہ سالگرہ پر دیار اردو کے علاوہ دیار ہندی میں بھی مثلاً ہندی رسالہ آج کل، نیا پتھ، انبھے ساچا اور پربھات خبر نے خاص نمبر اور گوشے شائع کئے۔شہاب ظفر اعظمی ہندی کے معروف ادیب اصغر وجاہت کے بیان کو نقل کرتے ہیں،جس سے فیض کی ہر دل عزیزی کا اندازہ ہوتا ہے۔

"ہندی نے فیض کو اپنا لیا ہے کیونکہ کسی بڑے شاعر کو کسی ایک زبان یا ملک سے باندھا نہیں جاسکتا۔وہ تو ہر دل کو گرماتا رہتا ہے۔" (متن اور معنی،ص ۳۵)

موجودہ دور کے صوفی مزاج شاعر قدسی مصباحی کا تعلق اور ان کا حسب ونسب اولاد رسول سے ملتا ہے۔خاندانی اعتبار اور عقیدت رسول کے تئیں بنیادی طور پر وہ نعتیہ شاعری کے لئے جانے جاتے ہیں۔انھوں نے شاعری کی مختلف صنفوں میں طبع آزمائی کی ہے،مگر ناقد موصوف ان کی اردو غزل کی سنجیدہ روی اور مزاج کی روحانی آب وتاب سے متاثر ہیں۔تین دہائیوں پر محیط قدسی مصباحی کا شعری کلام بتدریج ترقی کرتے ہوئے ذہنی فکر اور علم کی آگہی سے اوپر اٹھ کر ان کی ذات میں متصف ہو چکا ہے۔مثال کے طور پر ان کے دو اشعار دیکھیے

سیاہی فکر کی کاغذ پہ بہہ گئی قدسیؔ
ہم کہ بیٹھے تھے معنی کے اوراق میں

مری غزل کا ہر اک بانکپن شکستہ ہے
اور لفظوں کا پردہ کتابوں میں تھا

شمیم قاسمی اور جاوید ندیم کی غزلوں میں نئے ڈکشن اور پرانی روایات سے انحراف اور پرویز شاہدی کی نظموں کا مطالعہ ومحاسبہ مصنف کے ادبی ذوق کی نشاندہی کرتا ہے۔ مصنف نے اپنے تحقیقی اور تنقیدی پیش رفت میں نئے اور پرانے دونوں طرح کے شاعروں کا مطالعہ پیش کرتے ہیں۔ ان کے معمولی اور غیر معروف اشعار سے بھی اہم نکات ڈھونڈ کر نکال لیتے ہیں۔ شہاب ظفر اعظمی کی آرا سے ان کی علمی گفتگو کی عظمت اور مثبت پہلوا جاگر ہوتے ہیں۔ یہی خصوصیت ان کو اپنے ہم عصروں میں ممتاز رکھتی ہے۔

پیش نظر کتاب کا دوسرا حصہ متفرق، نثری، مضامین کے مطالعے پر مبنی ہے۔ اس کے بھی مضامین پچھلے سات مضامین کی طرح بھرپور مطالعے کی غماز ہیں۔ ان کے عناوین اردو داستانوں کا اسلوبی مطالعہ، ترقی پسند اردو ناول کے اسالیب، تانیثیت اور اردو کی نئی افسانہ نگار خواتین، بہار کی خواتین افسانہ نگار، شبلی نعمانی کی تعلیمی خدمات، منفرد مزاح نگار: مشتاق یوسفی اور تحریک آزادی اور اردو ادب (بہار کے حوالے سے) ہیں۔

اردو داستانوں کا اسلوبی مطالعہ میں فورٹ ولیم کالج سے قبل اور بعد کے معروف ومقبول داستانوں کا **بالاستعیاب** مطالعہ پیش کیا گیا ہے، جن کی ادبی حیثیت، تاریخی تہذیبی اور علمی اعتبار سے اہم ہے۔ فورٹ ولیم کالج سے قبل کے داستان 'سب رس'، 'قصہ مہر افروز و دلبر'، 'نوطرز مرصع'، 'نو آئین ہندی' اور 'عجائب القصص'، 'جذب وعشق' کے مطالعے کی وجہ ان کے خاص نکات مثلاً فارسی اور ہندی زبان کے شیر وشکر ہونے سے عبارت ہے جس سے ایک نئے علمی وادبی اسلوب نگارش کا آغاز، سادہ شستہ اور روزمرہ کی عام بول چال اور محاورہ بند زبان کا آغاز ہوتا ہے۔ مذکورہ داستانوں کا ماخذ فارسی ہے، مگر فارسی روایات سے ہٹ کر اردو کا اپنا ایک اسلوب جھلکتا ہے۔ قدیم ادبی داستان 'سب رس' سے 'جذب وعشق' تک کا سفر تقریباً ڈیڑھ سو برس کا ہے۔ اس اثناء میں بڑی سرعت سے اردو داستانوں نے اردو کے نثر کو دل نشیں ادب کا نمونہ بنا دیا ہے۔

انیسویں صدی کے آتے آتے اردو زبان وادب کو معتبر اور مستحکم اعتبار حاصل ہو چکا تھا۔ اردو زبان عربی و فارسی کی بیساکھی سے آزاد ہو کر کھلی ہوا میں سانس لے رہی تھی۔ اسی زمانے میں فورٹ ولیم کالج کو میر امن دہلوی جیسا مترجم نصیب ہوا اور باغ و بہار کو سادگی، سلاست، روانی اور ترسیل کی بے پناہ قوت نے دوامی شہرت حاصل کرائی۔

باغ و بہار کے علاوہ طوطا کہانی، آرائش محفل، داستان امیر حمزہ، بیتال پچیسی، حسن وعشق،

سنگھاسن بتیسی، چار گلشن، شکنتلا ناٹک، مادھونل اور کام کندلا، مذہب عشق، قصہ گل صنوبر، گلزار دانش، بہار عشق، قصہ فیروز شاہ وغیرہ فورٹ ولیم کالج کی تصنیفات ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام اور اس کی پیش کردہ تصنیفات کے ذریعے اردو زبان و ادب کے تعلق سے یہ کہنا بجا ہوگا کہ غیر متوقع طور پر اردو ادب کو فروغ اور پذیرائی حاصل ہوئی۔ فورٹ ولیم کالج کے باہر لکھی جانے والی داستانوں میں 'رانی کیتکی کی کہانی' اور 'فسانہ عجائب' کے علاوہ بیسیوں داستانیں لکھی گئیں، لیکن جو مقبولیت 'رانی کیتکی' اور 'فسانہ عجائب' کو ملی کسی دوسرے کو نہیں مل سکی۔ رانی کیتکی زبان و بیان کے اعتبار سے اس عہد کی تمام داستانوں سے یکسر مختلف ہے۔ صرف ہندی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور قصہ در قصہ کی داستانی روایت سے گریز کیا گیا ہے۔ فسانہ عجائب کی نثر پر تکلف و رنگین اور اس دور کی مظہر ہے۔ اس کی تشبیہیں اور استعارے لطیف اور مانوس ہیں۔ وہ الفاظ کا استعمال ایسی چابک دستی اور فنکارانہ مشاقی سے کرتے ہیں کہ بیان کی شان و شکوہ کے ساتھ مقصدیت اور تاثر اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔

شہاب ظفر اعظمی کے تین مضامین ''ترقی پسند اردو ناول کے اسالیب''، ''تانیثیت اور اردو کی نئی افسانہ نگار خواتین'' اور ''بہار کی خواتین افسانہ نگار'' کم و بیش ایک ہی صنف کے الگ الگ موضوعات لیے ہوئے ہیں۔ وہ ترقی پسند تحریک کے اسباب و علل، اس کے مقاصد، اس کے موضوعات، کردار اور بیانیہ اسلوب، مواد اور ہیئت میں تبدیلی کا بھرپور مطالعہ پیش کرتے ہیں۔ ترقی پسند اردو ناول کے پس منظر میں اس کی حقیقت نگاری، عدل و مساوات کے اشتراکی نظریات اور جنسی جذبات کی کامیاب عکاسی کو مصنف نے پیش کش کا موضوع بنایا۔ اس تعلق سے شہاب ظفر اعظمی لکھتے ہیں:

''ترقی پسندوں نے اس بیانیہ میں سماجی پیچیدگیوں کے ساتھ ساتھ زندگی کی کشمکش، نفسیاتی الجھنیں، طبقاتی سنگھرش اور ملکی سیاست کی جھلکیوں کو بھی سمیٹا جس سے ناول کا بیانیہ اسلوب سپاٹ نہیں رہا بلکہ اس اسلوب میں اظہار کی باخبر اور دانشورانہ دھمک پیدا ہوئی۔'' (''متن اور معنی''، ص ۱۱۶)

اردو کے مخصوص ناولوں جیسے ''لندن کی ایک رات'' نے اظہار و اسلوب 'شعور کے رو کی تکنیک' کے ذریعہ لندن میں موجود نوجوانوں کی نفسیاتی، ذہنی اور جذباتی حالات کا مرقع پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح عزیز احمد کا ناول 'گریز' انسانی زندگی کے مختلف اور متضاد گوشوں کو پیش کرنے کے لئے خطوط، ڈائری اور تاثراتی اسلوب کی مدد سے اپنی بات ظاہر کی ہے۔ عزیز احمد کا دوسرا ناول 'جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں' تاریخی نوعیت کا ہے۔ اس کا موضوع تیمور لنگ کی حیات ہے۔ اسے پیش

کرنے کے لئے ناول نگار نے تاریخوں، تذکروں اور داستانی اسلوب کا حربہ استعمال کیا ہے۔

اردو فکشن کو ایک نئی سمت دینے والے اور فکشن کو دنیا کی دوسری زبانوں میں مقبول بنانے والوں میں کرشن چندر نے اہم رول ادا کیا ہے۔ ان کے موضوعات میں تلخ سچائی ہے اور طنز میں حد درجہ تیکھا پن ہے۔ گدھا سیریز کے ناول ''ایک گدھے کی سرگزشت (۱۹۶۱ء)، گدھے کی واپسی (۱۹۶۲ء) اور ایک گدھا نیفا میں (۱۹۶۴ء)'' کرشن چندر کے انفرادی احساسات اور مشاہدات کو برتنے میں معاون ہیں۔ گدھا سیریز کے ذریعہ صرف گدھے کی داستان نہیں بلکہ پورے ہندوستانی سماج کا تذکرہ ہے اور گہرا طنز بھی۔ اردو کے دوسرے ناول نگاروں کے یہاں طنز کا پہلو نمایاں ہے، لیکن گدھے کی Trilogy افسانوی ادب میں صرف کرشن چندر کے ناولوں میں ہی ملتی ہے۔ وہ ہمیں سماج میں پھیلی برائیوں سے نہ صرف آگاہ کرنا چاہتے ہیں بلکہ ان تمام برائیوں کے لئے ہمارے اندر نفرت بھی پیدا کرتے ہیں اور ہمارے دلوں پر انسانی عظمت کا سکہ بٹھانا چاہتے ہیں۔

عصمت چغتائی بنیادی طور پر ایک حقیقت پسند اور ترقی پسند ناول نگار تھیں، جنہوں نے منٹو، بیدی اور کرشن چندر کی طرح ہی 'انگارے' کے فن کاروں سے فیض حاصل کیا تھا۔ اردو کی ترقی پسند خواتین ناول نگاروں میں عصمت چغتائی کو اولیت کا شرف حاصل ہے جنھوں نے سماج کے فرسودہ بناوٹی اقدار پر وار کیا اور اب تک شجر ممنوعہ سمجھے جانے والے جنسی موضوعات (طبقہ ناث اور طبقہ نوجوان) کا کھل کر اظہار کیا۔ ان کے ناول ضدی، دل کی دنیا، ٹیڑھی لکیر، معصومہ اور لحاف کو اس زمانے میں متنازعہ فیہ سمجھا گیا اور ان پر فحاشی کا الزام بھی لگایا گیا۔ شہاب ظفر اعظمی نے عصمت کے ان ناولوں کا تجزیہ کیا ہے جو براہِ راست ترقی پسند تحریک کے موضوع اور مواد کی پیروی کر رہے تھے اور سماج و معاشرے میں پھیلی برائیوں سے پردہ اٹھا رہے تھے۔ ان کی کہانیوں کے کردار تخیلی اور تصوری پیکر کے بجائے حقیقی اور اسی سماج سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ اس لیے ان کی زبان اور فطری ہے۔ اس تعلق سے شہاب ظفر اعظمی لکھتے ہیں:

''عصمت چغتائی کے کردار جو زبان بولتے ہیں وہ ان کی فطری زبان ہے جس میں شگفتگی، شوخی اور طنز کی ہلکی گہری چاشنی کے ساتھ ساتھ اس ٹھیٹھ اردو کا مزہ بھی ہے جو متوسط گھرانوں کی عورتیں بول چال میں بے ساختگی کے ساتھ استعمال کرتی ہیں۔ اس میں نہ کہیں ثقل کا احساس ہوتا ہے نہ تصنع اور آورد کا۔'' (متن اور معنی، ص ۳۴-۱۳۳)

ترقی پسند اردو ناول کے اسالیب کے ضمن میں ایک ہی عہد کے چار ناول نگاروں کے الگ

الگ فن پاروں کو انتقادی حصار میں شامل کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان سبھی فن کاروں (سجاد ظہیر، عزیز احمد، کرشن چندر اور عصمت چغتائی) نے اپنے اپنے دور کے ان مسائل کو پیش کیا ہے جو سابقہ کہانی کاروں کے موضوعات، مسائل، تجربات اور اسالیب سے یکسر مختلف ہیں لیکن اظہار کی نئی صورتوں کا اردو ناول کے روایتی طور طریقوں سے رشتہ استوار کرتے ہوئے سجاد ظہیر نے ناول 'لندن کی ایک رات' میں پہلی مرتبہ شعور کی رو کی تکنیک کو اردو ادب میں تجربے کے طور پر استعمال کیا تھا۔ اس کی کہانی لندن میں موجود ہندوستانی طالب علموں کی سیاسی سماجی اور معاشی انتشار کے پس منظر میں بیان کی گئی ہے۔ عزیز احمد نے بھی ناول 'گریز' میں انسانی زندگی کے بے شمار پہلوؤں کو بھرپور طریقے سے پیش کرنے کے لیے کہیں ڈائری اور کہیں خطوط کا انداز اختیار کیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح عصمت نے جنسی موضوعات کو اور کرشن چندر نے گدھے کی Trilogy کے اچھوتے طنزیہ مضامین کو پہلی بار ادب میں علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس کے تعلق سے شہاب ظفر اعظمی گویا ہیں۔

"عام آدمیوں کی طرح لکھنے پڑھنے بولنے دفتروں اور کوٹھیوں کے چکر کاٹنے، نیتاؤں اور وزیروں سے ملنے ملانے والا گدھا اصل میں بے حد باشعور گدھا ہے اور ایسے لوگوں کی علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے، جو ضرورت مند ہیں، جو استحصال کا شکار ہیں اور صبح و شام دفتروں کے چکر کاٹ رہے ہیں۔" (متن اور معنی، ص ۱۲۸)

خواتین افسانہ نگاروں کے لیے ابتدا سے ہی بہار کی سرزمین زرخیز رہی ہے۔ خواتین کہانی کاروں میں رشید جہاں وہ پہلی عورت ہیں جنہوں نے ناول 'اصلاح النساء' لکھ کر اولیت کا شرف حاصل کیا۔ رشید جہاں سے لے کر ذکیہ مشہدی تک افسانہ نگاروں کی کئی کھیپ سامنے آچکی ہے خصوصا بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں بہار کی خواتین افسانہ نگاروں نے سماجی ضرورتوں، اس کے تجربات واحساسات کو، انسانیت اور اس کے درد، عورتوں کی مفلسی اور بیچارگی، عورتوں کے مزاحمتی رویہ اور ان کی صلاحیتوں کو لفظی پیکر دے کر افسانہ نگاری کی دنیا میں امتیاز حاصل کیا ہے۔ اسی عنوان کی اگلی کڑی 'تانیثیت اور اردو کی نئی افسانہ نگار خواتین' ہے۔ اردو کی دوسری تحریکوں کی طرح تانیثی ادب کی تحریک بھی پہلے مغرب میں آئی۔ مادام بوار اور ورجینا وولف کی کتابیں نسائی تحریک کی بنیاد ثابت ہوئیں۔ ان میں عورت کی آزادی اظہار کے حق کے لیے آواز اٹھائی گئی۔ اردو افسانے میں تانیثی رجحان کے عوامل کو رشید جہاں، ممتاز شیریں اور عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، بانو قدسیہ، جیلانی بانو، زاہدہ حنا وغیرہ نے اپنے افسانوں اور ناولوں کے ذریعہ فروغ دیا۔ اردو افسانے کو خواتین نے جو

وسعت بخشی ہے اور جن وسیع تر انسانی تجربات سے اسے آشنا کیا ہے اس میں تانیثی فکر واحساس کی شدت، اسالیب کا تنوع، تجربات کا ازدہام اور اظہار کی جرأت فن کے روشن نشانات بن کر موجود ہیں۔تانیثیت کے رجحانات نے جدید افسانہ نگاروں کو بلاشبہ زیادہ بے باک اور حوصلہ مند بنادیا ہے۔ مردوں کے خلاف بے باکی اور کھل کر بیان کرنے کی جرأت اور ہمت اور تانیثی فکر واحساس کی شدت ۱۹۷۰۔۸۰ کے بعد کے ادب میں زیادہ نظر آتی ہے۔ان ادیباؤں میں ترنم ریاض، غزال ضیغم، ذکیہ مشہدی، قمر جہاں، نگار عظیم، ثروت خان، تبسم فاطمہ، اشرف جہاں، صبوحی طارق، شائستہ فاخری، عنبری رحمان، نزہت طارق ظہیری، نوشابہ خاتون، تسنیم فاطمہ، غزالہ قمر اعجاز، نصرت شمسی، عروج فاطمہ، افشاں زیدی اور رخسانہ صدیقی وغیرہ اہم ہیں۔ان کے افسانوں اور ناولوں میں تانیثی فکر واحساس کی شدت طرح طرح کے رنگ وروپ میں ابھر کر سامنے آئی ہے۔ان خواتین افسانہ نگاروں کو شہاب ظفر اعظمی نے اردو ادب وتنقید میں نمایاں مقام دیا ہے۔

شخصیت پر مبنی دو مضمون علامہ شبلی نعمانی کی تعلیمی خدمات اور مشتاق احمد یوسفی کی مزاح نگاری ہیں۔ یہ دونوں مضامین موضوع اور مواد کے اعتبار سے الگ الگ ہیں۔علامہ شبلی اپنے زمانے کی تعلیمات اور سابقہ روایات کی خامیوں اور کمیوں سے واقف تھے۔مسلمانوں کی زبوں حالی اور اور ان کے روشن مستقبل کے لئے فکر مند تھے۔انھوں نے ان کے اندر ذہنی اور عملی انقلاب پیدا کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا اور بہت غور وفکر کے بعد شبلی اس نتیجے پر پہنچے کہ قوم میں یہ انقلاب اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب نئی نسل کو صحیح قسم کی تعلیم دی جائے۔شبلی نے تعلیم میں بنیادی اصلاحات کی ضرورت کو محسوس کیا۔ چنانچہ انھوں نے قدیم نصاب تعلیم پر تنقید کی، انگریزی تعلیم پر زور دیا، بھوپال کے عربی مدارس کی تنظیم اور جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے نصاب تعلیم کی ترتیب میں بھرپور حصہ لیا، قدیم کتابوں کی اشاعت پر زور دیا، بیرون ملک شام، مصر اور روم کی علمی درسگاہوں و کتب خانوں کے طرز پر ہندوستان کی مختلف جگہوں پر تعلیمی ادارے اور لائبریریاں قائم کیں۔علامہ شبلی قدیم وجدید اصول تعلیم کے ساتھ ساتھ تعلیم نسواں کے بھی ہم نوا تھے۔

اردو ادب میں طنز ومزاح کی روایت کو مستقل اور مستحکم بنانے والوں میں سب سے پہلا نام مشتاق احمد یوسفی کا آتا ہے۔مشتاق احمد یوسفی نے صنف مزاح نگاری کو زندگی کی ہمہ جہت رنگارنگی کو بیان کرنے کا وسیلہ بنایا۔ان کی چار کتابیں چراغ تلے (۱۹۶۱)، خاکم بدہن (۱۹۶۹)، زرگزشت (۱۹۷۶) اور آب گم (۱۹۹۰) نمائندہ کتابیں ہیں۔ان کا اسلوبیاتی جائزہ پیش کرتے ہوئے شہاب

ظفر اعظمی لکھتے ہیں۔

"غرض ان پیروڈیوں کے مطالعے سے جہاں یوسفی کی جودت فکر ندرت بیان اور ان کے مخصوص اسلوب کا اندازہ ہوتا ہے وہیں وہ بحیثیت زبان داں کے بھی اپنا سکہ قارئین کے دلوں پر بیٹھا دیتے ہیں۔زبان کا اتنا بھرپور، برجستہ اور تخلیقی استعمال آسان کام نہیں۔اس سے یہ بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یوسفی جب پیروڈیوں کے حربوں کا اتنا خوبصورت استعمال کر سکتے ہیں تو مزاح کے دیگر حربوں مثلاً فقرہ بازی، قول محال، تضاد، ترکیب سازی، تشبیہات، تمثیلات اور محاورات سے کس خوبی کے ساتھ کام لیتے ہونگے۔(متن اور معنی، ص ۱۸۱)

متن اور معنی کا تیسرا اور آخری حصہ مکالمہ ہے اس کے سات مضامین پریم چند کا اسلوب ناول نگاری، شموئل احمد کا ناول 'ندی' اسلوب واظہار کی روشنی میں، سوالوں سے جوجھتا افسانہ نگار: رحمن شاہی، قاسم خورشید کا تخلیقی جہان: کینوس پر چہرے، اسلم جمشید پوری اور لینڈرا کے پانچ رنگ، تنوع پسند افسانہ نگار: انور امام اور اکیسویں صدی کی نرملا۔ پریم چند کا اسلوب ناول نگاری، شموئل احمد کا ناول 'ندی' اسلوب واظہار کی روشنی میں جیسے مضامین کا بھرپور مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ پریم چند نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی اور جن معاملات سے دوچار ہوئے تھے ان سے حاصل شدہ تجربات اور مشاہدات کے انفرادی پہلو کو ادب میں جگہ دی ہے۔انہوں نے سارے ہندوستان کی دیہی زندگی کی معاشی زبوں حالی کی سچی تصویر کشی کی ہے اور اپنے ناولوں میں عوام کو مرکزی مقام عطا کیا ہے۔شہاب ظفر اعظمی نے پریم چند کے اسلوب کے کئی اہم نکات پر رشنی ڈالی ہے۔ پریم چند سادہ اور زمینی حقیقت کا بیان، ہندی، اردو اور فارسی زبان پر یکساں عبور اور کردار و ماحول کے لحاظ سے الفاظ و مکالمے کا برمحل استعمال کرتے ہیں۔اپنے بیان واظہار میں زور اور تسلسل پیدا کرنے کے لئے الفاظ اور افعال کی تکرار، بیک وقت متضاد الفاظ کا استعمال اور سوال وجواب والے مکالمے تو کبھی ڈرامائی تاثر قائم کرنے کے لئے طرح طرح کے طریقے اپناتے ہیں۔ پریم چند کی ناول نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"پریم چند چوں کہ ایک پختہ شعور کے مالک تھے۔ان کے پاس چند اصول ٹھوس حقائق اور سچائیاں ایسی تھیں جن پر انہیں بھرپور اعتماد تھا اور جن کا حصول ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔اس لئے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات نے انھیں بہت کم متاثر کیا اور وہ اردو ناول کی روایتی فنی اقدار کو قائم رکھتے ہوئے اس میں بہترین اضافہ کرنے میں کامیاب رہے۔انہوں نے نہ صرف ماضی

کی روایات کو اپنا کر عظمت حاصل کی بلکہ حال کی وسعتوں کو اپنے ناولوں میں مثبت طریقے سے سمو کر مستقبل کی ترقی کے امکانات کو بھی اس طرح سمیٹ لیا کہ ان کی ناول نگاری میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا۔" (متن اور معنی، ص ۲۰۳)

شموئل احمد کا ناول 'ندی' (۱۹۹۳ء) ایک علامتی اور استعاراتی کہانی ہے۔ ناول میں شموئل احمد نے دو مختلف اور متضاد کرداروں کو ایک ساتھ جمع کر کے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ زندگی دو مختلف اجناس کے باہمی تعلقات، آپسی ہم آہنگی، ایثار و قربانی، محبت و خود سپردگی اور جذبہ خلوص کا نام ہے۔ ناول 'ندی' میں لفظ 'ندی' بطور علامت اور استعارہ لایا گیا ہے۔ علامت کے طور پر ندی زندگی ہے۔ ندی روانی ہے، ندی عورت ہے اور مختلف جگہوں پر استعارے کی شکل میں کہیں شوخ آنکھوں، اداس نگاہوں اور پانی کا ملگجا ہونا، لہروں کا اٹھنا اور گرنا وغیرہ وغیرہ۔ شہاب ظفر اعظمی نے ایک علامتی کہانی کے اظہار و اسلوب کے ہر ایک پہلو جن کی مدد کے بغیر کسی بھی عمدہ اور مثالی فن پارے کے حسن کو ظاہر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ان سارے پہلوؤں کو فرداً فرداً پیش کرتے ہیں۔ شموئل احمد کی اساطیری اور دیومالائی زبان، تشبیہوں، استعاروں، تمثالوں، علامتوں کا استعمال اور مکمل جملے شموئل احمد کی ناول کے اہم عناصر ہیں۔ پچویشن اور موضوع کے اعتبار سے بے باک اور کھلی ہوئی زبان کا استعمال ناول کے نفسیاتی اور فلسفیانہ پس منظر کو ابھارتا ہے۔

پریم چند اور شموئل احمد کی ناول نگاری کے اسلوب کے علاوہ پانچ مضامین فن افسانہ نگاری سے تعلق رکھتے ہیں جو کم و بیش ان کے ان معاصرین سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے ۱۹۸۰ء کے بعد جدید افسانہ نگاروں کی صف آرائی میں حصہ لیا ہے۔ ادب لکھنے والے ہر ایک ادیب کے ذہنی و فکری مطالعے، مشاہدے اور تصورات کا انفرادی عکس اس کے فن پارے میں موجود ہوتا ہے اور وہ انفرادیت ادب سے دلچسپی رکھنے والے قاری و ناقد کو اپنی طرف متوجہ کراتی ہے۔ رحمان شاہی کے افسانوں میں سماج و معاشرت میں جینے والی زندگیاں طرح طرح کے سوالوں سے نبرد آزما ہوتی ہیں مثال کے طور پر وہ موت اور زندگی کے سوال، مجبوری اور اختیار کے سوال، محبت اور تہذیب کے سوال، کرپشن اور ایمانداری کے سوال، نئی اور پرانی قدروں کے سوال کھڑے کرتے ہیں۔ قاسم خورشید افسانوی مجموعہ کینوس پر چہرے کے ذریعہ انہوں نے سماجی زندگی کے ان ترقی پسند چہروں کو موضوع بنایا ہے جو مواد اور پیش کش دونوں لحاظ سے ترقی پسند تحریک کے موضوعات کے متقاضی ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ قاسم خورشید کے افسانوں میں وہی چہرے شامل ہوتے ہیں جو سماج کے اندر موجود مفلر

اور ناچار، مجبور و بے کس زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ یہ وہی چہرے ہیں جو اس ترقی یافتہ ہندوستان کی حقیقی ترجمان ہیں۔

شہاب ظفر اعظمی رحمن شاہی کے افسانوں میں پیش کئے گئے سماجی سوالوں قاسم خورشید کے حقیقت پسند موضوعات اور اسلم جمشید پوری کے فکری ارتعاش اور اشرف جہاں کے افسانوں کا اجمالی جائزہ لیتے ہوئے ان کے فن اور اسلوب نگارش کے ہر ایک نکتے کو **تنقیدی زاویہ نظر** سے پرکھتے ہیں اور افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کے امتیازی نکات کو بیان کرتے ہیں۔

''متن اور معنی'' کا ہر ایک مضمون چاہے تنقیدی ہو یا تحقیقی۔ مصنف موضوع کے لحاظ سے متن کے سارے اوراق کو معنی کے آئینے میں پرت در پرت کھولتے ہیں اور قاری کو متن کے الجھاو اور ذہنی تشنگی سے نجات دلانے کے لیے آسان معنی و مفہوم کے ساتھ ادبی فن پارے کے حسن و قبح کو پیش کر دیتے ہیں۔

☆☆☆

ISSN-2322-0341
Issue-57 April-June2022 شمارہ اپریل تا جون

فروری 2022 قیمت ₹15

www.urducouncil.nic.in

ماہنامہ

اردو دنیا

Monthly URDU DUNIYA New Delhi

مالیگاؤں کتاب میلہ 2021

उर्दू दुनिया, मासिक, फरवरी-२०२२,वर्ष:२४, अंक:२
URDU DUNIYA Monthly, February-2022, Vol.24, Issue:02
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India
RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3194/2020-22
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication: 24/01/2022
Total Pages

بھارت — سوچھ
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم وآگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی وتحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش وجستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندوستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326، A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبہ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: sales@ncpul.in

شاخ: 22-7-110، محمد رفیق، ساجد یار جنگ کمپلیکس بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 040-24415194

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

اردو دنیا

URDU DUNIYA

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:24، شمارہ:02، فروری 2022

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین: عبدالرشید اعظمی، یوسف رامپوری، ذیاب حسن

دفتر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت تعلیم، حکومت ہند

مطبع:
ڈی ایس پرنٹ میڈیا،...کھلا صنعتی علاقہ
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرم
لے آؤٹ: محمد زید

قیمت: 15/- روپے سالانہ: 150/- روپے

Total Pages:100

- مضامین میں ظاہر کی گئی آرا سے NCPUL کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ
نئی دہلی-110025

فون: 49539000 شعبہ ادارت: 49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبہ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746 فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، ... حیدرآباد-500002
فون: 040-24415194

مشمولات

ہماری بات 4

دید و شنید
قارئین کے خطوط 5

رپورتاژ
دہلی اردو کتاب میلہ — ذیاب حسن 8

اسپ تحقیق و تنقید
مخدوم کی شاعری میں تصور عشق کی حقیقت — اسلم آزاد 20
پروفیسر ابوالکلام قاسمی کی تنقیدی بصیرت اور خسرو شناسی — ریاض توحیدی 23

آزادی کے بعد اردو خواتین ناول نگاروں کا تنقیدی جائزہ — سیدہ تبسم سلطانہ 25
مولوی عبدالرحمن کی تصنیف مرآۃ الشعر — نسیم الدین 28
بہار میں اردو فکشن کی تنقید — مسرت جہاں 32

حسین الحق
فکشن کے ایک روشن باب کا خاتمہ — محمد شارب 36
زبیر الحسن غافل کی شاعری کے امتیازی پہلو — فاطمہ خاتون 39

جن کتابوں نے مجھے متاثر کیا — ریاض احمد ... 41

شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی میں اردو تحقیق کی سمت و رفتار — عمیرہ بانو 43

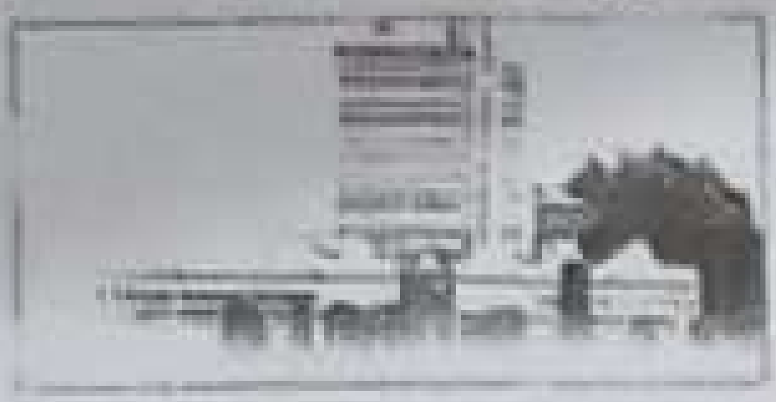

زبان و ادب
یوسف ناظم کی کتاب — ذکی ممتاز 46

صحافت
ٹیگنگ کے متعلق — محمد حنیف خان 49
اردو طنز و مزاح اور اردو صحافت — محمد فاروق 53

چراغ راہ
اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں صوفیائے دکن کا حصہ — احمد 55

خصوصی گفتگو
عبدالصمد انصاری سے ایک ملاقات — محمد اسلم ... 58

زبان اور زمینی صورت حال
اردو جوڑنے کا کام کرتی ہے توڑنے کا نہیں — عمران عاکف خان 61

نیا آسمان نئی دستک
اردو غزل کا علامتی نظام — ساجد ممتاز 63
1857 کے بعد اردو شاعری میں حب الوطنی کا تصور — شکیل ... 67

کتابوں کی دنیا
تعارف و تبصرہ — ادارہ 69

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 90

24ویں قومی اردو کتاب میلے کی تصویری جھلکیاں

مسرت جہاں

بہار میں اردو فکشن کی تنقید
روایت اور صورتِ حال

اردو تحقیق، تذکروں کے ابتدائی مراحل طے کرتے ہوئے مکمل فن کی صورت 'کاشف الحقائق' میں رونما ہوئی۔ اس کی شہرت و مقبولیت علمی اور تاریخی لحاظ سے کسی قدر حالی کے مقدمہ شعر و شاعری سے کم نہیں ہے۔ اردو تنقید کے تذکرہ دار دور کے بعد اردو تنقید کی باضابطہ روایت نے فن کی صورت اختیار کرلی۔ جیسے جیسے اردو تنقید نے ترقی کے مراحل طے کیے ویسے ویسے اس کی مختلف جہتیں رونما ہونے لگیں۔ تنقید کے وسیع اور پھیلتے دائرہ کار کو انتشار کی زد سے بچانے کی غرض سے مختلف اصناف کے طور پر اردو نظم کی تنقید، اردو غزل کی تنقید، اردو مثنوی، مرثیہ، قصیدے کی تنقید اور ڈرامے کی تنقید، اردو افسانے اور ناول کی تنقید وغیرہ کے عنوانات دیے جانے لگے۔

بہار کے ابتدائی تنقید نگاروں میں امداد امام اثر، عبدالغفور شہباز، شاد عظیم آبادی، فضل حق آزاد اور نصیر الدین خیال کے نام اہم ہیں۔ دوسرے دور کے ادب نوازوں میں جمیل مظہری، سید سلیمان ندوی، معین الدین دردائی، کلیم الدین احمد اور اختر اورینوی وغیرہ جیسی معروف شخصیتوں نے اردو ادب کی تنقید کو مستحکم کیا اور وقار بخشا۔

بہار میں اردو فکشن کی تنقید کے حوالے سے اختر اورینوی اور کلیم الدین احمد کا نام سرفہرست ہے۔ ان دونوں شخصیات کا تعلق پٹنہ یونیورسٹی سے رہا ہے۔ پروفیسر اختر اورینوی کی شخصیت اپنی ذات میں انجمن ہے۔ وہ بیک وقت افسانہ نگار، ناول نگار، تنقید نگار اور محقق کے ساتھ شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی کی سرپرستی بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔ ان کے افسانوی مجموعے کینچلیاں اور بال جبریل، سیمنٹ اور ڈائنامائٹ، منظر و پس منظر، کلیاں اور کانٹے، سپنوں کے دیس میں وغیرہ نیز ناول 'حسرتِ تعمیر' بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے تنقید کے سرمائے میں بھی قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ ان کی نگارشات میں شامل اردو شعر و شاعری یا نثری تصنیف، اس کے اصول و ضوابط اور ان کے روشن پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔ تحقیق و تنقید، مطالعہ و محاسبہ، مطالعہ اقبال، مطالعہ نظیر اور مجلس اردو ادب' وغیرہ ان کی تنقیدی کتابیں ہیں۔

'تحقیق و تنقید' (جدید) ترمیم و اضافے کے ساتھ 1962 میں کتابستان الہ آباد سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں شامل مضامین افسانوی نقطۂ نظر سے بے حد اہم ہیں۔ افسانہ فنی نقطۂ نظر سے، افسانے میں مقصد، افسانے میں حقیقت طرازی کے علاوہ فن ناول نگاری اور نذیر احمد دہلوی، بہار میں اردو ناول نگاری کے موضوعات پر مضامین شامل ہیں۔ 'مطالعہ و محاسبہ' پروفیسر اختر اورینوی کے دس مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں علی عباس حسینی کے دو افسانوی مجموعے 'میلہ گھومنی' اور 'آئی سی ایس (چند افسانے)' کا تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہوئے خوبیوں کے ساتھ ان کے فنی عیوب کو بھی ظاہر کیا گیا ہے۔

پٹنہ یونیورسٹی کی ذی وقار شخصیتوں میں پروفیسر کلیم الدین احمد کا شمار ہوتا ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد انگریزی کے استاد تھے۔ انگریزی شعر و ادب کے ساتھ ساتھ اردو شعر و ادب خصوصاً اردو تنقید پر ان کی خاص نگاہ رہی ہے۔ اردو تنقید پر ان کی مختلف کتابیں ہیں۔ اردو شاعری پر ایک نظر، اردو تنقید پر ایک نظر، سخن ہائے گفتنی، عملی تنقید، اقبال ایک مطالعہ، میری تنقید ایک بازدید اور ادبی تنقید کے اصول۔ ان میں ایک کتاب 'اردو زبان اور فن داستان' بھی ہے۔ یہ کلیم الدین احمد کے عمدہ تنقیدی تجربات و مشاہدات کا نمونہ ہے جس میں ان کے تنقیدی افکار بخوبی ابھرتے ہیں۔

پروفیسر آصفہ واسع کا تحقیقی مقالہ گراں قدر اہمیت کا حامل ہے۔ 'بہار میں اردو ناول نگاری' کے موضوع پر ان کا پر مغز مقالہ 'الف، ب اور ج' کے تین ضمنی حصوں میں منقسم ہے۔ حصہ 'الف' میں پس منظر کے طور پر 'ہندوستان کے سماجی اور سیاسی حالات' (1857 سے 1947 تک) کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے اور حصہ 'ج' میں شائق احمد عثمانی اور امداد امام اثر کو ضمیمے کے طور پر شامل کیا ہے۔ حصہ 'ب' موصوفہ کا اصل تحقیقی حصہ ہے۔ ان کے احاطۂ تحقیق میں ابتدا سے 1947 تک کے ان سبھی ناول نگاروں کا ذکر بہ تفصیل ناول موجود ہے، جن کا تعلق سرزمین بہار سے ہے۔ آخر میں ناول کے فن پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی قدر و قیمت متعین کی ہے۔ معروف ناول نگاروں میں عظیم آباد اور دوسرے مراکز کے ناول نویسوں کی تصنیفات کا بھی تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ شاد عظیم آبادی، محمد اعظم، افضل الدین، صفیر بلگرامی، رشیدۃ النسا، سجاد عظیم آبادی، عرش گیاوی، اسلم عظیم آبادی، محمد حنیف فائز عظیم آبادی، رام انوج سہائے، آل حسن معصوی، شمس گیاوی، جمیل مظہری اور اختر اورینوی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کے مطالعے اور تحقیقی رویے کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ محترمہ نے دیدہ ریزی اور عمیق رویے سے کام لیا ہے۔ کتاب کے پیش لفظ میں وہ وثوق کے ساتھ کہتی ہیں:

"یہ مقالہ 1965 میں داخل ہوا تھا۔ اس وقت تحقیق کی راہ میں دشواریاں بہت تھیں۔ نئے مواد کی فراہمی کا کام بہت مشکل تھا۔ میں نے اگلے ہوئے نوالے نہیں چبائے ہیں۔ بلکہ اچھوتا اور بالکل نیا کام ادب میں پیش کیا ہے، جس کی روشنی سے اہل قلم فائدہ اٹھاتے ہیں۔"

(بہار میں اردو ناول نگاری: پروفیسر آصفہ واسع، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی 1997، ص 9)

انگریزی زبان وادب سے گہرا شغف رکھنے والے پروفیسر عبدالمغنی کو عربی، فارسی اور اردو تینوں زبان پر عبور حاصل تھا۔ انگریزی کتابوں کے علاوہ پروفیسر عبدالمغنی کی متعدد اردو کتابیں شائع ہوئیں۔ ان کی تنقیدی کتابوں

[illegible] کے نام یہ ہیں: [illegible] نظر (1965)، جادۂ اعتدال (1972)، برنارڈ شا (1976)، تشکیل جدید (1976)، معیار و اقدار (1981)، اقبال اور عالمی ادب (1982)، مولانا ابوالکلام آزاد: ذہن و کردار (1989)، اسلوب نقد (1989)، تنویر اقبال (1990)، عظمت غالب (1990)، اقبال کا نظریہ خودی (1990)، قرۃ العین حیدر کا فن (1991)، تنقیدی زاویے (1993) اور فروغ تنقید وغیرہ ان کی یادگار ہیں۔ عبدالمغنی کی ان کتابوں میں سے ان کا ذکر ضروری ہے جن میں فکشن کے تعلق سے ان کے مقالات سامنے آئے ہیں۔ 'جادۂ اعتدال' (1972) موصوف کے دوسرے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اکیس تنقیدی مقالات میں سے تین مقالے فکشن پر ہیں۔ اختر اورینوی کی افسانہ نگاری، علی عباس حسینی کی افسانہ نگاری اور شین مظفر پوری کی افسانہ نگاری۔ یہ سبھی مضامین اپنی نوعیت کی منفرد تحریریں ہیں۔ 248 صفحات پر مشتمل متفرق مضامین مختلف اصناف ادب سے تعلق رکھنے والی عبدالمغنی کی کتاب 'تنقیدی زاویئے' کے نام سے سنہ 1993 میں آصف پبلی کیشنز، علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ کتاب میں شامل سات مضامین اردو فکشن کے بڑے فنکاروں کے فن پر ان کی گہری نگاہ اور تیز مشاہدے کو پیش کرتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر: ایک منفرد فنکار، چاندنی بیگم، قاضی عبدالغفار بحیثیت ادیب، لہو کے پھول: ایک تنقیدی مطالعہ، غلام عباس کی فنکاری، کشمیری لال ذاکر کی ناول نگاری اور آدھے چاند کی رات جیسے مضامین فکشن کی تنقید میں اضافہ ہیں۔

'قرۃ العین حیدر کا فن' (1991) عبدالمغنی کی عمدہ تنقیدی کتابوں میں سے ایک ہے۔ انھوں نے یہ پوری کتاب قرۃ العین حیدر کے فکر و فن اور ان کی شخصیت کے لیے مختص کر دیا ہے۔ 'اختر اورینوی کے افسانے' کے نام سے پروفیسر عبدالمغنی نے اختر اورینوی کے عمدہ افسانوں کا انتخاب کیا ہے۔ اختر اورینوی کے بہترین اور عمدہ افسانوں کو ایک جگہ جمع کرنے کی سعی کار خیر کے مترادف ہے اور ہم جیسے ادب کے طالب علموں کے لیے زاد راہ بھی۔ عبدالمغنی نے کتاب کے شروع میں اختر اورینوی کی افسانہ نگاری کے عنوان سے ایک مبسوط مقدمہ تحریر کیا ہے۔ مقدمہ اختر اورینوی کی کم و بیش پوری زندگی اور ان کے فن کا احاطہ کرتا ہے۔ اس مضمون کے معتبر اور مستند ہونے کی مثال اس طور پر دی جا سکتی ہے کہ خود عبدالمغنی کے ذریعے 25 جولائی 1976 کو انٹرویو کے درمیان جو بحثیں تنقیدی اور ادبی تناظر میں ہوئی تھیں اس کا بھی ذکر انھوں

نے کیا ہے۔ اختر اورینوی کی اشاریت (Symbolism) اور سریت (Mystification) کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے بعض افسانوں میں اشاریت تو پائی جاتی ہے مگر وہ سریت سے مبرا ہیں۔

صوبہ بہار کی عبقری شخصیت پروفیسر وہاب اشرفی کو بیک وقت عہد ساز نقاد، محقق، افسانہ نگار، صحافی، استاد اور دانشور جیسی مختلف حیثیتوں سے اعتبار حاصل ہے۔ ان کی تعلیمی اور علمی لیاقت کی واضح مثال 'تاریخ ادبیات عالم' کی سات جلدیں اور 'تاریخ ادب اردو' کی تین جلدیں ہیں۔ ویسے تو وہاب اشرفی کی تصنیفات و تالیفات کی تعداد بہت ہے۔ مگر اردو فکشن کی تنقیدی نگارشات میں ان کی کتاب 'معنی کی تلاش' اہم ہے۔ اس کا ایک مضمون 'افسانے کا منصب' ہے۔ جو موضوع سے پوری طرح انصاف کرتا ہے۔ 'سہیل عظیم آبادی اور ان کے افسانے' میں سہیل کے نمائندہ افسانوں مثلاً الاؤ، جینے کے لیے، سادھو اور بیسوا، اور بدصورت لڑکی وغیرہ کا خوبصورت تجزیہ پیش کیا ہے۔ 'معنی سے مصافحہ' کے مشمولات میں ایک طرف شعری اصناف سے تعلق رکھنے والے سودا اور غالب کی شاعری پر مضامین ہیں تو دوسری طرف معاصر فکشن کے نمائندہ لکھنے والوں مثلاً جیلانی بانو، احمد یوسف، عبدالصمد، شوکت حیات، شموئل احمد، جابر حسین اور محمود واجد وغیرہ کے فن کا بھی بے باکی سے احاطہ کرتے ہیں۔ 'اردو فکشن اور تیسری آنکھ' میں شامل مضامین فکشن سے متعلق وہاب اشرفی کے نقطۂ نظر کو واضح کرتے ہیں۔ انھوں نے فکشن کے بنیاد گزاروں کے ساتھ معاصر فنکاروں کا بھی جائزہ لیا ہے۔ خاص طور سے تقابلی نگاہ ڈالتے ہوئے معاصر فکشن کے امتیازات واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنی اس کتاب میں بڑے خوبصورت نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

''ادب مماثلتوں کی تلاش کا فن ہے۔ یہ فن اسی وقت بالیدہ ہوتا اور نکھرتا ہے، جب کوئی تخلیق جمالیاتی احساس سے بہرہ ور ہوتی ہے۔ موضوعات کی کثرت میں، کسی ایک یا ایک سے زیادہ کا ادب بذات خود کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بات تب خاص ہو جاتی ہے جب فنکار کا احساس جمال اسے جلا بخشتا ہے، ورنہ موضوع اپنے آپ میں محترم نہیں، نہ ہی چھوٹے اور بڑے موضوع کی تفریق کسی ادب پارے کے چھوٹے یا بڑے ہونے کی شہادت ہے۔''
(اردو فکشن اور تیسری آنکھ: پروفیسر وہاب اشرفی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 2005، ص 5)

اردو فکشن کی تنقید میں قدوس جاوید کا نام نیا نہیں ہے۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی قدوس جاوید معتبر اور موقر رسالوں میں چھپتے رہے ہیں۔ پٹنہ یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد کشمیر یونیورسٹی، سری نگر میں لکچرر ہوئے اور وہیں مقیم ہیں۔ 'جدید اردو افسانہ' کے موضوع پر ان کا تحقیقی مقالہ اپنے آپ میں گراں قدر اہمیت کا حامل ہے۔ 'تقسیم ملک، فسادات اور افسانہ' اور 'آخر شب کے ہم سفر اور سماجی شعور' بھی ان کی اہم کتابیں ہیں۔ انھیں اردو ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں کے علاوہ بنگالی زبان و ادب کے معروف و مقبول فکشن رائٹر شرت چندر چٹرجی اور ٹیگور کی کہانیوں کا جائزہ بھی بڑے خوبصورت انداز میں لیا ہے۔

'متن، معنی اور تھیوری' کے نام سے پروفیسر موصوف کی کتاب 2015 میں ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی نے شائع کی ہے۔ اس میں شامل ایک مضمون 'افسانے کی شعریات' ہے جس میں اردو افسانہ کی ابتدا سے لے کر اکیسویں صدی کی پہلی دہائی تک کے اسرار و رموز اور افسانے کی شعریات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

پروفیسر اسلم آزاد کا براہ راست واسطہ فکشن کی تنقید سے ہے۔ 1974 میں پروفیسر اختر اورینوی کی نگرانی میں 'اردو ناول 1947 سے 1967 تک' کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند حاصل کی۔ ان کا تحقیقی مقالہ 'اردو ناول آزادی کے بعد' (1981) کے نام سے شائع ہوا۔ پیش نظر کتاب میں پروفیسر موصوف نے 'ناول کا فن'، 'ناول کا ارتقا' اور اس کے رجحانات پر خاص توجہ دی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے پندرہ فکشن رائٹر (عزیز احمد سے قاضی عبدالستار تک) کے ناول پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ خدیجہ مستور کا مشہور و معروف ناول 'آنگن' کا تنقیدی جائزہ 1978 میں شائع ہوا۔ 'عزیز احمد بحیثیت ناول نگار' کے نام سے بھی پروفیسر اسلم آزاد کی کتاب موضوع گفتگو رہی ہے۔ انھوں نے عزیز احمد کے اہم ناولوں مثلاً ہوس (1932)، مرمر اور خون (1936)، گریز (1943)، آگ (1946)، ایسی بلندی ایسی پستی (1947) اور شبنم (1949) کو اپنے مطالعے کا حصہ بنایا ہے۔

صوبۂ بہار کے اہم اور خاص ادبا اور شعرا میں پروفیسر اعجاز علی ارشد کا نام لیا جاتا ہے۔ انھوں نے اردو ادب کی مختلف صنفوں پر طبع آزمائی کی ہے۔ تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھنے کے علاوہ ان کا خاص میدان ظرافت نگاری اور شاعری ہے۔ ان کی دو کتابیں 'کرسی اور کرنسی' اور 'دعوت اور عداوت' طنز و ظرافت پر ہیں۔ 'نشاط غم' اور 'دھوپ کا مسافر' شعری مجموعے ہیں۔ ان کی دوسری کتابیں سید عاشور کاظمی: فنکار اور فن، منشورات جمیل مظہری (ترتیب مع مقدمہ) اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'اسلوب و معنی'،

…اردو تنقید اور بہار کی بہار (دو جلدیں)' ہیں علاوہ …فکشن کی تنقید کے زمرے میں ان کی خدمات اردو …کے سرمائے میں بہت بڑا اضافہ ہیں۔ جن میں 'توبۃ …ایک جائزہ، نذیر احمد کی ناول نگاری، کرشن چندر کی …نگاری، ہم عصر اردو فکشن: چند زاویے وغیرہ اہم ہیں۔

'اسلوب و معنی' (1989) پروفیسر اعجاز علی ارشد کے …مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کے دیگر …سے قطع نظر ان کے افسانوی مضامین 'اردو افسانہ …علامت'، 'گدی کا افسانہ تج دو: تحلیل و تجزیہ'، 'سہیل …عظیم آبادی اور ان کی تحریریں: ایک تحقیقی جائزہ' ہیں۔ یہ …مضامین اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد اہمیت کے …حامل ہیں۔ ان کی دوسری اہم کتاب 'کرشن چندر کی ناول …نگاری' ہے۔ پیش نظر کتاب موصوف کی تنقیدی بصیرت …اور آگہی کی شناخت کراتی ہے۔ ان سے قبل کم و بیش …سبھی فکشن ناقدوں نے کرشن چندر کا ناول 'شکست' کو …موضوع بحث بنایا ہے جبکہ پروفیسر موصوف نے کرشن چندر …کے تقریباً سبھی ناولوں کا فرداً فرداً مطالعہ و محاسبہ کیا ہے۔ …پوری کتاب کرشن چندر کی شخصیت کی تعمیر، ان کی ذہنی …تشکیل اور اسلوب نگارش کے مطالعے پر مبنی ہے۔ 'نذیر احمد …کی ناول نگاری' پروفیسر اعجاز علی ارشد کا تحقیقی مقالہ ہے۔ …ڈپٹی نذیر احمد کے سبھی ناولوں کا مطالعہ پیش کرتے ہوئے …ناول کے فن، پلاٹ، تکنیک، کردار نگاری اور ان کے …طرز نگارش کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ حال ہی میں …ان کی ایک اور کتاب 'توبۃ النصوح ایک تلخیص ایک جائزہ' …کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ 'ہم عصر اردو فکشن چند زاویے' …(2010 کتابی دنیا، دہلی) میں بارہ مضامین شریک …اشاعت ہیں جو خالص فکشن پر مبنی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کا …ناولٹ سیتاہرن، شکیلہ اختر کی ناول نگاری، عبدالصمد کی …ناول نگاری اور عہد حاضر میں لکھے جا رہے ناولوں کا سیر …حاصل مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اردو افسانے کے تعلق سے …مغرب کے اہم رجحانات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

عصری تنقیدی منظر نامے کا ایک مسلم الثبوت نام …عبدالکلام قاسمی کا ہے۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی وہ تقابلی مطالعے کی طرف راغب رہے۔ 1978 میں ای ایم فورسٹر کی کتاب Aspects of the Novel(1927) کا اردو ترجمہ 'ناول کا فن' کے نام سے کیا ہے۔ یہ کتاب ناول کی تنقید اور اس کی فنی خصوصیات پر مبنی ہے۔ ای ایم فورسٹر نے دو نئی اصطلاح آہنگ اور پیٹرن کا اضافہ کیا۔ اس کی مثال میں مختلف ناولوں کے پلاٹ اور نثری آہنگ کو پیش کیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ پروفیسر موصوف نے Aspects of the Novel کا اردو ترجمہ کیا اور اردو ناول کے فن کو دو نئی اصطلاح سے متعارف کرایا ہے۔ ان کی دوسری کتاب 'تخلیقی تجربہ' میں اردو فکشن اور اردو فکشن نگار کے متعلق وسیع اور مبسوط مقالات زیر بحث آئے ہیں۔ موصوف نے قدیم و جدید تخلیقی متون کا تجزیہ پیش کر کے نئے اور پرانے متون کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ 'اردو فکشن آزادی کے بعد..... مسائل اور مباحث' میں سمینار میں پڑھے گئے مقالات کو ترتیب دیا گیا ہے۔ جس میں اردو افسانے اور ناول کے مسائل پر کھل کر گفتگو ہوئی ہے۔

اردو فکشن کے معروف ناقدوں میں پروفیسر ارتضیٰ کریم کا نام لیا جاتا ہے۔ وہ بیک وقت اردو ادب کی مختلف جہتوں پر گامزن ہیں۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز 'آٹھویں دہائی میں بہار کا اردو ادب (1986)' سے کیا، مگر ان کی توجہ فکشن کی تنقید پر رہی ہے۔ 'عجائب القصص کا تنقیدی مطالعہ' (1987) کے ساتھ 18 ویں صدی کے دوسرے نثر نگاروں کا جائزہ لیتے ہوئے شاہ عالم ثانی کے معاصر ادیبوں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ 'جوگندر پال... ذکر، فکر اور فن' مختلف ادیبوں کے مقالات اور خود جوگندر پال کے مضامین سے مزین ہے۔ 'قرۃ العین حیدر... ایک مطالعہ' اور 'انتظار حسین... ایک دبستان' معیار و اقدار کے اعتبار سے نمائندہ کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ 'مابعد جدیدیت اور پریم چند' میں ارتضیٰ کریم نے مابعد جدیدیت کے تناظر میں پریم چند کے فن پاروں کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ دو جلدوں میں ترتیب دی گئی کتاب 'آزادی کے بعد اردو افسانہ' کی فہرست سازی میں گوپی چند نارنگ اور اسلم جمشید پوری جیسی قد آور شخصیات کی شمولیت عمدہ ترتیب سازی کی ضمانت ہے۔ 'اردو فکشن کی تنقید' فکشن کی تنقیدی روایت اور پس منظر پر لکھی جانے والی پہلی کتاب ہے۔ فکشن کے ضمن میں صرف ناول اور افسانوں کو ہی نہیں بلکہ ڈرامے، تمثیل اور داستان کو اپنے مطالعے کا حصہ بنا کر اس پر مبسوط اور مدلل طریقہ کار سے بحث کی ہے۔ کتاب کے آخر میں اردو فکشن کا اشاریہ بھی شامل کیا ہے۔ یہ کتاب اردو فکشن کی تنقید پر کام کرنے والوں کے لیے بنیادی کتاب ثابت ہوئی ہے۔

خواتین فکشن تنقید نگاروں میں پروفیسر اشرف جہاں کا مقام بلند و بالا ہے۔ ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ 'اکیسویں صدی کی زرملا' اور 'اگر میں نا ہوتی' ان کے بہترین افسانوی مجموعے ہیں۔ 'ہم اردو کے ٹیچر ہوئے' انشائیہ کے طرز پر لکھی گئی ہے، جبکہ ان کی تین تنقیدی کتابیں جن کا تعلق براہ راست فکشن کی تنقید سے ہے۔ فن کردار نگاری اور ڈپٹی نذیر احمد، اردو ناول کے آغاز میں دبستان عظیم آباد کا حصہ اور اردو افسانے کا بدلتا مزاج۔ 'فن کردار نگاری اور ڈپٹی نذیر احمد' پر ان کا تحقیقی مقالہ ہے۔ 'اردو افسانے کا بدلتا مزاج' میں انھوں نے مختلف عہد میں افسانوی ہئیت، اس کے موضوعات اور بیان کے قاعدے کو احاطۂ تحریر میں لیتے ہوئے ترقی پسند تحریک، جدیدیت اور مابعد جدیدیت، اردو افسانہ 1947 کے بعد جیسے موضوعات کے تحت اردو افسانے پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ 'اردو ناول کے آغاز میں دبستان عظیم آباد کا حصہ' اشرف جہاں کی عمدہ تصانیف میں شمار کی جاتی ہے۔

گزشتہ دو دہائیوں سے اردو فکشن کی تنقید پر کام کرنے والوں میں ڈاکٹر ہمایوں اشرف کا نام نمایاں ہے۔ ان کی متعدد کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ فکشن کی تنقید پر ان کی اہم کتابیں عبدالصمد عکس در عکس، غیاث احمد گدی: فرد اور فنکار، کلیات سعادت حسن منٹو آٹھ جلدیں ہیں۔ فکشن کی بازیافت (2013)' تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے اس کے علاوہ الیاس احمد گدی اور رضا نقوی واہی کے فن پاروں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

موجودہ دور کے اہم فکشن کے نقادوں میں صفدر

...ہم مواری کا نام آتا ہے۔ ان کی جلد گرانوں میں کوش
مطالعہ (2016)، محمد حسین آزاد کا تنقیدی شعور اور دیگر
مضامین (2015)، نسبتجولات (2016) وغیرہ کے
مطالعہ سے ان کی تنقیدی بصیرت کا اندازہ ہوتا
ہے۔ ... نام خورشید نے کوئی منظر نامے پر 'گئودان' میں
کردار کا جائزہ لیتے ہوئے ناول 'گئودان' کو مختلف
زاویے سے پرکھا ہے۔ ناول 'گئودان' پریم چند کا شاہکار
ناول ہے۔ دیہی زندگی کے مسائل کی عکاسی جس ہنرمندی
سے پریم چند نے کی ہے اسے اردو اور ہندی کے علاوہ
مختلف شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے مفکروں اور
دانشوروں نے صرف قدر کی نگاہ سے دیکھا ہی نہیں بلکہ
ہندوستان کی سر فیصد آبادی کی سسکتی ہوئی زندگی کو محسوس
کیا ہے۔ ان کی دوسری اہم کتاب 'متن اور مکالمہ' کے نام
سے 2014 میں شائع ہوئی۔ 'متن اور مکالمہ' کا اندراج
... جدت و ندرت کی نمائندگی کرتا ہے قابل تعریف
ہے۔ ان کی تمام آراء سے تشفی نظر بیری نگاہ موضوع کی
مناسبت سے ان چند بحثوں پر مرکوز ہے جن کا تعلق فکشن
سے ہے۔ 1960 کے بعد خواتین ناول نگار، بیدی اور روشنی
کی رفتار، نئی تنقید اور عبد روف کے افسانے، انگریزی ادب
اور جاسوسی ناول، کلیم عظیم آبادی: اردو فکشن کا اسکول،
سید قیصر وغیرہ فکشن نگاروں اور ان کے فن پاروں پر وسیع
تناظر میں سیر حاصل گفتگو موجود ہے۔

جذبات کی پیشکش کی گہرائی و گیرائی کو سمجھنے کی کوشش کرتے
ہیں۔ ان کے تنقیدی تجربے میں متن کا مرکزی خیال اور
مصنف کے زاویہ نگاہ کی آمیزش ہوتی ہے۔ یہی اسلوب
ان کو ان کے ہم عصروں میں انفراد بخشتا ہے۔

'اردو ناول کے اسالیب' چار سو صفحات پر مشتمل عمدہ
تنقیدی جہات کا مجموعہ ہے۔ موصوف نے ناول کے آغاز
و ارتقا کا احاطہ کرتے ہوئے مختلف ادوار کی مناسبت سے
پانچ ابواب میں تقسیم کر کے ہر ایک دور کے اہم ناول
نگاروں اور ناولوں کا مطالعہ پیش کرتے ہیں۔ اردو ناول
ترقی پسند تحریک کے بعد، جدیدیت اور مابعد جدیدیت
جیسے نظریات و رجحانات کے حامل ناول نگاروں مثلاً
عبدالصمد، پیغام آفاقی، الیاس احمد گدی، سید محمد اشرف،
غضنفر، ساجدہ زیدی، محمد علیم، کوثر مظہری، شفق، آچاریہ
شوکت خلیل اور شاہد اختر اور دوسرے فن کاروں کے بھی
فن پاروں کو تنقیدی پیمانے پر پرکھتے ہیں۔

کتاب 'متن اور معنی' اپنی گوناگوں تحقیقی، تنقیدی
اور تاثراتی خصوصیات کے ساتھ مختلف موضوعات لے کر
2013 میں شائع ہوئی۔ اس میں شامل بھی اکیس مضامین
مختلف صنفوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ فکشن کے تعلق سے
اس میں اردو داستانوں کا اسلوبی مطالعہ، ترقی پسند اردو
ناول کے اسالیب، تانیثیت اور اردو کی نئی افسانہ نگار
خواتین، بہار کی خواتین افسانہ نگار جیسے موضوعات ہیں۔

کے حوالے سے اہم عصر ادب تک مختلف جہات سے اردو فکشن
پر گفتگو کی گئی ہے۔ انفراد کے حصے میں نئی پرانی کتابوں کا
تبصرہ شامل ہے۔ یہ تبصرے ذاکر کے مخصوص فکر و اسلوب
کی غمازی کرتے ہیں۔ امتیاز کے تحت اس فکشن نگاروں کا
مجموعی طور پر جائزہ لیا گیا ہے۔ ان میں زیادہ تر معاصر
فکشن نگاروں کی ہے۔ ناقد موصوف کا مثبت اور غیر
جانبدارانہ رویہ ان کے مزاج میں داخل ہے۔ اس طور پر
ہم کہہ سکتے ہیں کہ معاصر فکشن نگاروں کے متون کی روشنی
میں ان کی امتیازی شناخت قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کی مرتب کردہ
دو کتابیں 'قرات: مطالعہ، محاسبہ' اور 'صالحہ عابد حسین: فنی
اور فکری جہات' کے نام سے اردو فکشن کی تنقید میں مزید
اضافہ ہیں۔ ان دونوں کتابوں کی ادبی قدر و قیمت اور
معنویت اس لحاظ سے اہم ہے کہ 'قرات' آٹھویں دہائی
کے بعد منظر عام پر آنے والی کتابوں میں سے ایک ہے۔
اس کتاب کی تفہیم و تعبیر میں پرانے لکھنے والوں کے ساتھ
نئے قلمکاروں کو شامل کر کے ان کے نقطۂ نظر کو پیش کیا گیا
ہے۔ اسی سلسلے کی موصوف کی دوسری کتاب 'صالحہ عابد
حسین: فنی اور فکری جہات' میں شامل مضامین سیمینار میں
پڑھے گئے مقالات ہیں۔ ان دونوں کتابوں کی دستاویزی
اہمیت اردو ادب میں مسلم ہے۔

بہار میں اردو فکشن کی تنقید پر لکھی گئی کتابوں کی
فہرست بہت لمبی ہے جن کا احاطہ یہاں ممکن نہیں ہے۔
اس لیے چند ناموں کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اس
ضمن میں شمیم صادقہ (قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں
نسوانی کردار)، ڈاکٹر نسیم احمد (اردو ناول پر تقسیم ہند کے
المیے کے اثرات)، شمشاد جہاں (کرشن چندر کے ناولوں
میں نسوانی کردار)، ثریا جبیں (عصمت چغتائی بحیثیت
افسانہ نگار)، ڈاکٹر سورج دیو سنگھ (اردو اور ہندی کے
سیاسی ناول: ایک تقابلی مطالعہ)، ابوبکر رضوی (اردو
افسانے میں مہملیت کا رجحان)، واجدہ تبسم (قاضی عبد
الستار کی ناول نگاری کا تنقیدی مطالعہ)، مسرت جہاں
(قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری: ایک تنقیدی مطالعہ)،
رضوانہ پروین (الیاس احمد گدی اور بنجیو کی ناول نگاری کا
تقابلی مطالعہ)، شمع انجم (اردو افسانوں میں دلت مسائل کا
جائزہ) وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر شہاب ظفر
اعظمی نئی نسل کے معتبر تنقید نگاروں میں سے ایک ہیں۔
یوں تو شہاب ظفر اعظمی کی نگاہ فکشن کے علاوہ ادب کی
دوسری اصناف پر بھی رہتی ہے لیکن ان کی اساس اور
پہچان فکشن کے اسلوبیاتی مطالعے سے ہوتی ہے۔ فکشن
کے فن پاروں کے بھی اجزا پلاٹ، کردار، منظر، پس منظر و
زبان و بیان پر خود کو مرکوز کرتے ہوئے اس کے اسلوب
پر سنجیدگی، غیر جانبداری اور تعمیری نقطۂ نظر ان کے سامنے
ہوتا ہے۔ ان کی سنجیدگی اس بات کی طرف توجہ مبذول
کراتی ہے کہ وہ متن کو صرف ناقد کی نظر سے نہیں دیکھتے
ہیں بلکہ مصنف کے وژن، اس کے تجربات و احساسات و

جو عمیق مطالعہ اور غور و فکر کی جانب ذہن کو مرکوز کراتے
ہیں۔ حال کے دنوں میں موصوف کی کتاب 'جہان فکشن'
اور 'مطالعات فکشن' یک موضوعی تنقیدی مضامین کا مجموعہ
ہے۔ ان دونوں کتابوں کے بھی مضامین اردو کے افسانہ
نگاروں اور ناول نگاروں کے مطالعے پر مشتمل ہے۔

'مطالعات فکشن' کو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی
نے 2018 میں عمدہ گیٹ اپ کے ساتھ شائع کیا ہے۔
موصوف نے اپنی سہولت کے لیے اختصاص، امتیاز اور
انفراد جیسے تین ضمنی حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اختصاص کے
تحت ناول اور افسانہ کے تعلق سے تحقیقی اور تنقیدی نوعیت
کے پانچ مضامین شامل ہیں۔ ان میں ترقی پسند تحریک

Dr.Masarrat Jahan
Post-Doc.Fellow,Patna University
Patna-800005 (Bihar)
Mob:09696042640/09801377362
E-mail: drmasarratjahan...@gmail.com

۱۰-۹
ISSN: 2249-7854

اردو جرنل

یو جی سی سے منظور شدہ شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی کا اکیڈمک ریسرچ جرنل

خصوصی
مطالعہ

اردو زبان و ادب کی فروغ میں پٹنہ یونیورسٹی کی خدمات

مدیر

URDU JOURNAL 9-10

اردو جرنل ۱۰-۹

ISSN: 2249-7854

Special issue on
"Contribution of Patna University
to the Development of Urdu Language and Literature"

NO BRANCH
Ph. : 2303206
سونے، چاندی اور ہیرے کے گارنٹی شدہ زیورات
خزانہ جویلرس
مرادپور پٹنہ ۴
Khazana JEWELLERS
(Hallmark)
Khazana JEWELLERY
Opp. Patna Dental College, Near-Patna Market
MURADPUR, PATNA-4

© جملہ حقوق بحق شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی محفوظ

نام مجلّہ : اردو جرنل (ISSN:2249-7854)
اشاعت : ۲۰۱۸۔۱۹ء
کتابی سلسلہ : ۹۔۱۰
ناشر : شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۵
صفحات : 548
اس شمارے کی قیمت : 500روپے (پانچ سو روپے)
لائف ممبر شپ کی قیمت : -/5000 پانچ ہزار روپے
کمپوزنگ : ڈاکٹر تو قیر عالم، پٹنہ سٹی 9430818387
ملنے کا پتہ : شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۵
مطبع : کریٹیو اسٹار پبلی کیشنز، نئی دہلی

URDU JOURNAL (9-10)

UGC APPROVED RESEARCH JOURNAL NO. 42271

Cheif Editor
Dr. Jawed Hayat
(H.O.D.)
jawedhayat@yahoo.in

Editor
Dr. Shahab Zafar Azmi
(Associate Professor)
shahabzafar.azmi@gmail.com

Published by
Department of Urdu
Patna University, Patna-800005

ترتیب

ابتدائیہ	ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی	۷
شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی		
ثار مادر علمی تری یادوں پہ نثار	پروفیسر قدوس جاوید	۲۶
مخلصے دیدم	پروفیسر اعجاز علی ارشد	۴۳
نذر اقبال ہاسٹل (نظم)	پروفیسر طلحہ رضوی برق	۶۲
دو پھول امر ہیں	پروفیسر حسین الحق	۶۳
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا	پروفیسر اشرف جہاں	۶۶
اب کیا کہیں یہ قصہ پرانا بہت ہوا	ڈاکٹر قاسم خورشید	۷۱
پٹنہ یونیورسٹی۔ ایک صدی	ڈاکٹر عبدالمالک	۷۶
نشان عظمت (نظم)	ڈاکٹر توقیر عالم توقیر	۸۳
پٹنہ یونیورسٹی: گہوارۂ علم وادب	ڈاکٹر الفت حسین	۸۵
اردو فکشن تنقید اور پٹنہ یونیورسٹی	ڈاکٹر مسرت جہاں	۹۵
اردو افسانہ اور پٹنہ یونیورسٹی	ڈاکٹر شاذیہ کمال	۱۰۴
اردو ناول اور پٹنہ یونیورسٹی	ڈاکٹر رضوانہ پروین	۱۲۲
اردو ادب کا فروغ اور پٹنہ یونیورسٹی	نزہت آرا	۱۳۳
شعبۂ اردو کا ترجمان۔ اردو جرنل	حذیفہ شکیل	۱۳۶
شعبۂ اردو کے صدور: ابتدا تا حال	شہناز بانو	۱۵۲

ڈاکٹر مسرت جہاں
پی ڈی ایف، شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

اردو فکشن تنقید اور پٹنہ یونیورسٹی

اردو تخلیق، تنقید یا تحقیق کا مشکل بھرا سفر آج جس منزل کو پہنچا ہوا ہے، وہاں تک پہنچانے والے اشخاص اس کا سہرا ادارے کے سرپرست کے سر بھی بندھتا ہے۔ جب کسی ادارے یا تنظیم کا سربراہ خود ہی مشہور و ا اپنی ذات میں انجمن ہو تو اس کے ساتھ کام کرنے والے عملے کو مزید تقویت ملتی ہے اور ہمہ وقت کام خوشگوار ماحول مہیا ہوتا ہے۔ شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی کی باگ ڈور پروفیسر اختر اورینوی جیسی عبقری نے سنبھالی اور اس کی آبیاری میں روز و شب گزارے تو سفر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جب میں اردو فکشن بات شعبۂ اردو کے حوالے سے کرتی ہوں تو میرے ذہن میں سب سے پہلا نام پروفیسر اختر اورینوی کا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ خود پروفیسر اورینوی کی ذات فکشن نگار کی حیثیت سے جانی پہچانی جاتی ہوں نے افسانوی مجموعے کیچلیاں اور بال جبریل، سیمنٹ اور ڈائنامائٹ، منظر و پس منظر، کلیاں اور کانٹے، کے دیس میں وغیرہ نیز حسرت تعمیر جیسا ناول بھی پیش کیا۔ انہوں نے تنقید کے سرمائے میں بھی قابل قدر ہے۔ ''تحقیق و تنقید''، ''مطالعہ و محاسبہ''، ''مطالعہ اقبال''، ''مطالعہ نظیر'' اور ''مجلس اردو ادب'' وغیرہ ان کی کتابیں ہیں۔

''تحقیق و تنقید'' (جدید) ترمیم و اضافہ کے ساتھ 1962ء میں کتابستان الہ آباد سے شائع ہوئی۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ اس میں شامل مضامین افسانوی نقطۂ نظر سے بے حد اہم ہیں۔ افسانہ فنی نقطۂ نظر سے، ہیں مقصد، افسانے میں حقیقت طرازی، مثال نگاری کے علاوہ فن ناول نگاری اور نذیر احمد دہلوی، بہار میں ں نگاری کے موضوعات پر مضامین شامل ہیں۔ ''مطالعہ و محاسبہ'' پروفیسر اختر اورینوی کے دس مختلف کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس میں علی عباس حسینی کے دو افسانوی مجموعے ''میلہ گھومنی'' اور ''آئی سی ایس (چند)'' کا تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہوئے ان کے فنی عیوب اور اوصاف کو ظاہر کیا گیا ہے۔ دیگر مضامین مختلف کے ہیں جن کا ذکر یہاں ضروری نہیں ہے۔

پٹنہ یونیورسٹی کی ادبی وقار شخصیتوں میں پروفیسر کلیم الدین احمد کا شمار ہوتا ہے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد

رہی ہے۔ اردو تنقید پر ان کی مختلف کتابیں ہیں، "اردو شاعری پر ایک نظر"، "اردو تنقید پر ایک نظر"، "سخنہائے گفتنی"، "عملی تنقید"، "اقبال ایک مطالعہ"، "میری تنقید ایک بازدید" اور ادبی تنقید کے اصول۔ ان میں ایک کتاب "اردو زبان اور فن داستان گوئی" بھی ہے۔ یہ کلیم الدین احمد کے عمدہ تنقیدی تجربات و مشاہدات کا نمونہ ہے۔ کلاسیکی نثری داستانوں میں امیر حمزہ یا طلسم ہوشربا، بوستان خیال اور الف لیلیٰ مشرقی ادبیات کا عظیم الشان سرمایہ ہیں۔ ان کے علاوہ باغ و بہار، آرائش محفل اور فسانۂ عجائب، مختصر اور منظوم داستانوں میں مثنوی سحر البیان اور گلزار نسیم مطالعے میں رہی ہیں۔ داستان کی تنقید و تحقیق میں یہ کتاب کتاب حوالہ کے طور پر معروف ہے۔

شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی میں اردو فکشن کی تنقید کے حوالے سے پروفیسر آصفہ واسع کا تحقیقی مقالہ گراں قدر اہمیت کا حامل ہے۔ "بہار میں اردو ناول نگاری" کے موضوع پر ان کا پر مغز مقالہ "الف، ب اور ج" کے تین ضمنی حصوں میں منقسم ہے۔ حصہ "الف" میں پس منظر کے طور پر "ہندوستان کے سماجی اور سیاسی حالات" (۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک) کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے اور حصہ "ج" میں شائق احمد عثمانی اور امداد امام اثر کو ضمیمہ کے طور پر شامل کیا ہے۔ حصہ "ب" موصوفہ کا اصل تحقیقی حصہ ہے۔ اس میں ابتداء سے ۱۹۴۷ء تک کے ان سبھی ناول نگاروں کا ذکر بہ تفصیل موجود ہے، جن کا تعلق سرزمین بہار سے ہے۔ آخر میں ناول کے فن پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی قدر و قیمت متعین کی گئی ہے۔ معروف ناول نگاروں میں عظیم آباد کے شاد عظیم آبادی، محمد اعظم، افضل الدین، صفیر بلگرامی، رشیدۃ النساء، روشنک بیگم، سجاد عظیم آبادی، عرش گیاوی، اسلم عظیم آبادی، محمد حنیف، فائز عظیم آبادی، رام انوج سہائے، آل حسن معصومی، شمس گیاوی، جمیل مظہری اور اختر اورینوی کے ناولوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کے مطالعے اور تحقیقی رویے کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ محترمہ نے دیدہ ریزی سے کام لیا ہے۔ کتاب کے پیش لفظ میں وہ وثوق کے ساتھ کہتی ہیں۔

"یہ مقالہ ۱۹۶۵ء میں داخل ہوا تھا۔ اس وقت تحقیق کی راہ میں دشواریاں بہت تھیں۔ نئے مواد کی فراہمی کا کام بہت مشکل تھا۔ میں نے اگلے ہوئے نوالے نہیں چبائے ہیں۔ بلکہ اچھوتا اور بالکل نیا کام ادب میں پیش کیا ہے، جس کی روشنی سے اہل قلم فائدہ اٹھاتے ہیں"۔(۱)

پروفیسر عبدالمغنی پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے استاد تھے۔ انگریزی زبان و ادب کے ساتھ ساتھ انہیں عربی، فارسی اور انگریزی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ اسلامی تہذیب و تمدن و ثقافت کے ماننے والے تھے۔ اسی لئے وہ مشرقی افکار کے نقاد کہے جاتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو، بہار کے صدر بھی ہوئے۔ بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلانے والوں میں ان کی حیثیت مرکزی رہی ہے۔ انگریزی کتابوں کے علاوہ پروفیسر

طور پر اردو کے ناقد ہیں۔ نقطۂ نظر (۱۹۶۵ء)، جادۂ اعتدال (۱۹۷۲ء)، برنارڈ شا (۱۹۷۶ء)، تشکیل جدید (۱۹۷۶ء)، معیار و اقدار (۱۹۸۱ء)، اقبال اور عالمی ادب (۱۹۸۲ء)، مولانا ابوالکلام آزاد: ذہن و کردار (۱۹۸۹ء)، اسلوب نقد (۱۹۸۹ء)، تنویر اقبال (۱۹۹۰ء)، عظمت غالب (۱۹۹۰ء)، اقبال کا نظریہ خودی (۱۹۹۰ء)، قرۃ العین حیدر کا فن (۱۹۹۱ء)، تنقیدی زاویے (۱۹۹۳ء) اور فروغ تنقید وغیرہ ان کی یادگار ہیں۔ عبدالمغنی کی ان کتابوں میں سے اُن کا ذکر ضروری ہے، جن میں فکشن کے تعلق سے ان کے مقالات سامنے آئے ہیں۔ "جادۂ اعتدال" (۱۹۷۲ء) پروفیسر موصوف کے دوسرے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اکیس تنقیدی مقالات میں سے تین مقالے فکشن پر ہیں۔ اختر اورینوی کی افسانہ نگاری، علی عباس حسینی کی افسانہ نگاری اور شین مظفر پوری کی افسانہ نگاری۔ یہ سبھی مضامین اپنی نوعیت کی منفرد تحریریں ہیں۔ ۲۴۸ صفحات پر مشتمل متفرق مضامین سے تعلق رکھنے والی عبدالمغنی کی کتاب "تنقیدی زاویے" کے نام سے سن ۱۹۹۳ء میں آصف پبلیکیشنز علی گڑھ سے شائع ہوئی تھی۔ کتاب میں شامل مضامین میں سے سات اردو فکشن کے بڑے فنکاروں کے فن پر ان کی گہری نگاہ، تیز مشاہدے کو پیش کرتے ہیں۔ قرۃ العین حیدر: ایک منفرد فنکار، چاندنی بیگم، قاضی عبدالغفار بحیثیت ادیب، لہو کے پھول: ایک تنقیدی مطالعہ، غلام عباس کی فنکاری، کشمیری لال ذاکر کی ناول نگاری اور آدھے چاند کی رات وغیرہ جیسے مضامین نے "تنقیدی زاویے" کی اردو فکشن کی تنقیدی کتابوں میں ادبی اہمیت متعین کی ہے۔

"قرۃ العین حیدر کا فن" (۱۹۹۱ء) عبدالمغنی کی عمدہ تنقیدی کتابوں میں سے ایک ہے۔ انہوں نے یہ پوری کتاب قرۃ العین حیدر کے فکر و فن اور ان کی شخصیت کے لئے مختص کر دیا ہے۔ "اختر اورینوی کے افسانے" کے نام سے پروفیسر عبدالمغنی نے اختر اورینوی کے ہر زمانے کے عمدہ افسانوں کا انتخاب کیا ہے۔ اختر اورینوی کے بہترین اور عمدہ افسانوں کو ایک جگہ جمع کرنے کی سعی کار خیر کے مترادف ہے اور ہم جیسے طالب علموں کے لیے زاد راہ بھی۔ عبدالمغنی نے کتاب کے شروع میں اختر اورینوی کی افسانہ نگاری کے عنوان سے ایک مبسوط مقدمہ تحریر کیا ہے۔ مقدمہ اختر اورینوی کی کم و بیش پوری زندگی اور ان کے فن کا احاطہ کرتا ہے۔ اس مضمون کے معتبر اور مستند ہونے کی مثال اس طور پر دی جاسکتی ہے کہ خود پروفیسر عبدالمغنی کے ذریعہ ۲۵ر جولائی ۱۹۷۶ء کو انٹرویو کے درمیان جو بحثیں تنقیدی اور ادبی تناظر میں ہوئی تھیں اس کا بھی ذکر انہوں نے کیا ہے۔ اختر اورینوی کی اشاریت (Symbolism) اور سریت (Mystification) کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے بعض افسانوں میں اشاریت تو پائی جاتی ہے مگر وہ سریت سے مبرا ہیں۔

اردو فکشن تنقید میں قدوس جاوید کا نام نیا نہیں ہے۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی قدوس جاوید معتبر اور موقر رسالوں میں چھپتے رہے ہیں۔ پٹنہ یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد کشمیر یونیورسٹی سری نگر میں لیکچرر

حامل ہے۔ قدوس جاوید بیک وقت مختلف زبان کے فکشن فن پاروں پر نگاہ رکھتے ہیں۔ اردو ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں کے علاوہ بنگالی زبان وادب کے معروف ومقبول فکشن رائٹر شرت چندر چٹرجی اور ٹیگور کی کہانیوں کا بھی جائزہ لیا ہے۔ دراصل ایک ہی زمانہ کے تین مشہور کہانی کار پریم چند (۱۹۳۶۔۱۸۸۰ء)، شرت چندر چٹرجی (۱۹۳۸۔۱۸۷۶ء) اور ٹیگور (۱۹۴۱ء۔۱۸۶۱ء) نے کم وبیش ہندوستان کی دیہی زندگی کی عکاسی بڑی خوبی کے ساتھ کی ہے۔ اس تعلق سے قدوس جاوید لکھتے ہیں۔

"پریم چند، شرت چند اور ٹیگور تینوں نے ہی اپنے عہد کی زندگی کی تلخ کامیوں اور کرب انگیزیوں کو بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر جھیل کر اپنے غور وفکر، مطالعہ ومحاسبہ کی رو نمائی میں ایسے ادب کی تخلیق کی جو عصری شعور وآگہی سے کچھ اس طرح رشتہ وپیوستہ ہے کہ ان کی تخلیقات کو سامنے رکھ کر انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے نصف اول کو سماجی، سیاسی اور معاشی وتہذیبی کروٹوں کی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔" (۴)

"تقسیم ملک، فسادات اور افسانہ" اور "آخر شب کے ہم سفر اور سماجی شعور" بھی ان کی اہم کتابیں ہیں۔

"متن، معنی اور تھیوری" کے نام سے پروفیسر موصوف کی کتاب ۲۰۱۵ء میں ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی نے شائع کی ہے۔ اس میں شامل مضمون "افسانے کی شعریات" اردو افسانہ کی ابتدا سے لے کر اکیسویں صدی کی پہلی دہائی تک کے اسرار ورموز کا احاطہ کرتا ہے۔ اور افسانے کی شعریات طے کرتا ہے۔

پروفیسر اسلم آزاد کا براہ راست واسطہ فکشن کی تنقید سے ہے۔ پروفیسر اسلم آزاد پٹنہ یونیورسٹی کے طالب علم بھی رہے ہیں اور بعد میں یہاں کے استاد بھی ہوئے۔ ۱۹۷۴ء میں پروفیسر اختر اورینوی کی نگرانی میں "اردو ناول ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۷ء تک" کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند حاصل کی۔ ان کا تحقیقی مقالہ "اردو ناول آزادی کے بعد" (۱۹۸۱ء) کے نام سے شائع ہوا۔ پیش نظر کتاب میں پروفیسر موصوف نے "ناول کا فن"، "ناول کا ارتقاء" اور اس کے رجحانات پر خاص توجہ دی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے پندرہ فکشن رائٹر (عزیز احمد سے قاضی عبدالستار تک) کے ناولوں پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ خدیجہ مستور کے مشہور ومعروف ناول "آنگن" کا تنقیدی جائزہ ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔ "عزیز احمد بحیثیت ناول نگار" کے نام سے بھی پروفیسر اسلم آزاد کی کتاب موضوع گفتگو رہی ہے۔ انہوں نے عزیز احمد کے اہم ناولوں مثلاً ہوس (۱۹۳۲ء)، مرمر اور خون (۱۹۳۶ء)، گریز (۱۹۴۳ء)، آگ (۱۹۴۶ء)، ایسی بلندی ایسی پستی (۱۹۴۷ء) اور شبنم (۱۹۴۹ء) کو اپنے

وطن شہر عظیم آباد ہے۔ تعلیم اور تعلم کے بعد آپ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ آپ کے ادبی کارناموں کی ایک لمبی فہرست ہے۔ انہوں نے اردو ادب کی مختلف صنفوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ تحقیقی وتنقیدی مضامین لکھنے کے علاوہ ان کا خاص میدان ظرافت نگاری اور شاعری ہے۔ ان کی دو کتابیں "کرسی اور کرنسی" اور "دعوت اور عداوت" طنز وظرافت پر ہیں۔ "نشاط غم" اور "دھوپ کا مسافر" شعری مجموعے ہیں۔ ان کی دوسری کتابیں سید عاشور کاظمی: فنکار اور فن، منثورات جمیل مظہری (ترتیب مع مقدمہ)، اسلوب ومعنی، بہار کی بہار (دو جلدیں)، اور بہار میں اردو تنقید وغیرہ اہم ہیں۔ اردو فکشن کی تنقید کے زمرے میں ان کی خدمات اردو ادب کے سرمائے میں بہت بڑا اضافہ ہیں جن میں توبۃ النصوح: ایک جائزہ، نذیر احمد کی ناول نگاری، کرشن چندر کی ناول نگاری، ہم عصر اردو فکشن: چند زاویے وغیرہ اہم ہیں۔

"اسلوب ومعنی" (۱۹۸۹ء) پروفیسر اعجاز علی ارشد کا پہلا تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کے دیگر مضامین سے قطع نظر ان کے افسانوی مضامین "اردو افسانہ اور علامت"، "گمدی کا افسانہ تج دو: تحلیل وتجزیہ"، "سہیل عظیم آبادی اور ان کی تحریریں: ایک تحقیقی جائزہ" ہیں۔ یہ تینوں مضامین اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد اہمیت کی حامل ہیں۔

پروفیسر اعجاز علی ارشد کی دوسری سب سے اہم کتاب "کرشن چندر کی ناول نگاری" ہے۔ پیش نظر کتاب موصوف کی تنقیدی بصیرت اور علم وآگہی کی شناخت کراتی ہے۔ ان سے قبل کم وبیش سبھی فکشن ناقدوں نے کرشن چندر کے ناول "شکست" کو موضوع بحث بنایا ہے، جبکہ پروفیسر موصوف نے کرشن چندر کے تقریباً سبھی ناولوں کا فرداً فرداً مطالعہ ومحاسبہ کیا ہے۔ یہ پوری کتاب کرشن چندر کی شخصیت کی تعمیر، ان کے ذہنی تشکیل اور اسلوب کے بالاستیعاب مطالعہ پر مبنی ہے۔ "نذیر احمد کی ناول نگاری" پروفیسر اعجاز علی ارشد کا تحقیقی مقالہ ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے سبھی ناولوں کا مطالعہ پیش کرتے ہوئے ناول کے فن، پلاٹ، تکنیک، کردار نگاری اور ان کے اسلوب نگارش کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ حال ہی میں ان کی ایک اور کتاب "توبۃ النصوح ایک تلخیص ایک جائزہ" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ "ہم عصر اردو فکشن چند زاویے" (۲۰۱۰ء کتابی دنیا، دہلی) میں بارہ مضامین شریک اشاعت ہیں، جو خالص فکشن پر مبنی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کا ناولٹ سیتا ہرن، شکیلہ اختر کی ناول نگاری، عبدالصمد کی ناول نگاری اور عہد حاضر میں لکھے چار ہے ناولوں کا سیر حاصل مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اردو افسانے کے تعلق سے مغرب کے اہم رجحانات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

خواتین فکشن تنقید نگاروں میں پروفیسر اشرف جہاں کا مقام بلند وبالا ہے۔ پٹنہ یونیورسٹی سے اشرف جہاں کا تعلق طالب علمی کے زمانے سے ہے اور شعبۂ اردو پٹنہ کالج میں لکچرر کے عہدے پر عرصہ دراز تک درس

کی نرملا" اور "اگر میں ناہوتی" ان کے بہترین افسانوی مجموعے ہیں۔ "ہم اردو کے مجرم ہوئے" انشائیہ کے طرز پر لکھی گئی ہے، جبکہ ان کے تین تنقیدی کتابیں جن کا تعلق براہ راست فکشن تنقید سے ہے، فن کردار نگاری اور ڈپٹی نذیر احمد، اردو ناول کے آغاز میں دبستان عظیم آباد کا حصہ اور اردو افسانے کا بدلتا مزاج۔ "فن کردار نگاری اور ڈپٹی نذیر احمد" ان کا تحقیقی مقالہ ہے۔ "اردو افسانے کا بدلتا مزاج" میں انہوں نے مختلف عہد میں افسانوی ہیئت، اس کے موضوعات اور بیان کے قاعدے کو احاطۂ تحریر میں لیتے ہوئے ترقی پسند تحریک، جدیدیت اور مابعد جدیدیت، اردو افسانہ ۱۹۴۷ء کے بعد جیسے موضوعات کے تحت اردو افسانے پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ "اردو ناول کے آغاز میں دبستان عظیم آباد کا حصہ" بھی اشرف جہاں کی عمدہ تصانیف میں شمار کی جاتی ہے۔

خواتین ناقدوں میں فرزانہ اسلم کا نام بھی معتبر ہے۔ فرزانہ اسلم کا بیک گراؤنڈ نفسیات جیسے سنجیدہ مضمون سے رہا ہے۔ ایک ماہر نفسیات زندگی کی پر پیچ الجھنوں اور لغزشوں کو فہم و ادراک کی شاہراہوں سے گزرتے ہوئے آسانی سے مطالعہ کر لیتا ہے اور ان کی گتھیوں کو سلجھانے کا باقاعدہ ہنر جانتا ہے۔ انہی سب وجوہات کے تحت فرزانہ اسلم نے اپنی ادبی زندگی کی شروعات فن افسانہ نگاری سے شروع کی تھی اور آج بھی افسانہ لکھنے میں منہمک ہیں۔ ان کی کتاب "عصمت چغتائی بحیثیت ناول نگار" فکشن تنقید کے سرمائے میں اضافہ ہے۔ موصوفہ نے عصمت چغتائی کے احوال و آثار اور ان کے ناولوں کا تعارف پیش کیا ہے۔

قاسم خورشید نے "ادبی منظرنامے پر گئودان" میں ناول کے فن کا جائزہ لیتے ہوئے ناول "گئودان" کو مختلف زاویے سے پرکھا ہے۔ ناول گئودان پریم چند کا شاہکار ناول ہے۔ دیہی زندگی کے مسائل کی عکاسی جس دیانتداری سے پریم چند نے پیش کیا، اسے اردو اور ہندی کے علاوہ مختلف شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے مفکروں و دانشوروں نے صرف قدر کی نگاہ سے دیکھا ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی ستر فیصد آبادی کی سسکتی زندگی کو محسوس کیا اور اس کا اعتراف کیا۔ اس لئے قاسم خورشید نے معتبر اردو تنقید نگاروں اور ہندی ناقدین کی آزاد و ہندوستانی فکشن نگاروں کے نظریات سے بھی استفادہ کیا ہے اور گئودان کا تجزیاتی و تقابلی مطالعہ پیش کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ ان کی دوسری اہم کتاب "متن اور مکالمہ" کے نام سے ۲۰۱۶ء میں شائع ہوئی۔ ۱۹۶۰ء کے بعد خواتین ناول نگار، میڈیا اور روشنی کی رفتار، نئی تنقید اور عہد رواں کے افسانے، تفریحی ادب اور جاسوسی ناول، سہیل عظیم آبادی: اردو فکشن کا اسکول، سجاد ظہیر وغیرہ پر اس میں وسیع تناظر میں سیر حاصل گفتگو موجود ہے۔

اردو فکشن تنقید میں "متعلقات فکشن" کی شمولیت بھی ناگزیر ہے۔ "متعلقات فکشن" شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر ایم عظیم اللہ کی کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس کتاب میں شامل مضامین کلاسیکی دور سے جدید دور تک کے متنوع موضوعات پر مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں۔ فکشن کی تنقید و تفہیم کے تعلق سے ڈاکٹر عظیم اللہ کا اپنا ایک

اس کے علاوہ موصوف کی ایک اور کتاب "اردو ناول پر انگریزی ناول کے اثرات" منظر عام پر آچکی ہے اور قارئین علم و ادب سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہے۔

شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی کے موجودہ استاد ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نئی نسل کے معتبر اور مستند تنقید نگاروں میں سے ایک ہیں۔ ان کا شمار فکشن کی نظریاتی اور عملی تنقید کے نہایت عمدہ نمونے پیش کرنے والے ناقدوں میں ہوتا ہے۔ ان کی تحریریں اور ان کے افکار انہیں پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر قمر رئیس، وارث علوی، شمس الرحمن فاروقی، وہاب اشرفی، شمیم حنفی، سید محمد عقیل، مہدی جعفر، اسلم آزاد، اعجاز علی ارشد، ابوالکلام قاسمی، خورشید احمد، علی احمد فاطمی، ارتضیٰ کریم، صغیر افراہیم اور اسلم جمشید پوری جیسی قد آور شخصیات کی صف میں کھڑا کرتے ہیں۔ یوں تو شہاب ظفر اعظمی کی نگاہ فکشن کے علاوہ ادب کی دوسری اصناف پر بھی رہتی ہے، لیکن ان کی اساس اور پہچان فکشن کے اسلوبیاتی مطالعے پر مبنی ہے۔ فکشن فن پاروں کے بھی اجزا و پلاٹ، کردار، منظر، پس منظر و زبان و بیان پر خود کو مرکوز کرتے ہوئے اس کے اسلوب کے تعین میں سنجیدگی، غیر جانبداری اور تعمیری نقطۂ نظر ان کے سامنے ہوتا ہے۔ ان کی سنجیدگی اس بات کی طرف توجہ مبذول کراتی ہے کہ وہ متن کو صرف ناقد کی نظر سے نہیں دیکھتے ہیں، بلکہ مصنف کے ذہن، اس کے تجربات و احساسات و جذبات اور پیشکش کی گہرائی و گیرائی کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا تنقیدی تجربہ متن کا مرکزی خیال اور مصنف کے زاویہ نگاہ کی آمیزش ہوتی ہے۔ ان کا یہی اسلوب ان کو ہم عصروں میں انفراد بخشتا ہے۔

"اردو ناول کے اسالیب" چار سو صفحات پر مشتمل عمدہ تنقیدی جہات کا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے ناول کے آغاز و ارتقا کا احاطہ کرتے ہوئے مختلف ادوار کی مناسبت سے پانچ ابواب میں منقسم کر کے ہر ایک دور کے اہم ناول نگاروں اور ناولوں کا مطالعہ پیش کرتے ہیں۔ اردو ناول ترقی پسند تحریک کے بعد، جدیدیت اور مابعد جدیدیت جیسے نظریات و رجحانات کے حامل ناول نگاروں جیسے عبدالصمد، پیغام آفاقی، الیاس احمد گدی، سید محمد اشرف، غضنفر، ساجدہ زیدی، محمد علیم، کوثر مظہری، شفق، آچاریہ شوکت خلیل اور شاہد اختر کے فن پاروں کی پیش کش کو تنقیدی پیمانے پر پرکھتے ہیں۔ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کی تنقیدی صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے پروفیسر وہاب اشرفی لکھتے ہیں۔

> "اردو ناول کے اسالیب، تحقیقی اور تنقیدی اعتبار سے نئے تنقیدی جہات سے مملو ہے۔ مجھے شہاب ظفر اعظمی کی ژرف بینی، وژن، قوت استدلال، نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت کا اعتراف کرنا پڑ رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اردو ناولوں کے عمومی جائزے میں اور اس کی تاریخ میں اس کتاب کی اپنی اہمیت ہوگی"۔ (۳)

مضامین اردو کے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کے مطالعے پر مشتمل ہیں۔ ''متن اور معنی'' اپنی گوناگوں تحقیقی، تنقیدی اور تاثراتی خصوصیات کے ساتھ مختلف موضوعات لے کر ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔ اس میں شامل سبھی اکیس مضامین مختلف صنفوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ فکشن کے تعلق سے اس میں اردو داستانوں کا اسلوبی مطالعہ، ترقی پسند اردو ناول کے اسالیب، تانیثیت اور اردو کی نئی افسانہ نگار خواتین، بہار کی خواتین افسانہ نگار جیسے موضوعات ہیں، جو عمیق مطالعہ اور غور و فکر کی جانب ذہن کو مرکوز کراتے ہیں۔

حال کے دنوں میں موصوف کی ایک اور کتاب ''مطالعات فکشن'' کے نام سے منظر عام پر آئی ہے۔ نام کتاب اور فہرست سازی کی نوعیت دیکھنے سے ہی ''مطالعات فکشن'' کے بارے میں واضح اور موثر خیالات ذہن میں ابھرنے لگتے ہیں۔ سابقہ کتابوں کی مانند ''اختصاص'' کے زیر اثر پانچ تحریریں، اردو ناول ترقی پسند تحریک سے قبل، اکیسویں صدی میں اردو ناول: ایک تنقیدی مطالعہ، ہم عصر اردو افسانہ کے فکری سروکار، تانیثیت اور اردو کی نئی افسانہ نگار خواتین، اردو افسانہ کے چند اہم دلت کردار اپنے موضوعات کے تئیں بالاستیعاب مطالعہ پیش کرتے ہیں۔ ''امتیاز'' کے ضمن میں پیش کیے گئے دس مضامین میں کرشن چندر، شین مظفر پوری، انتظار حسین وغیرہ سے لیکر عہد حاضر تک کے فکشن رائٹر احمد صغیر، صادقہ نواب سحر اور سلمیٰ صنم وغیرہ کی نگارشات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ ''انفراد'' کے حصے میں فکشن کی نئی پرانی کتابوں پر تبصرے پیش کیے گئے ہیں۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کی مرتب کردہ دو کتابیں ''قرات: مطالعہ، محاسبہ'' اور ''صالحہ عابد حسین: فنی اور فکری جہات'' کے نام سے اردو فکشن کی تنقید میں مزید اضافہ ہیں۔ ان دونوں کتابوں کی ادبی قدر و قیمت اور معنویت اس لحاظ سے اہم ہے کہ ''قرات'' آٹھویں دہائی کے بعد منظر عام پر آنے والی کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس کتاب کی تفہیم و تعبیر میں پرانے لکھنے والوں کے ساتھ نئے قلمکاروں کو شامل کر کے ان کے نقطۂ نظر کو پیش کیا گیا ہے۔ اسی سلسلے کی موصوف کی دوسری کتاب ''صالحہ عابد حسین: فنی اور فکری جہات'' میں شامل مضامین سیمینار میں پڑھے گئے مقالات ہیں۔

اردو فکشن کی تنقید پر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی کی فہرست بہت لمبی ہے۔ میرے اس چھوٹے سے مضمون میں سبھی تحقیقی مقالات کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے، لیکن چند تحقیقی مقالات جن کے نام ہمارے ذہن میں موجود ہیں۔ ان میں ''قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں نسوانی کردار'' (شمیم صادقہ)، ''کرشن چندر کے ناولوں میں نسوانی کردار'' (شمشاد جہاں)، ''عصمت چغتائی بحیثیت افسانہ نگار'' (ثریا جبیں)، ''اردو اور ہندی کے سیاسی ناول: ایک تقابلی مطالعہ'' (ڈاکٹر سورج دیو سنگھ)، ''اردو افسانے میں ہمہ لمیت کا رجحان'' (ابوبکر رضوی)، ''قاضی عبدالستار [illegible]

مسائل کی عکاسی'' (شارقہ شفتین)، ''قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری: ایک تنقیدی مطالعہ'' (مسرت جہاں)، ''دلت مسائل اور پریم چند'' (نور نبی انصاری)، ''الیاس احمد گدی اور سنجیو کی ناول نگری کا تقابلی مطالعہ'' (رضوانہ پروین)، ''اردو افسانوں میں دلت مسائل کا جائزہ'' (شمع انجم) وغیرہ شامل ہیں۔

پٹنہ یونیورسٹی کی ستر سالہ تاریخ میں اب تک تقریباً تین سو سے زائد تحقیقی اور تنقیدی مقالات لکھے جا چکے ہیں اور اب بھی لکھے جا رہے ہیں۔ میں نے اپنی جانب سے ''اردو فکشن کی تنقید میں پٹنہ یونیورسٹی کی خدمات'' کے موضوع پر حتی الامکان سیر حاصل گفتگو کرنے کی کوشش کی ہے، کسی کمی کا احساس ہو تو میری رہنمائی فرمائیں، میں ممنون رہوں گی۔ شکریہ

۞

حوالے:

(۱) بہار میں اردو ناول نگاری: پروفیسر آصفہ واسع، ص ۱۹۔ موڈرن پبلشنگ ہاؤس، گولا مارکیٹ، نئی دہلی۔ ۱۹۹۷ء

(۲) ادب اور سماجیات: پروفیسر قدوس جاوید۔ ص ۷۸-۷۷۔ ۱۹۸۳ء

(۳) اردو ناول کے اسالیب: ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی۔ ص ۱۴۔ تخلیق کار پبلشرز۔ ۲۰۰۶ء

18 Years (2002-2020) of Success

شعبۂ اردو ، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ
Department of Urdu, Ch. Charan Singh University, Meerut

This is to certify that Mr./Ms./Mrs./Dr./Prof.

Dr. Musarrat Jahan ڈاکٹر مسرت جہاں

of Patna has participated as Resource Person in

4DAY INTERNATIONAL YOUNG URDU SCHOLAR'S WEBINAR

on

Urdu Research and Criticism in 21st Century : New Approaches

"اکیسویں صدی میں اردو تحقیق و تنقید: سمت و رفتار"

held from 7th to 10th August 2020. She has presented the paper in the webinar.

Prof. Naveen Chand Lohani
Dean Faculty of Arts,
President, Webinar Organising Committee

Mr. Arif Naqvi
President
Urdu Anjuman Berlin

Ms. Sadaf Mirza
President
European Literary Circle

Prof. Y. Vamala
Pro. Vice-Chancellor
Patron, Webinar Organising Committee

Prof. Shabnam Hameed
HOD Urdu
University of Allahabad

Prof. Aslam Jamshedpuri
HOD, Urdu
Convener & Organising Secretary, Webinar

Designed by : Mr. Faizan Ansari

شعبہ اردو، پٹنہ یونیورسٹی

DEPARTMENT OF URDU, PATNA UNIVERSITY, PATNA

Two Days's National Seminar on

Role of Patna University to the Development of Urdu language and literature

CERTIFICATE

We certify with pleasure that Mr/Mrs. ......Dr. Musarrat Jahan......... participated and presented a paper / presided over a session in the National Seminar on "Role of Patna University to the Development of Urdu Language and literature" organised by the Dept. of Urdu on 7th & 8th February 2018

Dr. Shahab Zafar Azmi
(Organising Secretary)

Dr. Jawed Hayat
(Head of the Department)

کیف عظیم آبادی میموریل ٹرسٹ، نیو عظیم آباد کالونی، پٹنہ

KAIF AZIMABADI MEMORIAL TRUST, PATNA

Two Days's National Seminar on
Urdu Novel in 21st Century

CERTIFICATE

We certify with pleasure that Mr/Mrs. ...Dr. Musarrat Jahan...

.... *participated and presented a paper / presided over a session in the National Seminar on " Urdu Novel in 21st Century" organised by kaif Azimabadi Memorial Trust on 21 & 22 February 2018*

Dr. Shahab Zafar Azmi
(Organising Secretary)

Md Asif Nawaz
Director KAMT, Patna

بہار اردو اکادمی، پٹنہ

BIHAR URDU ACADEMY, PATNA

This is to certify that Ms. Dr. Musarrat Jahan ڈاکٹر مسرت جہاں of Patna has participated in the **Women Urdu National Convention** organized by **Bihar Urdu Academy, Patna** during 29-31 January 2016. She has presented a Paper/Short Story/Poetry/Deliberation in the convention.

We appreciate her valuable participation.

سلطان اختر
Vice President

اعجاز علی ارشد
Vice President

مشتاق احمد نوری
Secretary

URDU FICTION KI TANQEED IBTADA TA HAL

Thesis

Submitted

For the award of the certificate of

Post Doctoral Research

IN THE FACULTY OF HUMANITIES

(URDU)

2024

Supervisor

Dr. Shahab Zafar Azmi

Associate Professor

Submitted by

Dr.Musarrat Jahan

Post Doctoral Research Fellow

Department of Urdu

PATNA UNIVERSITY, PATNA

URDU FICTION KI TANQEED IBTADA TA HAL

Thesis

Submitted

For the award of the certificate of

Post Doctoral Research

IN THE FACULTY OF HUMANITIES

(URDU)

2024

Supervisor

Dr. Shahab Zafar Azmi

Associate Professor

Submitted by

Dr.Musarrat Jahan

Post Doctoral Research Fellow

Department of Urdu

PATNA UNIVERSITY, PATNA